کلیات رشید احمد صدیقی

(جلد پنجم)

انشائیے (اول)

ترتیب و تدوین

ابوالکلام قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

کلیات رشید احمد صدیقی

(جلد ششم)

انشائیے (دوم)

ترتیب وتدوین

ابوالکلام قاسمی

پہلی اشاعت	:	2012
تعداد	:	550
قیمت	:	-/118 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1592

Kulliyat-e-Rasheed Ahmed Siddiqui (Inshaiye-2) Vol.-VI
Edited & Compiled by:
Abul Kalam Qasmi

ISBN :978-81-7587-775-7

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی110025، فون نمبر: 49539000، فیکس:49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر:26109746
فیکس:26108159 ای میل:ncpulsaleunit@gmail.com
ای میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in
طابع: سلا سار امیجنگ سسٹمس، C-7/5 لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی-110035
اس کتاب کی چھپائی میں70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

کلاسیکی ادب کی بازیافت کا سلسلہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں جاری ہے۔ مگر بیشتر زبانوں میں اس وقت بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب متعدد ادب پارے دست برد زمانہ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس دشواری کا ایک حل یہ ہے کہ ان اہل قلم کے شہ پاروں کو محفوظ کر لیا جائے جو زیادہ عرصہ نہ گزرنے کے باوجود نئے کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اور جن کے بارے میں اندازہ ہے کہ امتداد وقت کے ساتھ ان کے فن پاروں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس ضمن میں ایک بڑے منصوبے کی صورت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے سب سے پہلے پریم چند کے کلیات کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ تقریباً ایک دہائی قبل اس کلیات کی تمام جلدیں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہو کر قبولیت عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔

کلیات پریم چند کے بعد یہ سلسلہ جاری ہے اور متعدد نئے کلاسیک سے متعلق جلدیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ اس ضمن میں ایک بڑا منصوبہ ''کلیات رشید احمد صدیقی'' کی اشاعت کا بھی ہے جس کی تدوین کی ذمہ داری پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے قبول کی ہے اور توقع ہے کہ بہت جلد اس کی تمام جلدیں شائع ہو کر منظر عام پر آ جائیں گی۔

رشید احمد صدیقی، بیسویں صدی کے نصف اول میں غیر معمولی طور پر فعال اور زرخیز ذہن کے مالک ادیب کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ ان کی تصنیف و تالیف کا عرصہ تقریباً ساٹھ برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے خاکے بھی لکھے، طنزیہ مضامین میں بھی لکھے اور انشائیے بھی لکھے۔ وہ تنقید نگاری میں بھی مصروف رہے اور تقریباً سو سے زیادہ اہم کتابوں پر تبصرے بھی کیے۔ مگر صنفی اعتبار سے اس تنوع کے باوجود رشید احمد صدیقی کو نمایاں طور پر طنز و مزاح

کلیات رشید احمد صدیقی

(جلد ششم)

انشائیے (دوم)

ترتیب وتدوین

ابوالکلام قاسمی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

پہلی اشاعت	:	2012
تعداد	:	550
قیمت	:	-/118 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1592

Kulliyat-e-Rasheed Ahmed Siddiqui (Inshaiye-2) Vol.-VI
Edited & Compiled by:
Abul Kalam Qasmi

ISBN :978-81-7587-775-7

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، C-7/5، لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی-110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

کلاسیکی ادب کی بازیافت کا سلسلہ دنیا کی تمام بڑی زبانوں میں جاری ہے۔ مگر بیشتر زبانوں میں اس وقت بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب متعدد ادب پارے دست بردِ زمانہ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس دشواری کا ایک حل یہ ہے کہ ان اہل قلم کے شہ پاروں کو محفوظ کرلیا جائے جو زیادہ عرصہ نہ گزرنے کے باوجود نئے کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکے ہیں اور جن کے بارے میں اندازہ ہے کہ امتدادِ وقت کے ساتھ ان کے فن پاروں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس ضمن میں ایک بڑے منصوبے کی صورت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے سب سے پہلے پریم چند کے کلیات کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ تقریباً ایک دہائی قبل اس کلیات کی تمام جلدیں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوکر قبولیت عام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔

کلیات پریم چند کے بعد یہ سلسلہ جاری ہے اور متعدد نئے کلاسیک سے متعلق جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اس ضمن میں ایک بڑا منصوبہ ''کلیات رشید احمد صدیقی'' کی اشاعت کا بھی ہے جس کی تدوین کی ذمہ داری پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے قبول کی ہے اور توقع ہے کہ بہت جلد اس کی تمام جلدیں شائع ہوکر منظر عام پر آجائیں گی۔

رشید احمد صدیقی، بیسویں صدی کے نصف اول میں غیر معمولی طور پر فعال اور زرخیز ذہن کے مالک ادیب کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ ان کی تصنیف و تالیف کا عرصہ تقریباً ساٹھ برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے خاکے بھی لکھے، طنزیہ مضامین میں بھی لکھے اور انشائیے بھی لکھے۔ وہ تنقید نگاری میں بھی مصروف رہے اور تقریباً سو سے زیادہ اہم کتابوں پر تبصرے بھی کیے۔ مگر صنفی اعتبار سے اس تنوع کے باوجود رشید احمد صدیقی کو نمایاں طور پر طنز و مزاح

اور انشائیہ کی اصناف کے بنیاد گذار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر اردو طنز و مزاح اور انشائیہ کی اصناف کو رشید احمد صدیقی اور پطرس بخاری نے ایسا استحکام نہ بخشا ہوتا تو بعد کے زمانے میں مشتاق احمد یوسفی، مختار مسعود، کرنل محمد خاں اور مجتبیٰ حسین جیسے طنز و مزاح کے نمائندہ ادیبوں کی تحریروں میں ایسی رنگا رنگی نہ پیدا ہوئی ہوتی۔ رشید احمد صدیقی کا ایک بڑا کارنامہ علی گڑھ اور دبستان علی گڑھ کو ایک روایت میں تبدیل کرنا بھی ہے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو جس طرح ایک تہذیب، ایک کلچر اور ایک شائستہ طرز زندگی کی علامت کی شکل میں پیش کیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علی گڑھ، عرصۂ دراز تک اپنے علمی اور تہذیبی کارناموں کے ساتھ رشید احمد صدیقی کی تحریروں کے حوالے سے بھی زندہ رہے گا۔

مجھے خوشی ہے کہ کلیات رشید احمد صدیقی کے پروجیکٹ میں ان کی کتابی شکل میں مطبوعہ تحریروں کے ساتھ رسائل کے صفحات میں منتشر تحریروں، ان کے خطوط اور غیر مطبوعہ تحریروں کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ کلیات محض رشید احمد صدیقی کی تحریروں کی دوبارہ اور یکجا اشاعت ہی نہیں، تحقیق و تلاش اور تدوین کا بھی عمدہ نمونہ بن کر قارئین کے سامنے آرہا ہے۔ قومی اردو کونسل کی کوشش رہتی ہے کہ اس طرح کے اپنے تمام منصوبوں میں اعلیٰ معیار برقرار رکھا جائے۔

قارئین سے گزارش ہے کہ اس کتاب میں اگر انھیں کوئی کوتاہی نظر آئے تو قومی اردو کونسل کو باخبر کریں تاکہ اس کوتاہی کا ازالہ اگلی اشاعت میں کرلیا جائے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
ڈائرکٹر

فہرست مضامین

●●●

دیباچہ

رشید احمد صدیقی کا شمار اردو کے صف اوّل کے انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔ چونکہ ان کے انشائیے کا بڑا حصہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور خاکوں تک بھی پھیلا ہوا ہے اس لیے ان کی تحریروں میں طنز کا عنصر بھی پوشیدہ ہوتا ہے، اس لیے ان کی حیثیت اردو کے لیے ایک مثالی طنز نگار کی بھی ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رشید صاحب کی انشائیہ نما تحریریں اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ لیکن اس سے اس پہلو کی نفی بالکل نہیں ہوتی کہ ان کی غیر مزاحیہ یا سنجیدہ تحریریں بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ تاہم کسی ادیب کے بنیادی اسلوب اور نمایاں رویے کی شہرت کو ادبی استناد سازی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اکثر ہم کسی ادیب کے ایک پہلو کو اتنا نمایاں کر دیتے ہیں کہ اس کے دوسرے امتیازات ثانوی سمجھے جانے لگتے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ رشید صاحب کی غیر مزاحیہ تحریریں چونکہ ابتدا میں کم شائع ہوئیں اس لیے اس نوع کی سنجیدہ اور بردبار تحریروں کی جانب اہل ادب کی بہت کم توجہ مرکوز رہی ہے۔

رشید احمد صدیقی کی سنجیدہ تحریروں میں یوں تو ان کے خطبات کو مرکزیت حاصل ہے، اس لیے کہ ان خطبات کے موضوعات متنوع ہیں اور ہمیں غور و فکر کی دعوت بھی دیتے ہیں۔

خطبات کے علاوہ رشید احمد صدیقی نے تنقیدی و تحقیقی مضامین بھی لکھے ہیں، اپنی آپ بیتی بھی لکھی ہے اور بعض اہم شخصیات اور معاصرین پر اعلیٰ درجے کے خاکے بھی لکھے ہیں۔ لیکن

ادبی اور تنقیدی اعتبار سے یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ تحقیق وتنقید کے علاوہ ان کے اظہار کے تمام اسالیب کو انشائیہ نگاری کے بڑے عنوان سے معنون کیا جاسکتا ہے۔ غیر افسانوی ادب میں یوں بھی انشائیہ نگار کو سب سے زیادہ ادبی وسائل کے استعمال کرنے کا موقع ملتا ہے۔ خطوط نگاری، سوانح نگاری، سفر نامہ اور ان نوع کی اصناف میں ادیب کو تخلیقی اور تخیلی آزادی نصیب تو ہوتی ہے مگر برائے نام ہی ہوتی ہے۔ جبکہ انشائیہ کے دائرے میں آنے والے طنزیہ مضامین ہوں، ظریفانہ تحریر ہوں یا مزاحیہ مضامین یا پھر خاکے اور شخصیتوں کی نئی تشکیل، ہر صنف اور ہر اسلوب میں رشید احمد صدیقی جیسا ادیب اپنی ادبیت اور شعریت کے عناصر کو کسی نہ کسی روپ میں ضرور استعمال کرتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے بہ ظاہر غیر معمولی اصناف نہ ہوتے ہوئے بھی ان اصناف میں دنیا کے بارے میں سنجیدہ ردعمل، روایت کی تشریح نو، شعری نمونوں کی تخلیق، پیروڈی اور دانش وری کی روایت میں شامل تلمیحات اور لوک کہاوتوں کو رشید احمد صدیقی نے نہایت فن کارانہ اور دانش ورانہ سطح پر استعمال کیا ہے اور اس طرح انشائیہ کی صنف کو مختلف اصناف کا جوہر بنادیا ہے اور اس صنف میں اپنے اظہار کو دوام عطا کردیا ہے۔

اسی لیے عرض کیا جاسکتا ہے کہ رشید احمد صدیقی کو پڑھ کر ہمیں اس بات کا قائل ہو جانا پڑتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ پائے کے مزاح نگار ہونے کے علاوہ ایک دیدہ ور مفکر، سنجیدہ و بے باک تجزیہ نگار نیز اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنے ادارے (علی گڑھ) کے سچے بہی خواہ اور قوم وملت کے حقیقی غم خوار بھی ہیں۔ رشید احمد صدیقی کی ہر تحریر میں ان کے برسوں کا تجربہ اور ان کی گہری فکر جھلکتی ہے۔ ان کو قومی، لسانی اور ملی مسائل سے کتنی گہری وابستگی تھی اور انھوں نے عرصے تک ان کے مسائل پر کس بصیرت افروز انداز میں غور وفکر کیا تھا۔ ان تمام باتوں کی جھلک ان کے انشائیوں تک میں بھی خطبات کی طرح ہی صاف دکھائی دیتی ہے۔ ان کا عمیق مطالعہ رشید صاحب کے ادبی قدر کے ساتھ دانش ورانہ قدر ومنزلت میں بھی مزید اضافہ کردیتا ہے۔ رشید احمد صدیقی کے انشائیوں کا یہ تنوع اور رنگارنگی بلاشبہ اردو کے غیر افسانوی ادب کا بیش بہا سرمایہ ہے جس کو مربوط انداز اور جدید طریق کار کے ساتھ پہلی بار پیش کیا جارہا ہے۔ رشید صاحب کی ذہنی افتاد، علمی تبحر اور دانش ورانہ فہم وفراست کو سمجھنے کے لیے ان انشائیوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مرتب

شب ماہ میں چاند سے دو دو باتیں

اے حسن وعشق کی زندہ جاوید شبیہ! اے تصویر خانۂ ازل کے بیش بہا مرقع! اے شاہد فضا کے دستِ قدرت کی بنائی ہوئی تصویر! اے پریم ومحبت کی دیوی! کون؟ چاند! چندرماں! آہ کیسے معصوم اور بھولے بھالے ہو، اس سادگی اور متانت پر بھی مشاطۂ قدرت نے تمھیں کس غضب کا حسن دے رکھا ہے، ایک عالم دیوانہ وشیدائی ہے کیوں نہ ہو، تمھیں تو اس فانی دنیا کی معصیت کی ہوا نہیں لگی ہے، اپنے وضع کے پابند اور تواضع کیش ہو، اگر کسی کے فلک نما محلات پر اپنی روشنی پھیلائی تو ایک غریب وکم مایہ کے پھوس کے چھپّروں پر بھی اُسی طرح سے جلوہ نما ہوئے۔ اگر کسی صاحب سطوت وجبروت کی محفلِ شبستاں میں شریک ہوکر لطفِ محبت دوبالا کیا، تو ایک نادار وکم مایہ کے غربت کدہ میں پہنچ کر اپنے نورانی بازو پھیلا دیے، اور اپنے آغوشِ ناز میں انھیں جگہ دی، اگر محفلِ حسیناں میں پہنچ کر حسینوں کے ساتھ رنگ رلیاں مچائیں، تو گورِ غریباں میں جا کر اُس کے بے بس مکینوں کو ساتھ ملا کر دنیا کی بے ثباتی و بے مہری کا ماتم کیا، اور پھر انھیں زبانِ حال سے دلاسا دے دے کر تھپک سلایا! تمھاری ہی نظروں کے سامنے ایک شخص بہ اُمیدِ اجابت خالقِ بے نیاز کے سامنے گڑگڑا کر دعائیں مانگتا ہے، اور تمھاری ہی سائے تلے ایک جابر وظالم کے سفاکانہ افعال کسی معصوم و بے گناہ کا خون کر رہے ہیں۔ تمھاری ہی سامنے ایک عابد تسبیح وتہلیل میں مصروف ہے، اور دوسرا سیہ کاری وستم شعاری میں لگا ہوا ہے، یہ سب

کیوں! محض اس وجہ سے تمھیں سب اپنا ہم راز و مونس سمجھے ہوئے ہیں۔ تم کسی کی پردہ دری نہیں کرتے سب پر پردہ پوشی کی نورانی چادر پھیلائے ہوئے ہو، لیکن ہاں یہ تو بتلاؤ کہ یہ سب تو ذی روح اور عقل والے ہیں، اگر یہ تمھارے دل دادہ و مفتوں ہوں تو کچھ تعجب نہیں ہم دیکھتے ہیں کہ غیر ذی روح لاعقل و بے زبان بھی تمھارے کچھ کم شیدا نہیں ہیں، سمندر کے مدّ و جزر کو دیکھو وہ بھی تمھارا خیر مقدم نہایت خلوص و نیک طینتی سے کرتا ہے۔ وہ تمھاری قدم بوسی کے لیے بار بار نہایت جوش وخروش سے اُٹھتا ہے، اور مایوس ہو ہو کر پلٹ جاتا ہے۔ چکور کو دیکھو جب تک تم اپنے معصوم دوستوں کے ساتھ آسماں کے طلسمی دامن پر کھیلا کرتے ہو، وہ ٹکٹکی باندھے تمھیں دیکھا کرتا ہے۔ تمام رات اسی دید بازی میں گزر جاتی ہے، لیکن وہ غریب اپنی آنکھیں دوسری طرف نہیں پھیرتا۔ ایک طفلِ شیر خوار گہوارے میں پڑا ہوا تمھیں دیکھ دیکھ کر آغوں آغوں کر رہا ہے، اور بے اختیار تمھاری طرف ہاتھ بڑھاتا ہے اور نہ پا کر کبھی کبھی رونے بھی لگتا ہے لیکن میرے تغافل شعار دوست! تم ہو کہ کسی کی طرف مخاطب ہی نہیں ہوتے اتنی بے مہری اپنے دور افتادہ دوستوں سے اچھی نہیں، لیکن ہاں یہ تو بتاؤ کہ جب تم سے سب اتنی محبت کرتے ہیں تو تم کیوں نہیں مخاطب ہوتے! اچھا اب میں سمجھا تم کو قدرت کی جانب سے اُس کے بندوں اور مخلوق کے دلوں میں محبت و ایثار کے بیج ڈالنے کا منصب عطا ہوا ہے، لیکن اگر ایسا ہے تو تم طفلی اور اوائل عمر ہی میں کیوں ایسا کرنے لگے ہو؟ کیا اس لیے کہ عالمِ شباب میں اس میں محبت و اخلاق کی کونپلیں پھوٹیں، اور خوب پروان چڑھ کر عالمِ پیری میں اُس کے پھل اور پھول سے متمتع ہوں، آہ! اگر ایسا ہی ہے تو اچھے دوست! اس کے بندوں کے دلوں میں محبت وعشق کی ایسی روح پھونکنا کہ سوائے خالقِ حقیقی کے اور کسی کے شیدائی و عاشق نہ ہوں ان کی محبت پاک ہو، اور وہ صرف اسے صانعِ مطلق کے دیوانے کہیں جس نے تمھیں اتنا دلکش بنایا ہے، لیکن پیارے مہربان! یہ تو بتلانا کہ جب تم ہمارے دلوں میں ایثار و پاک نفسی کی روح عہدِ طفلی میں پھونک دیتے ہو، تو پھر عہدِ شباب میں پڑ کر ہم کیوں دنیاوی مال و زر و جاہ و نمود کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہم میں غرور، تمکنت، نفسانیت و کینہ، بغض و عناد کا مادہ زور پکڑتا ہے، اور اس وقت ہم دائرۂ انسانیت سے دور جا پڑتے ہیں اور پھر ہم موردِ عتابِ یار بھی ہوتے ہیں۔ میں تو خیال کرتا ہوں کہ یہ سب

باتیں نفسِ لعین کے زور پکڑ جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ آہ! اس ظالم ناخدا ترس پر بھلا تم ایسے بھولے بھالے معصوم کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ یہ لعین سب پر حاوی ہے، اور اس پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ اچھا اگر تم سے کچھ نہیں ہوسکتا تو ہماری خاطر سے تم اتنا مان جاؤ، کہ تم اس وقت ذرا ہماری مدد کیا کرو، کہ یہی عشقِ مجازی اور عشقِ حقیقی کی صورت میں تبدیل ہو جایا کرے۔ ہم تم سے روٹھ بھی جائیں تو رنجیدہ مت ہونا کیوں کہ اُس وقت ہمارے جذبات ہمارے قابو میں نہیں ہوتے۔ ہم بالکل بے قابو اور بے بس ہوتے ہیں، لیکن بتلاؤ تو، اے اچھے اور معصوم دوست! یہ کیا بے انصافی ہے، کہ تم اس نعمتِ عظمیٰ کو ہم میں برابر برابر نہیں تقسیم کرتے۔ بعض کو اتنا کم دیتے ہو کہ عدم و وجود بالکل یکساں ہو جاتا ہے اور بعض بعض کو ایسے بھرے بھرے جام دیتے ہو کہ روزِ ازل ہی سے نشۂ عرفان میں سرشار و مخمور نکلتے ہیں اُن کے لیے ''اناالحق'' کا کلمہ کچھ بات ہی نہیں ''من تو شدم تو من شدی'' اُن کے ورد زبان رہتا ہے۔ لیکن ہاں ہاں! جنھیں تم اتنا دیتے ہو اُن کی ذرا ذرا سی بے عنوانی کی جو معمولی سزا تم دیتے ہو وہ ''دار یا سولی'' ہے تمھارے لیے نہ تو کوئی گواہ کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ثبوت کی کوشش۔ تمھارے عزم اقراری ہوتے ہیں جس کے لیے سزا باعثِ عزّت ہوتی ہے۔

آہ! جب ہم تمھارے خاموش اور پیچیدہ کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں، تو حیرت ہوتی ہے کہ تم تنہا کیا کیا کرتے ہو اور کتنے بڑے بڑے انقلاب پیدا کرتے ہو۔ نہ تو کبھی مسرّت خیز واقعے سے تم پر خوشی و انبساط کی جھلک پیدا ہوتی ہے اور نہ کسی حیرت انگیز اور جاں گداز معاملے سے تم پر اُداسی اور رنج کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ لیکن ہاں ہاں! میں نے دیکھا تمھارے سراپا میں کچھ دھندلے دھندلے دھبّے نظر آتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ لوگ کہتے ہیں ہماری دنیا کا عکس پڑتا ہے، لیکن اے خاموش و سنجیدہ دوست! میں یہ کبھی نہ مانوں گا۔ مجھے تو یہ گمان ہوتا ہے کہ ہماری طرف سے تمھارے دل میں غبار ہے تم ہم سے رنجیدہ ہو، آہ! اگر ایسا ہے تو ہم بڑے بدقسمت ہیں کہ تم ایسا مخلص دوست یوں کبیدہ ہے۔ لیکن ہم تمھیں یقین دلاتے ہیں کہ ہم تمھارے ویسے ہی دل دادہ اور مفتوں ہیں، جیسا کہ ایک وفادار اور سچے چاہنے والے کو ہونا چاہیے۔ لیکن اگر تم خواہ مخواہ ہماری طرف سے بدگمان ہو تو ہم تمھیں کسی نہ کسی طرح منا ہی

لیں گے۔ لیکن ہم تم سے اتنا ضرور کہیں گے، کہ تمھیں دوست واغیار کے امتیاز کرنے کا اصول نہیں معلوم ہے۔ تم اپنے دوست ستاروں کو بہت مخلص اور سچا سمجھتے ہو، کیوں کہ ہم ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ تم شب میں نکل کر فضائے آسمان میں ہمیشہ ان کے ساتھ رنگ رلیاں مچاتے ہو، لیکن ہاں تمھیں کیا معلوم کہ وہ تمھیں پیار کرتے ہیں۔ کبھی تم ہمارے سے بھیس بدل کر چھپکے سے آؤ، تب اُنھیں دیکھو کہ وہ کیا کیا کرتے ہیں۔ جب تم نہیں رہتے، تو وہ لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں جمع ہوکر خوشیاں مچاتے ہیں، جوشِ مسرّت میں آکر فضائے بسیط میں رقص وسرود کرتے ہیں۔ کبھی زوروں سے چمکنے لگتے ہیں اور کبھی آنکھوں سے نہاں ہوجاتے ہیں اور جہاں تم آئے وہیں سب کے سب غائب ہوجاتے ہیں۔ گویا تمہارا ساتھ انھیں ناخوش گوار معلوم ہوتا ہے سوائے معدودے چند کے جنھوں نے تمھارا ساتھ نباہنے کی قسم کھائی ہے اور جو طوعاً وکرہاً تمھارا ساتھ بھی دیتے ہیں۔ لیکن وہ بھی نہایت پژمردگی سے اور کوئی تمھارا ساتھ نہیں دیتا۔ صبح کے وقت تمھارے حسن کا زوال شروع ہوجاتا ہے، وہیں وہ بھی ایک ایک کر کے علاحدہ ہونے لگتے ہیں، اور قبل تمھارے رخصت کے وہ چل دیتے ہیں۔ اور پھر جب شام کو تم طلوع ہوتے ہو تو وہ سب تمھارے خیر مقدم کرنے کے لیے ایک ایک کرکے آتے ہیں۔ لیکن بُرا نہ مانو تو ہم یہ کہیں گے کہ اس میں اُن کا کوئی قصور نہیں ہے، بلکہ جیسا سلوک تمھارا اُن کے ساتھ ہوتا ہے ویسا ہی وہ سب تم سے پیش آتے ہیں۔ تمھارے آنے سے ان کے حسن کو زوال آجاتا ہے۔ وہ تمھارے آتے ہی نہایت افسردگی سے ٹمٹمانے لگتے ہیں۔ تمھارے سامنے اُن کی طرف کوئی مخاطب نہیں ہوتا، انھیں تم سے رقابت پیدا ہوجاتی ہے۔ اب تمھیں انصاف سے کہہ دو کہ اُن کے ساتھ تمھارا کیا سلوک ہے۔ اب اگر وہ تم سے بے زار ہیں تو کوئی قابلِ شکایت بات نہیں ہے، لیکن ہاں ہاں تم ہم سے کس بات پر کبیدہ رہتے ہو۔ ہم تو تمھارے ہمیشہ مدّاح اور خیر خواہ رہے۔ جب کبھی تم ''ہلالِ عید'' کی صورت میں افقِ مغرب پر نظر آتے ہو تو ہم سب اپنے دیرینہ نفاق اور شکر رنجیوں کو الگ کر کے تمھارے آنے کی خوشی میں گلے ملتے ہیں، اور سب پچھلی باتوں کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ جب تمھارے حسنِ دل فروز پر تاریکی کی گھٹا (چندر گرہن) چھا جاتی ہے، گو تم زبانِ حال سے کبھی اس کا شکوہ نہیں کرتے اور اس حالت میں گویا تم ہمیں صبر واستقلال کا سبق سکھاتے ہو۔

لیکن ہم تمھارے شیدا ہیں۔ ہمیں خوب معلوم رہتا ہے، کہ کب تمھیں تکلیف رہتی ہے، اور کب تم شادر ہتے ہو۔ تمھارے تیوروں سے ہم بھانپ جاتے ہیں کہ تمھارے معصوم دل پر اس وقت کیا گزر رہی ہے، اور ہم بھی اسی وقت تمام خورد ونوش چھوڑ کر خشکی میں اور پانی کے اندر تمھاری نجات کے داعی ہوتے ہیں اور جب تک تم اپنی اصلی آب وتاب سے پھر نہیں نمودار ہوتے ہمیں سوائے عبادت وتضرّع وزاری کے اور کچھ نہیں اچھا لگتا۔ لیکن ہاں ہاں! ہم تمھارے شکرگزار ہیں کہ جب ہمارے رسولِ عربی کو بے دینوں نے اور کفارانِ عرب نے تنگ کر کے شق القمر کا معجزہ طلب کیا تو تمھیں تھے جنھوں نے ہمارے نبی کی صداقت پر اپنے آپ کو قربان کر دیا، اور دو حصوں میں ہو کر معجزے کو پورا کر دیا۔ دیکھو! یہ سب باتیں میں نے نہایت سادہ دلی و وفا کیشی سے پوچھی اور کہی ہیں! لیکن تمھیں میں دیکھتا ہوں کہ تم چپ رہتے ہو اور جب چپے کی باتیں سُن لیتے ہو تو جھٹ سے ابر کا نازک برقع اپنے نورانی چہرے پر ڈال لیتے ہو، یا کبھی کبھی ایک دم سے کھلکھلا کر ہنس پڑتے ہو۔ لیکن جب تک تم سارے سوالوں کا جواب نہ دے لوگے ہم بھی بادِ بہاری کی صورت میں ہو کر عقدہ کشائی کے لیے تمھارا نازک نقاب تمھارے چہرے پر نہ رہنے دیں گے، اور اگر تم ہمارا کہا نہ مانوگے تو پھر ہم سختی سے کام لیں گے اور ان سب گستاخ ملکہ ہائے ابر کو ایسا اُکسا اُکسا کر تنگ کریں گے، کہ آخر یہ سب افق کے نیچے تمھیں چھوڑ کر غائب ہو جائیں گے اور پھر اس وقت تمھیں خواہ مخواہ کہنا پڑے گا کاش! تم ہمیں کبھی تنہا ملتے تو ہم تم سے اپنے مصائب رو رو کر بیان کرتے۔ ہائے! میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں، کہ اگر تم ہماری رنج بھری داستان سن لوگے تو ہمارے ہمدرد بن جاؤ گے۔ لیکن تم تو بڑے چالاک اور پُرفن ہو کبھی تنہا رہتے ہی نہیں۔ اگر کبھی اب نہیں تو ستاروں کے جھرمٹ میں گھرے رہتے ہو، اور کبھی کسی بلند مینار یا پہاڑوں کی آڑ میں چھپ جاتے ہو۔ اچھا، لو اب میں تم سے کچھ نہ پوچھوں گا، لیکن میری آخری بات سن لو۔ اگر ممکن ہو سکے تو اشارتاً کنایتاً ہی اس کا جواب دے دو، تم یہ تو بتلا دو کہ تمھیں اپنے پُرانے مکینوں[1] کا غم تو نہیں ہے؟ جن کو تم نے اُن کو فنا ہو جانے کے بعد اپنے سینے میں جگہ دے رکھی ہے۔

---

[1] جدید تحقیقات کی رو سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ ماہتاب میں مثل ہماری زمین کی مخلوق بستی تھی۔ امتدادِ زمانہ سے جوں جوں گرمی نکلتی رہی کرۂ ماہتاب سرد ہوتا گیا۔ جیسا کہ نیچر کا اصول ہے، کہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہاں ہاں ہوگا! اور ضرور ہوگا! کسی کا ایک لختِ جگر اس دارِفانی سے کوچ کرتا ہے، تو وہ نالہ وشیون کے طوفان اُٹھا دیتا ہے، اور تم نے کروڑوں نورِنظر کو پیدا کیا، پالا پوسا، بڑا کیا۔ وہ تمھاری گودی میں کھیلے، اور فنا ہوگئے، اور لوگ تو سپردِ خاک کردیتے ہیں تم نے تو محبت مادرانہ کی وجہ سے اپنے سینے ہی سے چمٹا رکھا ہے۔ آہ! آہ! تمھیں یقینی اس کا افسوس ہے، لیکن میرے غمگین اور سوگوار! تم صبر کرو! اور پھر صبر کرو! ہم بھی اسی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ یہ ایک لاعلاج صورت ہے، سوائے ذاتِ باری کے اور کسی کو بقا نہیں، ہماری تمھاری سب یکساں حالت ہے آؤ ہم تم سب مل کر اپنی اپنی مصیبتوں اور اندوہ گینیوں پر نوحہ کریں اور اپنے اپنے دورافتادگان کے الوداعی سفر پر مرثیہ خوانی کریں۔ اگر تم مثل ایک معصوم اور بھولی بھالی نن، کے نوحہ کروگے، اور اپنے گزرے ہوؤں پر ابرِ بہاری کی طرح آنسو بہاؤ گے تو ہم بھی مثل ایک غمگین اور رنجور پیادہ پا کی طرح اُن پر مثل ابرِ باراں کے آنسو کی جھڑیاں لگادیں گے۔

آؤ! ہم جی بھر کے رولیں، اور اپنے دوستوں اور احباب کا الوداعی خیرمقدم ادا کریں۔ اب ہم لوگ سب غالباً اسی روز پھر ملیں گے جب کوسِ لمن الملک بجایا جائے گا، اور سب چھوٹے بڑے دوست، دشمن، ضعیف و نوجوان، ناتوان و سرکش، جابر و رحیم، بخس و بخیل، عالم و جاہل، فقیر و تونگر، ملحد و خداپرست، بہادر و بزدل، خدائے واحد کے دربار میں دست بستہ نیچے سر ڈالے ہوئے آخری اور سب سے آخری فیصلہ سننے کے لیے کھڑے ہوں گے اور اپنے اپنے اعمالِ نیک و بد کی جزا و سزا پائیں گے۔ اچھا! لو، یہ ہمارا آخری سلام ہے، اور بس رخصت ہے؎

السلام اے باز ما آئندگانِ رفتنی

(مطبوعہ صبحِ بہار، میسور، ستمبر 1912)

●●●

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) ہر اشیا موجودہ میں سے روز بروز حرارت زائل ہوتی جاتی ہے اور اسی طرح چاند میں اتنی سردی بڑھ گئی کہ کوئی زندہ چیز تاب نہ لاکر زائل ہوگئی۔ اسی اصول کو مدِنظر رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی وقت ایسا زمانہ آئے گا جب کہ اس دنیا کی بھی تمام مخلوق سردی کی تاب نہ لاکر فنا ہوجائے گی! (رشید احمد صدیقی)

ایک

اَے ذاتِ واحد کی صفتِ حقیقی! اور اَے مسئلہ کل کے ایک جُزِ معنوی! میں حیران ہوں کہ تجھے کیا کہوں! تو ایک طرح سے تو صفت کل رکھتا ہے اور دوسرے حساب سے جب ہم تجھے جزوی پَرتو سے دیکھتے ہیں، تو حقیقتِ کل کا ایک جز نظر آتا ہے۔ لیکن تجھ میں ایک عجیب طرفہ تماشا یہ ہے، کہ چاہے تیرے کتنے ہی ٹکڑے کیے جائیں، پھر بھی تو اپنی اصلی حالت پر نظر آتا ہے اور ان ٹکڑوں میں ہی تو ایک نمایاں امتیاز وحدانیت کا رکھتا ہے! اس وسیع عالم میں جب ہم تجھے دیکھتے ہیں، تو ہر ایک شے معلومہ یا غیر معلومہ کا آغاز و وجود تجھی سے پاتے ہیں۔ وہ کون سی شے ہے، قطع نظر اس کے کہ وہ اس دنیا میں کس تعداد میں پائی جاتی ہے، یا اس کے سلسلۂ وجود میں مختلف اشیا موجودہ کا کس قدر وجود پایا جاتا ہے جو بذاتِ خود و بحیثیتِ مجموعی امتیاز وحدانیت نہ رکھتا ہو۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ تو ایک مسئلہ لاینحل ہے، یا تیری ہستی ایک گہرے راز پر مبنی ہے کیوں کہ ہم ہر حال میں تجھے ایک نمایاں اور خاص صورت میں پاتے ہیں۔ ہم تیری صفتوں کو سمجھتے ہیں، لیکن ہاں ہاں یہ بھی ناممکن ہے، کہ تیری صفتوں کو تحریر یا تقریر میں ادا کر سکیں۔ کیوں کہ تجھ میں ایک ایسے باہمہ و بے ہمہ ہو کے رہنے کی صفت پائی جاتی ہے جو تجھ پر کسی خاص فیصلے کے اطلاق کرنے سے باز رکھتی ہے۔ اگر ہم تمام دنیا کی چیزوں کو اپنے ذہن میں رکھ کر ہر ایک کو جنس وار الگ الگ کر کے رکھیں، اور پھر ان حصوں کو الگ الگ تفریق وار رکھیں، اور پھر اُن تفریق شدہ اجزا کی

تفریق کرتے جائیں، تو ہمیں معلوم ہوگا کہ دنیا کی ہر ایک قسم کی اشیا کی وہیں تک تقسیم ممکن ہے، جب تک اس میں وحدانیت قریب تر ہو جائے اور جب صفتِ وحدانیت پیدا ہوگی، تو پھر اس کے آگے کوئی خاص اور متمائز صورت پیدا نہیں ہو سکتی کیوں کہ تمھارا ہر ہر ٹکڑا بذاتِ خود ایک شے واحد رہ جائے گا!

اچھا اب تو ہی بتلا کہ تو کیا ہے؟ ایک صفتِ نامعلوم ہے یا ایک صورتِ بے گانہ! تمام اشیا کا انتہائی پتہ تجھ تک جا کر رُک جاتا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تو ہی کائناتِ عالم کی ایک روحِ رواں ہے، اور ان کی تکوینِ وجود کا باعثِ حقیقی۔ اگر اس کی روحِ رواں تو ہے، تو خالقِ حقیقی کی ایک نادیدہ پرتو ہے، اور اگر باعثِ حقیقی تو بذاتِ خود وہی ہے، اور اگر بذاتِ خود وہی ہے تو ذاتِ باری بھی تیری ایک صفت ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر تو کیا ہے؟ کیا تو ایک صفتِ غیر معلومہ ہے؟ نہیں، نہیں! یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ ہم تیری اہمیت و واقعیت کو اپنے ذہن میں محسوس کرتے ہیں، لیکن ہاں اس کو تشریح وار بیان کرنے سے البتہ قاصر ہیں اور پھر کسی جز کا پیدا ہی ہو جانا، اُس جز کے وجود کا ثبوت ہے۔ (وجود سے یہاں مطلب کوئی مادّی شے نہیں ہے، بلکہ محض ایک ہستی یا کسی جز کا ہونا) اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تیرا وجود بے شک ہے۔ چاہے ہم اس کو بیان نہ کر سکیں اور اگر ایک صورتِ بے گانہ ہے تب بھی ایک صفتِ بے گانگی تو رکھتا ہے، اور اس طرح سے بھی تیرا حیرت انگیز وجود ماننے کے لیے ہم تیار ہیں، اور تیار ہی نہیں بلکہ مجبور ہیں۔ آہ! اس دنیا میں جو نادر اور عجیب ہے وہ ہمیشہ ''ایک'' ہی پایا گیا ہے۔ دنیا میں ''ایک بات'' اور ایک، سچے قول کا شخص ہمیشہ معزز و باوقعت خیال کیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے فلسفی و منطقی ہمیشہ کوئی ''ایک شے'' مان لینے کے بعد اپنے دلائل پیش کرتے ہیں، اور ان کے تمام مباحثے کا وجود اُسی ''ایک'' پر مبنی ہوتا ہے۔ قانونِ قدرت بھی 'ایک' ہی اصول پر رکھا گیا ہے۔ ایک ریاضی داں شخص جب تک کوئی چیز ایک نہیں مان لیتا تب تک اس میں سرگرداں رہتا ہے۔ دنیا کے تمام نوع کی جدا جدا چیزیں ایک قسم کی بنائی گئی ہیں۔ خود یہ دنیا ایک لفظ ''کن'' سے بنی ہے، اور ایک ہی لفظ سے اس کی نیستی بھی ہوگی۔ دنیا میں ہمیشہ اکیلی، چیز نادر اور عجیب سمجھی گئی ہے۔ ہمارے فخرِ کل رسولِ عربی بھی 'ایک' ہی بنائے گئے۔ ان کا ثانی پھر کوئی نہیں بنایا گیا!

اُف اُف! اَے صورتِ نادیدہ! اور اَے ایک زندۂ جاوید حقیقت! تمام اشیا موجودہ یا غیر موجودہ، یا وہ احساسات، باطنی، جو قوائے ذہنی سے محکوم کیے جاسکیں۔ سب کا ماویٰ و ملجا تو ہی ہے، تیرے ہی لیے کوئی جنگلوں میں پھرتا، اور پہاڑوں کے درّوں اور وادیوں کے تاریک غاروں میں اکیلا تمام دلچسپیوں کو چھوڑ کر بیٹھا ہوا، اپنے خیالات میں مستغرق ہے۔ کوئی تنہا ایک بوریے پر بیٹھا ہوا تیرے ملنے کے خیال میں ہے۔ تیرا ہی ہر جگہ در پردہ جلوہ ہے۔ کہیں تو کسی مندر میں تیری گیت بج رہی ہے، اور کہیں ناقوسِ کلیسا میں تیری ہی آواز آ رہی ہے۔ کہیں تیری آرزو مؤذن کی زبان سے نکل نکل کر فضائے محیط میں گونج رہی ہے۔ دنیا میں جتنی قومیں ہیں، سب نے تیرے جلوہ کو مختلف پہلو سے دیکھا۔ تیرے اس اختلاف ظاہری نے دنیا کی قوموں میں ایک عجیب تفریق ڈال دی ہے، اور یہ فرقِ عظیم اس وقت تک نہیں مٹ سکتا، جب تک کہ تو دنیا کے آخری روز میں تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہو کر کوس لمن الملکی نہ بجائے، اور اپنے کوان پر ظاہر کر دے!

(مطبوعہ: صبحِ بہار، میسور، اکتوبر۔ نومبر 1912)

●●●

کائناتِ عالم پر ایک سرسری نظر

کائناتِ عالم جو کہ اپنے خالقِ بے نیاز کی بے بہا صنعتوں کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے، اور اس خاکی پتلے کی ایک عارضی جائے قیام ہے۔ کچھ ایسی طلسم نما اور دلکش واقع ہوئی ہے کہ اپنے قدرتی جذبات کی کشش سے، انسانی طبیعتوں کو محض نتائج اور دل فریبیوں کی ایک ہی رُخ کی تصویر دکھلا کر گرویدہ کر رہی ہے۔ ذاتِ انسانی اور اس عالمِ اسباب میں کچھ ایسے باہمی تعلقات اور ایک دوسرے کے ساتھ ایسی مناسبت نیچر نے پیدا کر دی ہے کہ کسی خاص ایک کے وجود کو دوسرے کا سبب بتلانا ایک اہم ترین مسئلے سے تعلق رکھتا ہے۔

واقعی نظامِ عالم کی مجموعی دلچسپیوں کے نظارے میں ایک ایسی خاص قسم کی رہ نمائی و دلکشی پائی جاتی ہے، کہ ممکن نہیں کہ انسانی طبیعت کو ایک خاص قسم کا رجحان نہ ہو۔ تمام مخلوقاتِ ارضی یا وہ اسباب جو اس دنیا کے وجود کے جزیات ہیں، یا سیارگانِ فلکی یا وہ عناصر جو انسانی جزئی زندگی کا جزوِ اعظم ہیں یا وہ اسباب جو کہ ان قدرتی اسباب و جزیات کی تکمیل یا ترقی یا تنزلی کے لیے عالمِ وجود میں لائی گئیں، اُن کی ماہیئت کو سمجھنا اور ان کے وجود کو خاص ضروری سمجھنا اگر عقلِ انسانی کے نزدیک ناممکن نہیں تو اہم ضرور ہے۔

بڑے بڑے متقدمین و متاخرین نے اپنی تمام عمر اسی کھوج اور تلاش میں گزار دی، لیکن کوئی امرِ مسلمہ نہیں قائم کر گئے۔ لیکن ان کی ناکامیابی اُس مسئلے پر مبنی ہے جس کا مفہوم یہ

ہے کہ کسی جز سے یہ ممکن نہیں کہ کل کی ماہیئت دریافت کر سکے اور انسان تو محض کائناتِ عالم کے مجموعی اسباب کا ایک جز ہے۔ قبل اس کے کہ میں کوئی دوسری بحث اُٹھاؤں مناسب سمجھتا ہوں کہ پہلے پہل نوعِ انسان ہی کے حیرت انگیز وجود پر کچھ بحث کروں۔

عرصے سے مادّی زندگی کے تولد کا مسئلہ معرکتہ الآرا چلا آ رہا ہے۔ مقلدینِ مادّہ کا مقولہ ہے کہ موجودہ دنیا کا وجود رفتہ رفتہ مختلف طریقوں سے اور اسبابِ مادّی کے مختلف باقاعدہ اصولِ نشوونما سے ہوا ہے۔ ثبوت میں وہ یہ کہتے ہیں کہ کسی ذی روح کی نیستی ان جزوں پر مبنی ہے، جن چیزوں سے اس کی تکمیل ہوئی تھی۔ کیوں کہ جب کسی خاص جز مادّہ کا زور ہوا اس کا اثر بے قاعدہ اصول کے خلاف دوسروں پر ہوا۔ اسی طرح سے جہاں جثۂ انسانی کے جزئیات میں گڑبڑ ہوئی، وہیں نظامِ نشوونما میں بھی فرق آ جاتا ہے، اور جوں جوں کیفیت متغیرہ ترقی پکڑتی جاتی ہے توں توں مادّۂ اسفل کی جانب راجع ہوتا ہے، اور آخر میں اسی میں نیستی وقوع میں آ جاتی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ پہلے پہل جو انسان بنا وہ مادّی تھا اور جمیع جزئیاتِ مادّہ کے باقاعدہ اصول سے اس کا وجود ہوا، لیکن اب جب عالمِ ظہور سے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ پیدائشِ انسانی اب تو بالکل تولد وتناسل کے قاعدے سے ہونے لگی ہے۔

یہ دنیا عالمِ اسباب ہے۔ سب باتوں میں کوئی نہ کوئی اصلیت معلوم ہوتی ہے، اور انسان کے خلط ہی میں تحقیق وتفتیش کا مادّہ ڈال دیا گیا ہے۔ بغیر کسی خبر کی حقیقت و ماہیئت دریافت کیے ہوئے اطمینان ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی قول کے مطابق میرے دل میں بھی اگر اسی قسم کا خیال پیدا ہوا ہو تو کچھ بے جا نہیں ہے۔ دانش مندوں کا قول ہے کہ پہلے انسان اپنے کو خود پہچانے اور بعد اس کے دوسری چیزوں کے پہچاننے کی کوشش کرے۔ اپنی ماہیئت دریافت کر لینا اور اس پر کافی نتائج نکالنا کچھ معمولی بات نہیں ہے۔ اگر انسان محض مادّی ہوتا، تو بھلا اُس میں ذکا وفہم، ہمت و جرأت، غم و غصہ، محنت و جفاکشی، محبت و ہمدردی، زہد و اتقا، صبر و استقلال، جدّت پسندی، نفاست، عالی دماغی، خیالاتِ سیاسی، معرفتِ حقیقی، عشقِ مجازی و حقیقی، ان سب باتوں کو جانے دیجیے، جوہرِ انسانیت کہاں سے آتا ہے، وہ محض لچر وناچیز اور دوسرے کا محتاج ہے۔ یہ سب باتیں بھلا ایسی ایک اسفل چیز سے کہاں سے پیدا ہو سکتی ہیں؟

بہر حال مادّی و روحی مسئلہ کچھ ایسا پیچیدہ و اہم سا ہو رہا ہے کہ محض ایک طرفی فیصلہ کر دینا، اگر بے موقع نہیں تو بے انصافی ضرور ہے۔ اگر ہم وجودِ انسانی کو روحی کہتے ہیں تو ہم اس کی ہستی کو مادّی بغیر کہے ہوئے نہیں رہ سکتے۔ اور اسلامی فلسفہ بھی اس کی بابت ہم سے موافقت کرنے کے لیے تیار ہے۔ ابھی ہم پہلے کہہ آئے ہیں کہ تناسب مساوی کے باقاعدہ اصول نشو و نما میں ابتری آجانے سے موت وقوع میں آتی ہے۔ کیوں کہ یہ بات مذہب اسلام میں بھی ہے کہ جب آدمی کے مرنے کا وقت آتا ہے، اور قریب ہوتا ہے کہ معاملۂ حیات و ممات میں ایک خاص تفریق بپا ہو جائے اس وقت عناصرِ اربعہ اپنے اپنے مختلف اجزا میں شامل ہونے لگتے ہیں، اور بعد ہی اس کی موت واقع ہوتی ہے۔

اب ہم یہاں تک آئینے کے ہر دو رُخ دکھلا چکے، لیکن ہمارے ناظرین جلدی سے غلط فہمی میں پڑ جائیں گے۔ اگر صرف اسی جگہ سے کوئی رائے قائم کریں گے، کیوں کہ بغیر دعویٰ کی دلیل کے سمجھے ہوئے دعوے کو غلط کہنا سراسر ناانصافی ہے۔ میں مختصراً معاملے کو پیشِ ناظرین کرتا ہوں۔ حیاتِ انسانی اور مادّی زندگی میں جو بیّن فرق ہے وہ یہ ہے کیوں کہ اوّل الذکر کا مدار بالکل روح پر ہے، اور آخر الذکر کا مقولہ ہے، کہ مختلف اشیائے مادّی مثلاً فلیورائڈ، فاسفیٹ و سلفیٹ وغیرہ کے باقاعدہ اور قدرتی تناسب اور ہر ایک کے باہمی اور مناسب خلط سے تکوینِ حیات ہوسکتی ہے۔ اس کے مقلدوں نے ان چیزوں کو باقاعدہ ترتیب دے کر اس میں کیفیتِ حیاتی معلوم کی ہے، جس کو انھوں نے بڑی شرح و بسط سے لکھا ہے، جو بہ خوفِ طوالت درج نہیں کر سکتا۔ لیکن ایک تھوڑی دیر کے غور سے یہ بات حل ہوسکتی ہے کہ آخر مادۂ حیات و روحی حیات میں کون بڑا فرق ہے۔ اسلامی فلسفہ سے یہ بات ظاہر ہے کہ انسانی وجود کے جزیات عناصرِ اربعہ سے بنائے گئے ہیں، لیکن اُس میں ایک ایسی چیز ڈال دی گئی، جس سے کہ جثۂ انسانی اس قابل ہوا کہ اُس پر حیاتِ انسانی کا اطلاق ہو سکے یا یوں کہیے کہ انسان کا جسم مثل ایک مشین کے ہے، جس کے کل پُرزے نہایت مناسب و باقاعدہ طریق سے بنے ہوئے ہیں۔ لیکن اُن تمام پُرزوں کو چلانے والی جو شے ہے، وہ بجلی ہے۔ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس مشین کی روح بجلی ہے۔ کیوں کہ بغیر اس کے تمام کل اور پُرزے بے کار و فضول ہیں۔ اسی طرح سے اگر بجلی کی قوت مشین سے

نکال لی جائے تو، تمام کل اور پرزے ساکت و غیر متحرک رہنے سے بالکل اور بیکار و زنگ آلود ہو جائیں گے، اور اسی طریق سے وہ خراب ہوتے ہوتے اخیر میں کچھ نہ رہ جائیں گے۔ روح کو بدن سے نکال لیں تو تمام اعضائے رئیسہ کا کام بند ہو جائے۔ معدہ اپنا کام چھوڑ دے، دماغ اپنے کام سے دست برداری کر لے، اور اس طریق سے کسی عضو کی جب پرورش نہ ہو گی تو کل بیکار و فضول ہو جائے گی۔ روح اور مادّی زندگی کا واقعی کچھ ایسا معاملہ ہے جس سے بڑے بڑے علامۂ دہر بھی چکّر میں آ گئے ہیں۔ مولانا شبلی نے بھی اپنی تصنیف الکلام میں اس کی بابت بڑی دھیمی آواز سے خامہ فرسائی کی ہے، اور سوادِ تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا نے اس معاملہ کو محض قسم اُتارنے کے لیے اپنی غلطہ خیز تحریر میں چپکے سے جگہ دی ہے۔ بہرحال میرے خیال میں مادّی حیات (جیسا کہ مقلدینِ مادّہ کا خیال ہے) کے لیے جو حرکتِ عزیزی تمام مجموعی صورتوں سے پیدا کی گئی ہے، یعنی وہ لطیف ترین شے جو کہ تمام طریقِ مادّی کے باقاعدہ تکوین سے پیدا ہوئی ہے اور جو کہ قریب قریب تمام مادّی کسوفات کا نچوڑ ہے روح کہی جا سکتی ہے۔

اس معاملہ کو اگر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے تو معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ اسلام ''روح'' کو خدائے واحد کی ذاتِ ستودہ صفات کا ایک حصہ اور جثۂ انسان کے اصولِ نشوونما کو باقاعدہ اور جمیع اعضائے رئیسہ کے وجود کو مناسب طور سے کام میں لانے والا اور انسان کے جمیع جزئیات کا جزوِ اعظم ہونا اور اس عالمِ دنیا کی جمیع اشیائے مخلوقہ عین ایک سطح پر ہونا بتلاتا ہے۔ مقلدینِ مادّہ روح کے وجود کے منکر ہیں، کہ خورد و نوش آب و ہوا، دل و دماغ، کے باقاعدہ افعال، نظامِ عصبی کے بااصول نشوونما سے جثۂ انسانی میں ایک حرکتِ عزیزی پیدا ہوتی ہے اور وہی تحریک نظامِ جثۂ انسانی کی روحِ رواں ہے، اور جسے دوسرے معنوں میں (Energy) کہتے ہیں۔ گو ہم اپنے خیال کے موافق اُسے ''روح'' کہہ لیں، لیکن اگر روح اور انرجی میں فرق ہے تو یہ کہ اوّل الذکر ایک لازوال شے ہے، جیسے کہ اسلامی فلسفہ کے مطابق زوال نہیں ہے۔ لیکن مقلدینِ مادّہ ''انرجی'' کی بابت یہ کہتے ہیں کہ اس کا وجود دوسرے اعضا کے باقاعدہ اصولوں پر مبنی ہے۔ بہرحال انرجی کی تکوینِ اسباب میں ایک خاص امتیاز اور ایک دوسرے کے باہمی تعلقات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا میرے نزدیک ایک امر لاینحل ہے۔ قریب قریب یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم

ہیں۔ بہرحال یہاں تک معلوم ہوا کہ مقلد-ین مادّہ اس بات کے مقر ہیں کہ جثۂ انسانی میں ''انرجی'' کا وجود ہے۔ ان فروعات کو نظرانداز کر کے اگر ایک مغائرانہ نظر ڈالی جائے اور روح وانرجی کے تفریق کا کوئی سبب غور کیا جائے تو اس بات کا کچھ کچھ پتا چلتا ہے کہ ان دونوں میں بہت ہی قریب کی مناسبت ہے۔ بہرحال اس معاملے کو میں ذرا تفصیل سے بیان کرنے کی التماس کرتا ہوں تا کہ ناظرین کو غور وخوض کی تکلیف نہ گوارا کرنی پڑے۔

انسان کی فطرت میں خیال کی قوت ایسی زبردست پیدا کر دی گئی ہے کہ جس پہلو پر اس کا خیال جم جائے، اور جس بات کا اس کو خیال ہو، ویسے ہی افعال اس سے سرزد ہوتے ہیں۔ کیوں کہ خیال کی قوت کا وجود و تعلق دماغ سے ہے، اور انسان سے کوئی فعل وقوع میں نہیں آتا، جب تک کہ دماغ سے اسے اجازت نہ ملے۔ بہرحال اسی سلسلے میں اگر دل و دماغ کے باقاعدہ افعال کا حال لکھوں، تو ایک دفتر ہو جائے، اور ناظرین مجھ پر سوئے مطلب سے دور پڑنے کا الزام رکھیں۔ اس لیے صرف اسی مقام تک اکتفا کرتا ہوں، کہ تمام افعالِ انسانی کا مقام دماغ ہے۔ اگر ہمارے معزز ناظرین ان معاملات کے قبل از وقت سننے کے مشتاق ہیں تو اس کے متعلق کی کتابیں ''علم کاسۂ سر'' اور ''علمِ روح انسانی'' مطالعہ فرمائیں۔ اگر تکلیف گوارا نہ ہو تو چندے توقف فرمائیں۔ بندہ خود کسی آئندہ نمبر میں ان پر کافی روشنی ڈالے گا۔ بہرحال جب تک آپ روح وانرجی (یا مادّی حیات) کا ایک طرفی خیال اپنے دماغ سے نہ نکال ڈالیں گے۔ اس پیچیدہ مسئلہ کی بھول بھلیوں میں ہمیشہ سرگرداں رہیں گے۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ اپنے عزیز خیال کو ہمیشہ کے لیے نکال ڈالیں، بلکہ اُسے تھوڑی دیر کے لیے پسِ پردہ ڈال دیں، اور اس مسئلے کو بالکل نیا سمجھ کر غور کریں۔ یہ دنیا عالمِ اسباب ہے، کسی چیز کا وجود اس میں فضول اور لایقینی نہیں ہے۔ ہر ایک کا ایک دوسرے سے ایک عجیب پوشیدہ اور گہرا تعلق ہے۔ ہمیں خدائے پاک کی صنعتوں کا عشرِ عشیر بھی اب تک نہیں معلوم ہے۔ غور کیجیے کہ ہم لوگ اپنی روزانہ کی چیزوں کے وجود کی ضرورتِ خاص اور ان کی ہیئت کو نہیں پہچان سکتے، پھر تمام عالم کا کیا کہنا؟ اب یہاں سے جو مسئلہ زیرِ بحث ہے وہ یہ ہے کہ روح وانرجی میں کیا فرق ہے؟ اسلام جسے ''روح'' کہتا ہے اُسے حیاتِ مادّی کے مقلد، انرجی، کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن وہ یہ کہتے ہیں کہ انرجی بیرونی طریقوں اور خورد و نوش و

نظامِ جسمانی سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی کے برخلاف روح کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ یہ ہماری مختلف طبیعتوں کا سبب ہے کہ ہم ایک ہی چیز کو مختلف طریقوں پر لے جاتے ہیں۔

سائنس کا مسئلہ ہے۔"Matter is not Lost" مادّہ کبھی نیست نہیں ہوتا، اور جو واقعی بالکل سچ ہے۔ اگر اسی معاملہ پر ہم مقلدینِ مادّہ کے خیالات و عقائد کو لیں تو معلوم ہو جائے کہ واقعی مادہ ایک لازوال انرجی جو اس کا نچوڑ ہے، اعلیٰ تر ہے۔ کیسے زوال پذیر ہو سکتی ہے اب میں یہاں ثابت کر چکا کہ روح اور انرجی ایک ہی چیز ہے۔ چاہے اسے ہم کسی اور پیرائے میں لے جائیں، لیکن ماحصل دونوں کا ایک ہی ہے۔ اب یہ رہ گیا کہ اسلام نے روح کو ایک پاکیزہ اور اعلیٰ ترین شے اور خدائے واحد کی ذاتِ ستودہ صفات کا ایک حصہ بتلایا ہے، اور مادہ ایک معمولی اور اسفل چیز ہے۔ اس کے لیے میرے نزدیک غالباً یہ ثبوت کافی ہوگا کہ صانع کے طرز و جدت و نفاست اور قریب قریب ہر ایک وضع اور ڈھنگ مصنوع دین پائی جاتی ہے۔ یہ ایک خاص امر مسلمہ ہے، اس پر اسلام کا وہ معنی خیز مسئلہ مبنی ہے جو بتلایا ہے کہ تمام دنیا میں حقیر سے حقیر اور بدتر سے بدتر چیزوں میں خدائے تعالیٰ کی ایک جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ وسیع دنیا اسی خالقِ برحق کی بنائی ہوئی ہے اور وہ معبودِ برحق لازوال ہے۔ اس لیے اگر اُس کی ذات کی کوئی خاص جھلک اُس میں پائی جائے تو کیا تعجب ہے؟ لیکن یہ پرتو ہر ایک چیز میں سطحی ہوتا ہے۔ اگر کہیں یہ پرتو رگ و پے میں سرایت کر گیا تو، آج ذرّہ ذرّہ سے صدائے ''اناالحق'' بلند ہوتی اور نظامِ عالم میں کایا پلٹ ہو جاتی۔ محض ایک ہی جھلک میں تو منصورؒ خود زدی بانگِ اناالحق برسرِ دار آمدی کے مصداق سے بیخود انِ معرفتِ الٰہی و مدہوشانِ عشقِ حقیقی اسی کے کرشمۂ اُلفت میں جان و مال سے ہاتھ دھو بیٹھے، اور اپنے کو ''من تو شدم تو من شدی'' کا حق دار ثابت کرنے کی کوشش کی۔

اب میں یہاں ثابت کر چکا ہوں کہ روح اور انرجی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اب رہی یہ بات کہ روح کو ہم کس طرح پہچان سکیں، اور اس کی اہمیت کو کس طرح سے تحقیق کر سکیں۔ یہ معاملہ البتہ ذرا بہت ہی تمہید طلب ہے۔ اگر جلدی ہی سے صاف صاف لفظوں میں بیان کر دیا جائے تو ناظرین کے سمجھنے میں بڑی دقّت ہوگی۔ لہٰذا تھوڑی سی ابتدائی تمہید لکھنے کی اجازت چاہتا ہوں، اور پھر اُمید ہے کہ ناظرین کو شکایت کا موقع نہ ملے گا۔ اس دنیا کے موجوداتِ ظاہری

کے معلوم کرنے کے لیے ہمیں قدرتاً پانچ آلے ملے ہیں، اور ہم تمام موجوداتِ عالم کا جو منشا ہمارے مشاہدے میں آتا ہے، اور جس سے ہم ذاتی تجربہ حاصل کرتے ہیں، انھیں آلات سے کام لیتے ہیں۔ اس لیے آج میں اُنھیں کے وجود پر بحث کرتا ہوں۔ وہ آلے، سمع، بصر، شمہ، ذوق اور لمس ہیں ان کے سوا اور ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے ہم کسی اور اجزا کی صفت دریافت کرسکیں، جو ان پانچوں کی قوت سے باہر ہو۔ اسی وجہ سے ہم کسی ایسی صفت کے اندازہ کرنے کے بالکل ناقابل ہیں جو کبھی ہمارے تجربے اور مشاہدے میں نہ آئی ہو۔ عقل وفہم، تجربے اور مشاہدے ہی ہمارے پاس ایسے آلے ہیں جن پر ہمارے عام خیالات کا مدار ہے۔ درحقیقت ان کے خلاف ہمارے لیے کسی امر کو تسلیم کرلینا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ منکرِ خدا اور روح کو ہمیشہ یہ دعویٰ رہا ہے کہ جس چیز کو ہم دیکھ نہ سکیں اُس کو کس طرح مان سکتے ہیں۔ ان کا یہ اعتراض لوگوں کو مشتبہ کردیتا ہے، اور اکثر لوگوں کو ان کے عقائد پر متزلزل بھی کردیتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم کچھ اور بحث کریں ہمیں یہ اندازہ کرلینا چاہیے کہ آیا ہمیں ان چیزوں کے دریافت کرنے کی قوت بھی ہے؟ اور ہم لوگ اس کا اندازہ بھی کرسکتے ہیں؟ اور جن جن آلات سے ہم یہ اُمید کرتے ہیں کہ ہم ان سے ماہیت دریافت کرسکتے ہیں آیا وہ اس قابل بھی ہیں یا نہیں، اور ان خیالات کے معلوم کرنے میں آخر وہ ہماری کہاں تک مدد کرسکتے ہیں۔ بہت سی باتیں دنیا میں ایسی ہیں، جن کی ماہیت انسان کو اب تک نہیں معلوم ہے، یہ ہماری بہت بڑی غلطی ہے۔ اگر ہم کسی چیز کو نہ جان سکیں تو اس کے وجود اور اصلیت ہی کے منکر ہوجائیں۔ بہت سی ایسی باتیں ہیں جو پہلے پہل دنیا میں کسی کو معلوم نہیں تھیں، اور کسی کو یہ گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ کبھی ایسی ایسی نادرالوجود اختراعیں اس دنیا میں ہوں گی۔ جوں جوں زمانے میں ترقی ہوتی گئی، توں توں مشاہدات اور تجربات میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ کیا کسی کو بھی پہلے پہل معلوم تھا کہ زمین گول ہے اور سورج کے گرد چکر لگاتی ہے، اور اس میں قوتِ کشش پیدا کردی گئی۔ بہرحال ہم لوگ پہلے پہل ان سب باتوں کو بالکل مہمل اور ناممکن الوجود سمجھتے، تو اب خیال کرسکتے ہیں کہ ہم لوگ کتنی غلطی پر ہوتے۔ اس خیال سے ممکن ہے کہ ہمیں روح کی اصلیت اور ماہیت دریافت کرنے کی قوت ہی نہ ہو، لیکن ایسی نافہمیدگی کا خیال نہ کرکے ہم اس کی بابت قطعی فیصلہ کرلیں تو یہ ہماری کوتاہ بینی نہیں تو اور کیا ہے؟ بہرحال ایسی

چیزوں کی ماہیت کی دریافت کا ارادہ کرنا یا ان کی تحقیق کرنا جو آلات دنیوی یا حسنِ ظاہری سے نہ محسوس ہو سکیں۔ ہم اپنی روحانی طاقت کا زور ڈالتے ہیں فہم و ادراک، تعقل، مکاشفہ، مشاہدہ انھیں سب کے ذریعے سے ہم اُن سب باتوں کو معلوم کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں اب یہ دیکھنا ہے کہ آیا یہ سب آلات اس قابل بھی ہیں کہ ان کے تجربے اور مشاہدات اور خیالات پر اگر ہم کاربند ہوں تو ہم کسی معاملے میں کامل محقق ہو سکتے ہیں۔ تجربات اور عقلی دلیلوں کا سب مدار ذہن پر ہے۔ یہ ایک ایسی قوت ہے، جو قدرت کی طرف سے ہر شخص کو کم و بیش ملی ہے۔ پہلے انسان کی معلومات کا خزانہ اور اس کے تجربات اور مشاہدات کا مفہوم ہے۔ اگر یہ قوت انسان میں نہ ہوتی تو نظامِ عالم میں فرق آ جاتا۔ ہزاروں دقتوں کا سامنا اور طرح طرح کی مصیبتوں میں پھنس جاتا، روزمرہ کے ذرا سے ذرا کاموں میں ہم اس سے مدد لیتے ہیں، اور شاید تمام طاقتِ جسمانی و روحانی سے زیادہ خرچ اسی کا ہوتا ہے۔ لیکن جس ذہن پر ہم ایسے نازاں ہیں، اُس کے لیے بس اور محدودگی بھی خیال کیجیے گا۔ وہ ایک نقطۂ مرکز کسی خیال سے عاجز اور نقطۂ لاانتہا کے اندازہ کرنے میں حیران ہے۔ آپ کسی بات کو برابر خیال کیے جایئے، اور جتنی فروعی رُکاوٹیں راستے میں ملیں اُن پر ایک سطحی نظر ڈالتے ہوئے اسی خیال اور ذہن کے فعل کا سلسلہ جاری رکھے جایئے آخرکار آپ آخر میں ایک ایسی جگہ پہنچیں گے، جہاں سے پھر آپ کے خیالات کسی طرح سے آگے بڑھتے ہی نہیں گویا کہ خیالات کی وہاں جا کر حد بندی ہو جاتی ہے۔ آخر وہاں پہنچ کر کیوں ایسا ہو جاتا ہے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہن کی قوت محدود ہے، اور وہ کسی مقررہ جگہ کے آگے بڑھنے سے بالکل ناقابل ہے۔ لیکن اگر ذہن میں فرض کیجیے، اتنی قوت ہوتی کہ وہ برابر خیال کیے ہی جاتا، اور کہیں نہ رُکتا، تو اس سے کیا نتیجہ پیدا ہوتا۔ چلۂ انسان میں جو ایک حصہ ذاتِ باری یا ایک جھلک معبودِ حقیقی کی پائی جاتی ہے وہ آخر میں پہنچتے پہنچتے اس مقام پر آ جاتا ہے، اور انسان کو اپنی حالت معلوم ہونے پر بے اختیار اپنی اصل میں مل جانے کی خواہش پیدا ہو جاتی اور اسی طرح سے اس عارضی دنیا میں ہمیشہ ایک ہلچل مچی رہتی۔ گو ایسا ہونا ناممکن نہیں، کیوں کہ بڑے بڑے خدارسیدہ اور بزرگانِ دین ''من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی'' کے دائرے میں چلے گئے۔ لیکن انھیں پھر اس قسم کا موقع نہ ملا کہ وہ ہم دنیاداروں کے پاس آتے، تو معلوم ہوا کہ مصلحتاً ہمارے ذہن اس معاملے میں محدود

کردیے گئے ہیں۔ دوسری دلیل اور غالباً سب سے زیادہ مضبوط یہ ہے کہ انسان جو کھاتا، پیتا، سوچتا، اُٹھتا، بیٹھتا بہر حال جملہ افعالِ دنیوی سب اسی روح کی تحریک سے ہوتے ہیں تو اگر روح یہ خیال کرنے لگے، روح کیا چیز ہے؟ تو وہ بھلا کیا بتلا سکتی ہے اور کس کو بتلائے جو اس کو سمجھے؟ وہ جو کچھ سمجھے ہوئے ہے خود ہی سمجھے ہوئے ہے۔

مثلاً فرض کیجیے، کہ ایک اندھا مادرزاد ہے۔ اس سے آپ پوچھیے کہ ''بھئی! تجھے کیا معلوم ہوتا ہے؟'' تو وہ آپ کو کیا بتلا سکتا ہے؟ وہ اپنے خیالات یا جو کچھ کہ اسے معلوم ہوتا ہے خود سمجھے ہوئے ہے۔ پھر فرض کیجیے کہ ایک اور ایسے ہی اندھے کو اُس کے پاس لا کھڑا کر دیجیے، اب دونوں سے کہیے، وہ ایک دوسرے سے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ دونوں کی حالت یکساں ہے، دونوں کو ایک ہی قسم کی چیزیں معلوم ہوتی ہوں گی۔ دونوں کے ایک ہی قسم کے خیالات اپنے اندھے کی بابت ہوں گے۔ اگر اب یہ کہیے کہ ایک دوسرے سے یہ کیوں نہیں کہتے کہ ''مجھے اندھیرا اندھیرا سا معلوم ہوتا ہے۔'' ''مجھے کچھ نظر نہیں آتا'' وغیرہ۔

لیکن مشکل تو یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہی نہیں کہ ''اندھیرا کسے کہتے ہیں؟'' کیوں کہ اگر انھوں نے روشنی دیکھی ہوتی تو اندھیرے کا اندازہ ہوتا۔ لفظ نظر آنا، تو ان کے خیال میں کبھی آ ہی نہیں سکتا۔ بہر حال یہ سب کچھ ہے، دونوں کی حالت یکساں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انھیں کسی کا کچھ نظر نہیں آیا۔ لیکن یہ کہ وہ اپنے خیالات کو ایک دوسرے سے ظاہر کر سکیں بالکل ناممکن ہے۔ مخالفین کا اعتراض یہ بھی ہوتا ہے کہ جس چیز کا ہم احساس یا وجود نہ پائیں، اُس کے وجود پر ہم کیوں کر کار بند ہوں، اور سب سے پہلے عقایدِ روحانی پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ اس کی ہستی یا وجود کے قائل نہیں ہیں۔ آپ سوتے تو ضرور ہوں گے، سوتے میں خواب بھی ضرور دیکھتے ہوں گے، اور کتنے موثر خواب بھی دیکھتے ہوں گے۔ آپ نے سوتے میں کبھی کبھی یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ''کسی بلند زینے سے گر رہا ہوں'' اور معاً ایک ایسا ہچکولا ہوتا ہے کہ آپ گھبرا کے بیدار ہو جاتے ہیں۔

بہر حال سب کی بابت تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ محض خیالات کا پَرتو ہے، یا اس کے وجود کی کوئی اصلیت نہیں۔ (مطبوعہ: صبح بہار۔ بنگلور، مارچ 1914)

●●●

مشاہیر یونان

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را [1]

برادرانِ کالج جن اغراض و مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر علی گڑھ منتھلی عالمِ وجود میں لایا گیا تھا اس میں کس حد تک کامیابی ہوئی، اور اُس کی صورت حال اس کے پیش نہاد کی کہاں تک حقیقی ترجمانی کرتی ہے اور کالج کے موجودہ اربابِ حل و عقد اس امر کے کہاں تک ذمہ دار ہیں۔ایک سلسلۂ سوالات ہے جس کا اگر کوئی جواب نہیں تو ازالہ کرنا تو ہم سب پر ایک اخلاقی فرض ہے۔ کچھ منتھلی ہی نہیں ہماری تمام اُولوالعزمیوں کا ایسا ہی غم ناک انجام ہوتا ہے، اور چوں کہ ان کا سرچشمہ بسا اوقات خوش وقتی ہوتا ہے۔اس لیے اُن کی ابتدا و تخلیق گویا اُن کی فوری انحطاط کا پیش خیمہ ہے۔دوستو کیا ہمارا سرمایۂ افتخار ہمارا چمنستان کالج اور ہمارے مایۂ ناز وہ سدا بہار گل ہائے شگفتہ نہیں ہیں جن کی عطر بیزی ہمارے مشامِ جاں کو معطر کرتی ہے! اگر یہ واقعہ ہے تو کیا ہم منتھلی کو پیک صبا کہنے میں حق بجانب نہیں ہیں۔جو دور افتادگان گل کدۂ اُلفت کو جوانانِ چمن کا پیغامِ محبت پہنچاتی ہے۔لیکن انصاف شرط ہے۔کیا علی گڑھ منتھلی ہمارے جامع از ہر و قرطبۂ ہند کی عظیم الشان مطمحاتِ نظر پر بجائے آفتاب و ماہتاب ہو کر چمکنے کے اس پر ایک تاریک پردۂ حجاب

---

[1] اقبال: ترجمہ۔ ٹوٹے پھوٹے در و دیوار سے عجمی آثار قدیمہ کی علامتیں ہویدا ہیں۔

نہیں ڈالتا؟ کیا اس کے رُو کھے پھیکے، پامال مضامین پریشان ترتیب، وقت بے وقت کی اشاعت ہماری بدمذاقی کی ایک زندہ مثال نہیں ہے؟

مجھے جتنا تعجب ہے اُس سے زیادہ صدمہ ہے، کہ مادرِ کالج اپنے آغوشِ ناز میں کتنے قابل افراد کو لیے ہوئے ہے جن کا علمی تجر ایک مسلّم حقیقت ہے۔ لیکن اُن کا استغنا اور بسا اوقات اُن کا ایثار کالج کے لٹریچر کے ساتھ ایسا سفیہانہ سلوک کر رہا ہو! کتنے ہیں جن کی طلعت ریزیاں منتقلی کے چار چاند لگا سکتی ہیں، اور کتنے گم گشتگاں بادیہ شعر و شاعری کے لیے شمع ہدایت بن سکتے ہیں، لیکن وہ ایسا نہ کریں گے۔ کیوں کہ مذکورۂ بالا اوصاف ایسے بزرگوں کے جز ولاینفک ہیں۔ پھر ہمارے کالج کا حدیقۃ الشعرا[1] ہے۔ جن کے فصلی شاعروں کے (خدا نظر بد سے بچائے) رشحاتِ قلم ہمارے لیے موسمِ بہار کے میوے ہیں۔

''اولڈ بوائے''[2] (The Old Boy) کا جو حشر ہوا، وہ آں قدح شکست و آں ساقی نماند'' کا مصداق ہے۔ اب لے دے کر ہمارے پاس ہمارا منتقلی ہے جو ہمارے کالج و شیدائیانِ کالج کو باہم دگر منسلک کیے ہوئے ہے۔ لیکن وہ ہماری اُمیدوں کے برلانے کا وہیں تک ذمہ دار ہے جس حد تک ہماری مخلصانہ کوششیں اُس کے لیے ہوں گی۔

علی گڑھ منتقلی[3] کو سیاسی اُلجھنوں سے کچھ سروکار نہیں۔ مذہبی مناقشات سے اُسے احتراز ہے، ذاتیات کے جھگڑوں میں پڑنا وہ گناہ سمجھتا ہے۔ اس کے اوراق اخلاقی، تمدنی، معاشرتی، تواریخی مضامین کے لیے وقف ہیں۔ ''فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اُوست'' میری موجودہ کوشش انھیں منازل میں پہلا قدم ثابت کرنے کے لیے ہدیۂ ناظرین ہے۔ منتقلی کے مقاصد کی تکمیل کے لیے میں کالج کے فاضل کرم فرماؤں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہوں جن کی چشمِ کرم کا وہ محتاج ہے، اور جن کی علمی جولانیاں اُسے بامِ رفعت تک پہنچا سکتی ہیں۔

---

1. حدیقۃ الشعرا: ایم۔اے۔او۔کالج کے شعبۂ اردو کی علمی و ادبی انجمن۔
2. اولڈ بوائے: ایسوسی ایشن کا ترجمان اخبار۔
3. علی گڑھ منتقلی: علی گڑھ میگزین کا سابق نام۔ رشید صاحب کی ایما پر علی گڑھ منتقلی کا نام علی گڑھ میگزین رکھا گیا۔ رشید صاحب 1920 سے 1922 تک اس کے ایڈیٹر رہے۔ مرتب!

واقعی وہ قوم نہایت بدنصیب ہے جو اپنے بزرگانِ سلف کے کارناموں کو بھلا دے جب قوم میں اس قدر بے حسی سرایت کر جاتی ہے اُسی وقت اس کا وجود صفحۂ ہستی سے اُٹھ کر صفحاتِ تواریخ پر آجاتا ہے اور پھر اس کی یاد یا تو چند متلاشیانِ تواریخ قدیمہ کے سینوں میں مدفون ہوتی ہے یا اُن کی غفلتوں اور کس مپرسیوں پر سیر و تواریخ کے کیڑے نوحہ خوانی کرتے ہیں۔

زمانہ غافل اور بے حس قوموں کو اپنے اوپر ایک ناقابلِ برداشت بار سمجھتا ہے اور انھیں قعرِ نیستی کے طرف دھکیل کر زندہ اور اُولوالعزم قوموں کے لیے جگہ بناتا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ زمانہ ہمیشہ ترقی پذیر ہے۔ اس لیے ایسی قومیں اس میں کب کامیاب اور مبارک زندگی بسر کر سکتی ہیں جو اپنی پستی اور انحطاط کی وجہ سے اس کی شاہ راہ ترقی میں سنگ راہ ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قومیں ہمیشہ بنتی بگڑتی رہتی ہیں اور یہ سلسلہ ابدالآباد تک جاری اور ساری رہے گا، لیکن موجودہ نسل کا فرض ہے کہ وہ نشانِ رفتگاں کو اپنا جادۂ ہستی سمجھے اور اُن کی علو ہمتی اور کامیابیوں کو اپنا قومی شعار بنائے۔ دنیا میں ایسی کوئی قوم نہیں ہے جس نے اپنے پیش روؤں کے نقش قدم کو اپنا رہنما نہ بنایا ہو۔ کیا یہ محل تشکیک ہو سکتا ہے کہ نوعِ انسانی کے مقاصد زندگی ایک شاہ راہ ترقی ایک اور منزل مقصود بھی ایک ہی ہوں؟ بنی انسان ایک کاروانِ زائرین ہے جو دیارِ محبوب کی زیارت کے لیے سرگرم مسافت ہے، سفر کی صعوبتیں اور دشت نوردی مختلف مراحلِ زندگی ہیں۔ دورانِ سفر میں ایسے مقامات ملتے ہیں جن کی غیر متیقّن حالتیں کارواں کو پس و پیش میں ڈال دیتی ہیں۔ اس وقت وہ گرد و پیش کی چیزوں پر نظر ڈالتا ہے، اور اُن سے نتائج اخذ کرنے کے بعد پھر سرگرم مسافت ہوتا ہے۔ یہ کیفیت انسان کی مختلف تاریخی و مادّی ذرائع کی تلاش کرتی ہے۔

تمدنِ انسانی میں مختلف مراحل ہمیں ایسے ملتے ہیں جہاں ہم اپنے ذاتی وسائل کے نقائص خواہ مخواہ محسوس کرتے ہیں اور اس وقت تاریخ اور واقعات کی چھان بین ہمارے لیے ناگزیر ہو جاتی ہے۔

اس تمہید سے میرا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ زندگی میں ہمیں تاریخ اور واقعات سے مدد لینا ضروری ہی نہیں ہے بلکہ ہم ایسا کرنے پر مجبور بھی ہیں۔

آج ہم یونان کے اُن مشاہیر سے ناظرینِ کرام کا تعارف کرانا چاہتے ہیں جنھوں نے قرونِ اولیٰ میں یونان کے لیے اشرف البلاد کا خطاب حاصل کیا تھا۔

اس سلسلۂ مضامین میں، میں نے تین فائدے خصوصیت کے ساتھ مدّ نظر رکھے ہیں:

(1) مشاہیر سلف کی یاد تازہ ہوتی رہے، اور اُن کے کارنامے ہماری زندگی کے دستورالعمل بنیں۔

(2) نصاب یونیورسٹی میں یونان اور روما(Greek and Rome) کی تواریخ بھی رکھی گئی ہیں۔ اس لیے اُن متعلّمان کے ذخیرۂ معلومات کے وسیع کرنے کے لیے یہ ایک دلچسپ سلسلہ ہوگا۔ جنھوں نے اس کورس کو لیا ہے، اور اگر وہ ان مضامین کو بخیال تفنن طبع بھی مطالعہ کریں گے تو خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

(3) اس سلسلہ کے چھڑ جانے سے ممکن ہے کہ ہمارے دیگر فاضل دوست بھی قدما کے کارناموں کو ہدیۂ ناظرین کریں، اور اُن کے مفید اور نایاب خیالات سے ایک طرف تو منتقلی کے اوراق مزین ہوں اور دوسری جانب ناظرین بھی مستفید ہوسکیں۔

میں یہاں ایک امر کا اور اظہار کردینا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں نے حتی الوسع کوشش کی ہے کہ مضامین میں طوالت نہ ہو، اور ضروری ضروری واقعات قریب قریب سب ادا ہوجائیں۔ اس وجہ سے میرے منشا کے خلاف مضمون پھیکا اور غیر دلچسپ ضرور ہوگیا ہے، لیکن اگر میری کم استعدادی اور علمی بے بضاعتی اور اس سنگلاخ زمین کا ناظرین خیال کریں گے جس پر میں نے مسافت قطع کرنے کے لیے کوشش کی ہے تو غالبًا مجھے نہایت خوشی اور فیاضی سے معاف کردیں گے۔

مناسب تو یہ تھا کہ ان مشاہیر کے زرّیں مقولات پر تبصرہ کیا جاتا، اور یہ ثابت کیا جاتا کہ ایک مکمل انسان کے جذبات صادقہ سے انھیں کتنا زبردست تعلق ہے، لیکن محض بخوف طوالت میں نے اسے نظر انداز کیا ہے۔ اگر الطاف باری شامل حال ہے اور ناظرین کے رجحان طبع نے میری ہمت افزائی کی تو میں اپنے بساط کے موافق اس سے بھی دریغ نہ کروں گا۔ والسلام!

یونان کے سات مشہور عقلمند جن کا نام اَبداُلآباد تک صفحاتِ تاریخ پر اُبھرے ہوئے حروف میں نمایاں رہے گا حسب ذیل تھے:

دیارِ لیسیڈیمن کا چیلن [1]، ایتھنس کا مشہور مقنن سولن [2]، پرین کا باشندہ بائس [3]، میلیٹس کا شہرۂ آفاق فلاسفر تھیلس [4]، کورنتھ کا جابر حکمران پیریانڈر [5]، میٹیلین کا پیٹیکس [6]، لینڈس کا مشہور کلیوبولس [7]۔

یہ شرف امتیاز جو انھیں عوام الناس کی جانب سے عطا ہوا تھا، ایک عجیب شانِ نزول رکھتا ہے۔ جس کا تذکرہ یہاں خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

میلیٹس واقع ایشائے کوچک کے ماہی گیروں نے اپنے جال سمندر میں ڈالے، اور قبل باہر نکالنے کے انھوں نے مچھلیوں کو ایک شخص کے ہاتھ فروخت کر ڈالا، لیکن جب جال کھینچا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں ایک طلائی تپائی بھی موجود ہے۔ خریدار اور ماہی گیروں میں تپائی کے لیے تکرار شروع ہوئی۔ ماہی گیر کہتے تھے کہ ہم نے مچھلیوں کے تھوک فروخت کیے تھے نہ کہ تپائی۔ دوسری جانب خریدار کو اصرار تھا کہ میں نے ان تمام چیزوں کے لیے معاملہ کیا تھا جو جال میں آجاویں۔ اس لیے زرّیں تپائی بھی میرے حصے میں آنی چاہیے۔ جب معاملہ یوں سلجھتا ہوا نظر نہ آیا، تو دونوں نے اسے اہالیانِ میلیٹس کے سامنے تصفیہ کے لیے پیش کیا۔ لیکن اس تصفیہ کی پیچیدگی اور اہمیت نے انھیں بھی ایک اطمینان بخش فیصلہ پر آنے سے باز رکھا۔ آخرکار فریقین نے طے کیا کہ یہ تنازع کنشت ڈلفی (Ocade of Delphi) میں لایا جائے۔ یہاں سے یہ فیصلہ ہوا کہ طلائی تپائی یونان کے فرزانہ ترین شخص کو دے دی جائے۔

1. Chilon of Lacedaemon
2. Solon of Athens
3. Bias of Priene
4. Thales of Miletus
5. Periander of Cornith
6. Pittacus of Mitylene
7. Cleobulus of Lyndus

فیصلہ قطعی تھا اور لوگوں نے اُسے اپنے ہم وطن (Thales) تھیلس کو دینا چاہا، لیکن اس نے نہایت انکسار کے ساتھ لینے سے انکار کیا، اور کہا کہ یونان میں ابھی ایسے افراد موجود ہیں جو اس سے کہیں زیادہ قابل اور عقل مند ہیں۔ طرفین اُسے پھر بائس (Bias of Priene) کے پاس لائے، لیکن اُس نے بھی اسی بنا پر لینے سے انکار کیا۔ اسی طرح سے وہ یونان کے سات آدمیوں کے پاس لائی گئی اور سب نے اُسے عذر کے ساتھ واپس کیا۔

یہ ہی سات اشخاص یونان کے مشہور "سات عقل مند" کہلاتے ہیں۔

تپائی متنازعہ آخر کار کنشت ڈلفی کے نذر کی گئی۔ ممکن ہے کہ ارباب کنشت نے اس نتیجہ کو پہلے ہی سے سمجھ کر اس قسم کی رائے طرفین کو دی ہو۔

ان مشاہیر کا تذکرہ میں اس ترتیب کے ساتھ نہیں کرتا جیسا کہ مضمون ہذا میں درج ہے بلکہ اُن لوگوں کا تعارف ناظرین سے پہلے کرانا چاہتا ہوں۔ جن سے وہ کم و بیش خود روشناس ہیں۔ وَھوھذا۔

یونان کا مشہور مقنن سولن (Solan)

جزیرۂ سیلمس (Salemis) کو اس یگانۂ روزگار کے زاد بوم ہونے کا شرف حاصل ہے۔ شفیق باپ سوسائٹی اور خاندان دونوں میں نہایت زبردست وقار رکھتا تھا، لیکن عسرت اور کم مائیگی کا عنصر بھی غالب ہونے کی وجہ سے سولن کو اس کی طرف اوائل میں نہایت زبردست کوشش کرنی پڑی۔ زندگی کے ابتدائی مراحل سے اس نے حصول تجارت میں صَرف کیے، لیکن یہ شغل اُس کی آئندہ زندگی کے لیے نہایت مفید ثابت ہوا۔ کیوں کہ اس نے اپنے سرمایۂ ذہنی کا

نوٹ: (Oracle of Delphi) ڈلفی کا صدر تمام یونان میں مشہور تھا۔ اس لیے ارباب بست کشاد نہایت عاقل اور فرزانہ ہوتے تھے جنھیں تمام علوم ارضی و سماوی میں کامل دست گاہ ہوتی تھی، اور جو مستفسرین کے حسبِ حال اپالو (Apollo) دیوتا کی طرف سے پیشین گوئیاں کرتے تھے، اور کبھی کبھی نہایت کامیاب مشورے دیتے تھے۔ اوائل میں تو ان لوگوں نے اسی طریق سے تمام یونان میں معدلت، ایثار، نیک نفسی، شجاعت وغیرہ کی لہریں دوڑا دی تھیں، لیکن مرورِ ایام سے ان میں طمع و خود غرضی سرایت کر گئی اور انھوں نے اس سے نہایت ناجائز فائدے اُٹھائے، اور اس مندر کی شہرت خاک میں ملا دی۔ (رشید احمد صدیقی)

ایک معتد بہ حصہ اسی سیر و سیاحت میں حاصل کیا تھا۔ سولن ایک جید شاعر ہونے کے علاوہ علم الاخلاق کا زبردست ماہر تھا، لیکن اس کی شاعری ہی شہرت کا باعث ہوئی۔ جس کے سلسلہ میں ذیل کے واقعہ کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

اہالیانِ اتھینس سیلمس (Salemis) پر قبضہ کرنے کے لیے ایک مدت تک باشندگانِ مگرینشیا (Megarensia) سرگرم کارزار تھے، لیکن اس ناقابل تسخیر، طویل اور صلہ شکن مہم نے انھیں اس درجہ مایوس کر دیا کہ آخر کار انھوں نے ایک قانون پاس کیا کہ اگر کوئی شخص پھر سیلمس کی واپسی کے لیے تحریک کرتا ہوا پایا جائے تو فوراً قتل کر دیا جائے۔ قانون کی اس انتہائی سختی نے کتنوں کے لب پر مہرِ سکوت لگا دی۔

سولن کو فرزندانِ وطن کی اس پست ہمتی کا نہایت قلق ہوا۔

حصولِ مطلب کے لیے اس نے اپنے کو مجنوں بنالیا، اور ایک روز دیوانہ وار اتھیلس کے شارع جام پر کھڑا ہو کر اپنی تصنیف کردہ نظم اس جوش و اضطرار کے ساتھ پڑھی کہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں کے قلب و دماغ میں جذبۂ انتقام کی لہریں دوڑا دیں۔ وَاضعانِ قانون غیرت میں ڈوب گئے، نتیجہ قیاس سے زیادہ اُمید افزا نکلا۔

آخر کار قانون منسوخ ہوا، اور ایک دوسری مہم سیلمس کی واپسی کے لیے تیار کی گئی۔ جس کا کمانڈر بھی سولن مقرر کیا گیا۔ مہم کامیاب ہوئی اور سولن نے باشندگانِ سیلمس کو پھر اتھینس کا مطیع بنالیا۔

ایک دلیر سپاہی ہونے کے علاوہ سولن نہایت قابل اور واضع قوانین تھا۔ سیاسی[1] اصطلاحات کو قطع نظر کر کے میں اخلاقی و تمدنی ترقیوں پر نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

---

1 میں ناظرین کی توجہ اُن سیاسی و اقتصادی واصطلاحات کی طرف مبذول کرانا نہیں چاہتا، جو سولن کے اتھینس کے رائج الوقت آئین ڈروکو (Droco) کے خلاف مادرِ وطن کی سرفرازی کے لیے ترتیب دیتے تھے۔ ملک کی وہی حالت تھی جو ایک سفاکانہ قانون کی ہمہ گیر وسعت فرقۂ عوام الناس میں پیدا کر سکتی ہے، اور ان میں طبقۂ امرا ارباب حکومت کی طرف سے بدظنی اور بددلی پھیلاتی ہے۔ ایک طرف تو قانون کی یہ دارو گیر دوسری جانب اتھینس ایسی حریت پسند قوم۔ ان سب باتوں کا اندازہ کرتے ہوئے جب ہم (بقیہ اگلے صفحہ پر)

انصاف ومعدلت کے عمل درآمد کے لیے اس نے ایک ایسی عدالت قائم کی تھی جو محض تحفظِ جان و مال کے ذمہ دار نہ تھے بلکہ اہالیانِ ایتھنس کی اخلاقی ترقی و مرفہ حالی بھی اس کے متعلق تھی۔

اُس عدالت کا نام (The Court of Areopagus) تھا جس میں ہر ایک شہری کو اپنی سالانہ آمدنی وخرچ کا جائزہ دینا پڑتا تھا۔ اس کا انعقاد ہمیشہ شب کی تاریکی میں ہوتا جہاں کوئی روشنی موجود نہ ہوتی۔ وکلا کو ہدایت تھی کہ واقعات کے پیش کرنے میں فصیح و بلیغ تقریریں نہ کریں بلکہ بالکل سیدھے سادے الفاظ پر کفایت کیا کریں۔ اس عدالت کی اہمیت ملک وقوم میں نہایت زبردست تھی۔

لیکن جہاں سولن نے بحیثیت واضع قوانین کے ایک زندۂ جاوید نام پیدا کیا ہے، وہاں اُس نے دیگر واضعان کی طرح اُصولی غلطیاں اور فروگذاشتیں بھی کی ہیں۔ قانون کا دائرہ اس نے نہایت وسیع معنوں میں لیا ہے۔ حالاں کہ اخلاقی ومعاشرتی اصلاحوں کے لیے ذرائع و وسائل بھی جداگانہ ہونے چاہئیں۔ وہ ضابطہ جو انتقامی امورات کے لیے ترتیب دیے جاتے ہیں، جمہور کی اخلاقی اصلاح کرنے میں ناکامیاب ہی نہیں بلکہ اکثر سنگِ راہ ثابت ہوتے ہیں۔

مصلحانِ یورپ فرقۂ اناث کے بے جا وفضول اسراف پر سر دھنتے ہیں، لیکن آج سے ہزاروں سال پہلے سولن نے اس کی روک تھام کے لیے قوانین مرتب کر دیے تھے کہ وہ کسی موقع پر اپنی آرائشِ لباس کے لیے اسراف نہ کرنے پائیں۔ ہندوستان کو آج اس بات کا رونا ہے کہ تعلیمی حالت پست ہے بچے ونوخیز نوجوان جاہل رہ کر قوم اور ملک پر بار ہوتے ہیں، لیکن سولن نے اس کا دفعیہ نہایت معقول طریقہ پر کیا تھا۔ بھیک مانگنا اس نے جرم قرار دیا تھا اور اس بات کا قانون پاس

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) سولن کے وضع کیے ہوئے قوانین کی غیر معمولی کامیابی پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں اُس کی ذہانت، وسعتِ قلبی اور سریع النظری کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔

منتقلی کے اوراق سیاسی جولانیوں کے لیے وقف نہیں کیے جاسکتے، لیکن ناظرین کے اندازے میں صرف اتنا ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ آج کل کے مہذب ترین اقوام کے ضوابط کی داغ بیل سولن ہی نے ڈالی تھی۔

کر دیا کہ اگر والدین اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں غفلت کریں اور اُن کی کامل نگہ داشت نہ کریں تو وہ ایامِ کہولت میں اپنی اولاد سے کسی قسم کی امداد کے مستحق یا متمنی نہیں ہو سکتے۔

آج اہلِ ہنود مروجہ طریق شادی کے خلاف چیخ و پکار کر رہے ہیں۔ کنیادان[1] کے بار سے لڑکی کے خاندان والے پسے جاتے ہیں، لیکن اس کا انسداد سولن نے نہایت معقول طریق سے کیا تھا کہ کسی حالت میں لڑکی کو کسی قسم کا جہیز نہ دیا جائے، اور نہ شادی کے لیے کسی قسم کا معاوضہ ٹھہرایا جائے۔

ان تمام معاشرتی اصلاحات کے بعد سولن نے سفر کا ارادہ کیا، اور ایتھنس والوں سے اس بات کی قسم لی کہ دس برس جب تک کہ وہ واپس نہ آ جائے، وہ اس کے ترتیب دیے ہوئے ضابطوں و اصولوں کی تمام و کمال متابعت کریں گے۔ ایتھنس سے وہ عازمِ مصر ہوا۔ وہاں کے علما اور دانش مندوں سے مل کر سائپرس گیا جہاں کے بادشاہ (Philo Cypras) کو اس نے ایک شہر کی تعمیر میں امداد دی جس کے صلے میں بادشاہ نے اُسے (Sole) کا خطاب دیا۔

سائپرس سے سولن نے لیڈیا کے مشہور شہر سارڈس کا رُخ کیا۔ وہاں کے بادشاہ (Croesus) کروسس سے جا ملنے گیا۔ جس کی دولت و حشمت اُن دنوں ضرب المثل تھی۔ بادشاہ نے نہایت طمطراق کے ساتھ سولن کو اپنی جاہ و حشمت دکھلائی، اور پھر سوال کیا کہ آیا اُس نے بادشاہ سے زیادہ نادر و خوب صورت شے دنیا میں کہیں دیکھی ہے۔ ایتھنس کے کامل نے کہا "ہاں۔ مرغ، طاؤس اور خوش نما طیور" کیوں کہ ان کا حسن ذاتی ہوتا ہے، اور تمھارا مصنوعی اور عارضی۔ پھر بادشاہ نے سوال کیا کہ آیا اُس سے زیادہ خوش و خرم شخص رُوئے زمین پر کسی اور کو دیکھا ہے۔ سولن نے اس کا جواب پھر اثبات میں دیا، اور کہا کہ مراحلِ زندگی میں کچھ ایسی ناہمواری ہے کہ موت سے قبل کسی شخص کو خوش اور آسودہ نہیں کہنا چاہیے۔ بادشاہ کی طبیعت ان باتوں سے نہایت منغض ہوئی، لیکن سولن کے الفاظ بالکل صحیح اُترے۔

---

1 اہلِ ہنود میں رواج ہے کہ تاوقتیکہ لڑکی کے خاندان والے ایک رقمِ معینہ لڑکے والے کو نہ دیں، شادی نہیں ہو سکتی۔ یہ کوئی مذہبی اُصول غالباً نہ ہوگا، لیکن رواج نے اس کی سخت گیری کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ لڑکی کا خاندان اگر متوسط الحال بھی ہوا تو بھی اس رقمِ کثیر کی ادائیگی میں "قلاّش" ہو جاتا ہے۔

سائرس (Cyrus) نے کروسس (Cruesus) کو تخت سے اُتار دیا، اور جب اُسے آگ میں جلادینے کے لیے لکڑیوں کے انبار پر بٹھایا گیا تو کروسس یک بیک چیخ اُٹھا۔ سولن! سولن!! سائرس نے متحیر ہو کر اس کا مطلب دریافت کیا تو بدنصیب کروسس نے جواب دیا کہ سولن نے مجھ سے کہا تھا کہ جب تک انسان کا انجام نہ دیکھ لو اُسے خوش مت کہو۔ آہا یہ میری حالت پر کیسا صادق آتا ہے۔ سائرس نے شاید اپنے انجام پر بھی غور کیا، اور اس واقعہ سے نہایت متاثر ہوا اور اس نے کروسس کی جان بخشی ہی نہیں کی بلکہ خصوصیت کے ساتھ مہربان ہو گیا۔

سولن اپنے دورانِ سفر میں تھیلس (Thales of Melitus) سے بھی ملاقی ہوا۔ اس ملاقات میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ جس سے ان دونوں کے احساسات باطنی کا پتہ چلتا ہے۔ سولن نے تھیلس سے شادی نہ کرنے کی وجہ دریافت کی۔ تھیلس نے بہ نظر دفع الوقتی دوسری باتوں کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے ایک شخص کو سولن کے سامنے پیش کیا کہ یہ ابھی ابھی اتھینس سے آرہا ہے۔

سولن نے نہایت اشتیاق کے ساتھ دریافت کیا کہ آیا کوئی نئی خبر اتھینس کے متعلق تھی۔ جعلی سیاح نے نہایت استغنا اور بے پرواہی سے جواب دیا کہ کوئی نئی بات تو نہ تھی، صرف ایک واضع قانون سولن کا لڑکا وفات پا گیا تھا، اور اس کی تجہیز و تکفین اہالیانِ اتھینس نے نہایت شان دار طریق سے ادا کی تھی۔ یہ وحشت ناک خبر سن کر سولن جو نہایت رقیق القلب تھا آہ و زاریاں کرنے لگا اور نالہ و شیون سے تمام مکان سر پر اُٹھا لیا۔ تھیلس نے اصل واقعات اس پر فوراً ظاہر کر دیے اور کہا کہ انھیں جھگڑوں سے بچنے کے لیے میں نے یہ طریق اختیار کیا ہے۔

سولن آخر عمر میں اپنی قوم کا شاکی رہا۔ اس کے اسباب چند سیاسی و خاندانی جھگڑے ہیں جس کا اعادہ کرنا میں یہاں غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ اس نے آخر عمر میں خود جلاوطنی اختیار کر لی، اور صحرا بہ صحرا پھرتے ہوئے 80 سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس کے چند زرّیں اقوال حسب ذیل ہیں:

(1) خدا کا احترام اور اپنے والدین کی عزّت کرو۔ بُرے لوگوں کی صحبت سے ہمیشہ احتراز کرنا چاہیے۔

(2) قسموں سے زیادہ امتیاز انسان کی ذاتی نیکی و خصائل حمیدہ کا کرنا چاہیے۔

(3) اپنے دوستوں کو سمجھانا یا ملامت کرنا ہو تو تنہائی میں کرو، کبھی عوام کے سامنے ان پر نکتہ چینی نہ کرو۔

(4) اپنی موجودہ آسائش اور مسرّت پر مطمئن مت ہو جاؤ، بلکہ ہمیشہ کے انجام پر نظر رکھو۔

(5) دوستوں کا انتخاب جلد نہ کرو، لیکن جب کر لو تو ان سے علاحدگی اختیار کرنے میں تامل کرو۔

(6) حکمرانی کرنے کے قابل اپنے کو اسی وقت سمجھو جب تم خود اطاعت کے خوگر رہ چکے ہو۔

(7) ایسی عزّت جو تم نے اپنے قوتِ بازو سے حاصل کی ہو، کہیں اُس عزّت سے بہتر ہے جو اتفاقیہ مل گئی ہو۔

(مطبوعہ: علی گڑھ منتھلی۔ نومبر 1915)

●●●

حیات بعد الممات

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ انھیں اجزا کا پریشاں ہونا[1]

کائناتِ عالم کے نظامِ تمدن میں خلاقِ عالم نے کچھ ایسی گونا گونی و دل فریبی پیدا کردی ہے کہ عقلِ انسانی باوجودیکہ عقلِ کل کی ایک ذاتی پرتو ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اس کی عقدہ کشائی سے بالکل عاجز و حیران ہے۔ بظاہر تو قدرت کی کرشمہ سازیاں انسانی قلوب کو اپنا گرویدہ بنا ہی لیا کرتی ہیں، لیکن نہایت جاں فرسا وہ پریشان کن خیالات ہیں جو دماغ میں ایک حواسِ مختل کی طرح ہمیشہ چکر لگایا کرتے ہیں اور جن کا ماخذ یہ ہے کہ "حیات بعد الممات" یعنی ہستی انسانی کے فنا کے بعد صورت تکوین و وجود کیا رہتی ہے۔ یہ نہایت ہی اہم و جامع مسئلہ ہے۔ یہی وہ خیالات ہیں جو زمانہ کے مختلف دور میں قوی رفتار مردوں نے ترقی و وسعت دے دے کر لوگوں کو سکھائے اور ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ لیکن ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک لاینحل مسئلہ ہے۔ بہر حال جہاں تک لوگوں نے اس کی تحقیقات کی ہے، اُس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا تعلق انسانی ہستی سے بالکل روحانی ہے، اور بقا ہستی کا تعلق ایک دوسرے عالم سے ہے جسے ہم عالمِ ارواح کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ عالم ارواح خود ایک مسئلہ متنازعہ ہے۔ کچھ لوگ

1 پنڈت برج نارائن چکبست

اس کے وجود کے قائل ہیں اور کچھ اس کی ہستی کے منکر علمائے ہنود آواگون (تناسخِ روح) کے پیرو ہیں اور اُن کا عقیدہ ہے کہ روح (ہستی) ہمیشہ نقلِ قالب کرتی ہے اور اُس کی اچھی یا خراب حالت اُس کے پچھلے افعال کی جزا یا سزا ہے۔ اس کا فنا نقلِ قالب کرتے کرتے بالکل پاک ہو کر ہستیِ حقیقی میں مل جانا ہے جس کو وہ نِروان یا آتما کا پرماتما میں وصل ہو جانا یا دوسرے الفاظ میں ''واصلِ بحق'' ہو جانا کہتے ہیں۔ اسلامی فلسفہ اس کے بارے میں کچھ اور کہتا ہے۔ فی نفسہٖ دونوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں، لیکن عقائد میں کچھ متمائز تفریق نظر آتی ہے۔ وہ سزا و جزا کے تو ضرور قائل ہیں لیکن ایک دوسرے طریق سے۔ وہ کیا؟ روحِ انسانی کا مرکزِ اصلی ذاتِ حقیقی ہے۔ پتلہ خاکی کے فنا ہو جانے کے بعد روح (جو غیر فانی ہے اور جس کے ہر دو فرقے قائل ہیں) کچھ مدتِ مقررہ کے لیے ایک دوسرے عالم میں رکھی جاتی ہے جسے عالمِ ارواح کہتے ہیں۔ کسی ایک خاص روز میں کائنات عالم فنا ہو جائے گی اور اُس روز ہر ہستی کی روح کو اپنے اپنے افعال کی سزا یا جزا ملے گی۔ سزا یہ ہوگی کہ دوزخ میں روحیں ڈالی جائیں گی اور جزا یہ ہوگی کہ بہشت میں۔ ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں عقائد میں کس درجہ کی روحانیت پائی جاتی ہے اور قریب قریب جتنے فرقے ہیں وہ سب اپنے اصول کو روحانیت کی عمیق تہہ میں رکھتے ہیں۔ نئی روشنی کے سائنٹفک لوگ اس مسئلہ ہی سے کچھ بیزار ہیں کہ وہ اس پر خامہ فرسائی نہیں کرتے۔ بہر حال ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ واقعی قابلِ اطمینان حل زندگی کن کن اصولوں پر مبنی ہے۔ ہر چیز کے ثبوت کا انحصار اس کے عملی یا ذہنی تجربات پر ہے۔ ہر شخص جو کچھ بہ ذاتِ خود دریافت یا معلوم کرتا ہے وہ دوسروں پر ظاہر کرتا ہے اور اس کی تعلیم دیتا ہے۔ اُس کے خیالات کا صائب ہونا اس کے مذاقِ سلیم پر منحصر ہے۔ اب تک انسان نے جو کچھ ایجادیں کیں یا اصول قائم کیے اُسے بہ ذاتِ خود ایک دفعہ تجربہ کر لیا ہے یا مشاہدات کی رو سے ایک حقیقی اصول کر لیا ہے۔ اس امر کو جانے دیجیے کہ اس کے تجربات کو لوگوں نے صحیح مانا یا نہیں یا اُس کے خیالات کا ایک صحیح معیار قائم کر سکے یا اُس کو غلط ٹھہرایا، لیکن شخصِ مذکور نے خود تو اُس کو جان لیا ہے۔ اسی طرح مسئلہ فنا و بقا کو ہر شخص نے تسلیم تو ضرور کر لیا۔ تسلیم کرنے سے یہ مراد نہیں کہ جو کچھ اصول ٹھہرا دیے اُس کو مان لیا بلکہ یہ کہ ہر شخص ایک دفعہ پیدا ہوتا ہے اور پھر مر جاتا ہے اور اُس کو ہر ذی روح ایک نہ ایک دفعہ ہمیشہ جھیلتا ہے۔ لیکن کوئی شخص آج تک ایسا نہ پیدا ہوا

(فرضی و مذہبی قصص سے قطع نظر کر کے) جو یہ بتا سکے کہ وہ کس حالت سے مرا؟ مرنے کے بعد کیا کیا مراحل پیش آئے؟ کیا اُس کو اپنی پچھلی ہستی یاد تھی؟ کیا اُس کو معلوم تھا کہ مرنے کے بعد پھر اُس کی کیا حالت ہوگی؟ کیا نقلِ قالب کرتے وقت اُسے نقل کی کیفیت محسوس ہوئی تھی؟ اُس دوسرے عالم کی کیا کیفیت تھی وغیرہ وغیرہ۔ میرا تو خیال ہے کہ کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو اِن سوالات کا اطمینان بخش جواب دینے میں سچا اُتر سکے۔ کوئی شخص عالم ارواح سے انھیں حواس انھیں خیالات کے ساتھ واپس نہیں آسکا کہ اُس سے وہاں کی کچھ کیفیت معلوم ہوسکتی۔ اب اگر کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ سب باتیں کشف وضمیر سے معلوم ہوئیں تو یہ مسئلہ ذرا توضیح طلب ہے۔ یہ بات غالبًا ہر شخص مان لے گا کہ ہر فردِ انسانی میں ایک نہایت اہم زبردست قوت ہوتی ہے جسے ہم قوتِ ارادی کہتے ہیں۔ قوتِ ارادی ہی گویا اس مرکب عنصری کی روحِ رواں ہے۔ یہی قوت ہر فرد میں یکساں صورت میں پیدا کی گئی ہے اور اُس کے خواص و واقعیت ہر حالت ہر زمانہ ہر قوم میں بالکل ایک طرح کی ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص کہے کہ ''نہیں''، ''قوتِ ارادی بالکل یکساں نہیں پیدا کی گئی ہے'' تو اُس کا دعویٰ بالکل پوچ ہے۔ کیوں کہ پتلۂ خاکی کا صانعِ حقیقی ایک ہی ہے اور مادہ تکوین وجود حیاتِ انسانی ایک ہی مادہ کثیف یا لطیف سے مرکب ہے۔ حیات و ممات بالکل عناصرِ اربعہ کی ترتیب و پریشانی پر منحصر ہے۔ بہرحال انسان بہ صورت ساخت و وجود ہمیشہ یکساں ہے تفریقِ مشرب و مذہب تفریقِ ساخت و ہستی سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہاں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ہر انسان کی قوتِ ارادی ایک ہے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ کسی میں کم کسی میں زیادہ یہ انسان کے مختلف قوائے ذہنی کے سریع الحس یا بطی الحس یا مضبوط یا کمزور ہونے کی وجہ ہے۔ کشف وضمیر کیا ہیں؟ اپنے قوائے ذہنی وقوتِ ارادی میں ایک ایسی حرکت غیر متناہی پیدا کرنا کہ جب اُس میں ذرا سی ہلچل ڈال دیجیے ذاتِ خود میں وہ روشنی کا تلاطم پیدا ہو کہ انسان (مراد مستجِ انسان) اپنی موجودہ حالت کو بالکل بھول جائے اور عالمِ استغراق میں ہو کر اپنی ہستی کو چشمِ باطن میں سے ملاحظہ کرے۔ بہرحال یہ تو صوفیائے کرام کا کشف تھا۔ علمائے فلسفۂ جدیدہ یہ کہیں گے کہ کشف وہ ہے کہ انسان اپنی قوتِ ارادی کو اس درجہ تکمیل کو پہنچائے کہ وہ کسی دوسرے شخص کے قوائے ذہنی کو اپنی قوتِ ارادی کے ذریعہ سے متاثر کرسکے۔

اب اگر عالم ارواح کا پتہ کسی نے لگالیا ہوگا تو محض اپنی قوتِ ارادی ہی سے، لیکن جہاں تک ہم دیکھتے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنے مہاتماؤں، رشیوں، پیغمبروں اور درویشوں نے اس عالم کے راز کا پتہ لگایا سبھوں نے اُسے مختلف حالتوں میں پایا اور ہر ایک نے مختلف اصول قائم کیے۔ ہنود کے علما نے اس عالم کو دوسری حالت میں پایا۔ اسلامی فلسفہ اس کی بابت کچھ اور کہتا ہے۔ مہاتمابدھ کے اقوال اور ہیں۔ مسیحی پیشواؤں نے ایک دوسرا پہلو اختیار کرلیا۔ غرض مختلف مذاہب میں مختلف صورت میں عالمِ ارواح کی تعلیم دی گئی ہے۔ قطع نظر مذہبی اختلاف کے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آخر اس بیّن تفریق کی وجہ کیا ہے۔ سب سے بڑی وجہ اس باہمی اختلاف کی یہ ہے کہ پیشواؤں نے اصول تو سادے وآسان مقرر کیے، لیکن امتدادِ زمانہ سے اُس میں فروعات ایسی پیدا کردی گئیں کہ اب وہی سہل الاصول قواعد کچھ ایسے پیچیدہ ہوگئے کہ ایک نا قابلِ اطمینان صورت میں پائے جاتے ہیں۔ یہ آفت ہر مذہب میں پائی جاتی ہے۔ یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ہے۔ روحانیت کا مسئلہ ہی ایسا ہے۔ عوام تو سمجھ ہی نہیں سکتے، رہے تعلیم یافتہ لوگ اُن میں بھی ایک معقول تعداد صمٌ بکمٌ رہتے ہیں۔ بہرحال یہ بات نہیں ہے کہ اس عالمِ اجسام کے سوا اور کوئی عالم ہی نہیں ہے۔ لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ ابھی اس کی کافی چھان بین نہیں ہوسکی ہے اور لوگ اس کے آخری زینہ تک نہیں پہنچے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ متقدمین نے اس کی تلاش میں بڑی سرگرانی کی ہے اور روحانیت اور عالمِ ارواح پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہیں، لیکن افسوس ہے کہ اب تک قابلِ اطمینان صورت نہیں پیدا ہوسکی۔ اس کے فرقے بھی بالکل جدا ہوگئے، لیکن وہ بھی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچے۔ مختلف مذاہب ہوئے، لیکن وہ بھی آخر میں ناکامیاب رہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ سب باتیں لاطائل وفضول ہوئیں، لیکن ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ قابلِ اطمینان راستہ ابھی تک ان لوگوں کو نہیں ملا ہے۔ اگر لوگوں نے اس کا پتہ لگالیا تو پھر ان کی تعلیم میں یہ اختلاف کیوں ہے؟ ہر ایک پیشوا کو ایک ہی تعلیم دینی چاہیے تھی۔ کیوں کہ سب لوگوں نے ایک ہی قوتِ ارادی سے عالمِ ارواح کا پتہ لگایا تھا۔ روحانیت کا سوال اب تک حل نہیں ہوا اور ''حیات بعد الممات'' ایک ایسے گہرے راز سے تعلق رکھتا ہے کہ انسان کو فنا ہونے کے بعد ہی معلوم ہوسکتا ہے اور جب وہ فنا ہوگیا تو اُس کے معلومات بھی فنا ہیں اور یہ مسئلہ جوں کا توں ہی رہ گیا۔

مادہ تکوین و وجود ہستی میں اگر فلسفۂ جدید کا لحاظ رکھا جائے تو اثبات باری میں ایک نہایت اہم رُکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ جن اشیائے موجودہ میں مذاہب مختلفہ نے ایک نادیدہ دستِ تصرف کو صانع حقیقی گردانا ہے اُن کی ساخت و صنعت میں علمائے متاخرین نے ایک ترکیب و ساخت مادی کا اصول قائم کیا ہے۔ ان دو مخالف تعلیموں کا ہمارے مضمون سے ایک گہرا تعلق ہے۔ جن مقلدین نے اُصولِ روحانیت کو صورت ہستی کا ایک حقیقی معیار گردانا ہے اُن کی تعلیم کا دائرہ دنیا (مراد نظامِ عالم کی صورتِ موجودہ) ہی تک جا کر ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ صورت حال و صورت ماضی کا انحصار ایک نہایت جامع و اہم مستقبل پر رکھتے ہیں اور منزلِ ہستی کو عالمِ بقا کے زائرین نہیں بلکہ مہاجرین کی جادہ پیمائی کا ایک دورِ وسطی سمجھتے ہیں۔ مسئلۂ روحانیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ انسان کالبدِ خاکی کو چھوڑنے کے بعد ایک اور ہی عالم میں ہوتا ہے، لیکن صورتِ ہستی بقائے دوام کی منزل پر پہنچنے کے بعد ایسی نہیں رہتی کہ اُس پر اصولِ ہستی کو مدِ نظر رکھ کر ہم وجودِ حقیقی کا اطلاق کرسکیں۔ وجودِ حقیقی سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ شے (روح، آتما، ہستی وغیرہ) بہ صورت کسی خاص نوعِ معلومہ کے ہو بلکہ وہ ایسی صورت میں ہے جس پر محض ایک ہستی کا اقدام ہوسکتا ہے۔ قدمِ ہستی کے وجود کا معیار دنیا کے لوگ نہیں کرسکتے۔ اب یہاں سے یہ مسئلہ حل ہوجاتا ہے کہ انسان کشف و ضمیر سے اُس وجودِ حقیقی کا اندازہ کیسے کرسکتا ہے؟ عالم دوام و بقا کے وجودِ ہستی کا معیار اُس حواس سے کیوں کر معلوم ہوسکتا ہے جب کہ عالم ارواح کے وجود کا نظام صورتِ موجودہ سے بالکل جداگانہ ہے۔ دنیاوی روحیں اپنی اُس صورت کو کیوں کر معلوم کرسکتی ہیں جو اپنے قالب کو دنیا کے پورے نظام تمدن میں منہمک چھوڑ کر پرواز کرگئی ہیں۔ ہر شے کی صورت ماسبق صورتِ موجودہ سے ان حالتوں میں اختلاف کرنے لگتی یا ان وجوہ سے چیزیں بطورِ خود اختلاف کرنے لگتی ہیں (۱) شے مذکور کا نظامِ اسباب (۲) مختلف حواسِ خمسہ سے معیار قائم کرنا (۳) عالم مختلفہ کے مختلف نظامِ قدرت۔ ان اصولوں کو مدِ نظر رکھ کر ہم موجودہ مذہبی تعلیم کی کسوٹی پر کہاں تک سچے اُتر سکتے ہیں؟ صرف مسئلہ روحانیت کو لے لیجیے کیوں کہ ہمیں کسی اور شے سے یہاں مطلب نہیں ہے۔ عالم دنیا و عالم بقا کے ہستی دوام میں کتنی متمائز تفریقیں نظر آتی ہیں اس بات میں تو غالباً کسی فرد کو عذر نہ ہوگا کہ صرف روح ہی ایک ایسی شے ہے جو ان

دونوں عالم میں ایک بیّن تفریق ڈالے ہوئے ہے، لیکن روح بذات خود ایک مسئلۂ معرکۃ الآرا ہے۔ بہر حال خواہ جو کچھ ہو میرا مطلب اُس شے موجودہ سے ہے جو قالب انسان کو چھوڑ کر علاحدہ ہو جاتی ہے اور جس کے نکل جانے پر انسان کو مردہ کہا جاتا ہے۔ اب صورت حال و صورت مستقبل سے اس کا مقابلہ کیجیے۔ ہم اُنھیں اصولوں کو مدِ نظر رکھ کر اس کا معیار قائم کریں گے جنھیں ہم اوپر درج کر آئے ہیں۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے اس کا اندازہ ہر سہ اُصولوں سے ہوسکتا ہے۔

(۱) شے مذکور کا نظام اسباب ملاحظہ فرمایئے۔ انسان کے وجود کی بنا اُس کے قالب میں یا نظامِ جسم میں ایک حرکت غیر امتزاجی پیدا ہونا۔ مختلف عادات، حرکات، سکنات وغیرہ سے اُس کا تربیت پانا۔ اخلاقی و معاشرتی زندگی بسر کرنے سے روح پر نیک اثر ہونا اور برے خیالات و افعال قبیحہ سے اس کو متاثر کرنا۔ ان صورتوں سے انسان کے اعضائے رئیسہ متاثر ہو کر روح پر اپنا ایک گہرا تصرف اور اس کی شکل نوعیہ میں تفریق ڈالتے رہتے ہیں۔ ہر سہ دفعات بذاتِ خود ایک نہایت بسیط مضمون سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۲) مختلف حواسِ خمسہ کا معیار قائم کرنا۔ جن حواسات سے لوگ معیارِ ہستی قائم کرتے ہیں چوں کہ وہ بذاتِ خود اختلاف رکھتے ہیں۔ اس لیے ثبوت میں بھی اختلاف ہونا ضروریات سے ہے۔ جس شخص نے کسی چیز کی ماہیئت محض آواز سن کر دریافت کی ہے اس کے خیالات گو بذاتِ خود درست ہوں لیکن اس شخص کے خیالات سے مطابقت نہیں کر سکتے۔ جس نے اُس کو چھو کر دریافت کیا ہے۔ اثباتِ وجودِ ہستی کا جس شخص نے محض قیاسی اصول قائم کیا ہے جب کہ فلسفیوں اور منطقیوں نے دعویٰ کیا ہے، اُن کا دعویٰ از سرتاپا اختلاف کرے گا، اُن لوگوں سے جنھوں نے اس کا عملی اُصول قائم کیا ہے۔ جیسا کہ صوفیوں اور درویشوں کا اصول ہے۔

اب رہا تیسرا اصول ''عالم مختلفہ کے مختلف نظامِ قدرت''۔ ہر شے دو مختلف عالم میں ہونے سے اختلاف کرنے لگتی ہے۔ اگر کوئی شخص عالم محویت میں ہو تو اُسے وہ چیزیں جو اُس نے عالم بیداری میں دیکھی ہیں مختلف نظر آئیں گی۔ کیوں کہ ایک تو اُس کے دماغ کی کیفیت حال دگرگوں ہے اور دوسرے ہر دو نظامِ اسباب ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ اس کے خلاف کرنے کا

یہ باعث نہیں ہے کہ اُس شخص نے اُن چیزوں کو ہر حالت میں مختلف پایا بلکہ وجہ یہ ہے کہ ہر عالم میں نظامِ قدرت ہی جداگانہ ہوتا ہے۔

آدم بر سر مطلب۔ ان حواساتِ ظاہری سے عالم ارواح کا پتہ ہم کیسے لگا سکتے ہیں جب کہ اسباب دریافت ہر حالت میں اختلاف رکھتے ہیں۔ دنیا کے نظام اسباب اور ہی ہیں حواسات بالکل جداگانہ ہیں۔ عالم ارواح ان تمام باتوں سے بالکل مبرا و منزہ ہے۔ رہا کشف و ضمیر، کشف و ضمیر سے انسان کسی دوسرے عالم کا پتہ نہیں لگاتا بلکہ وہ ذات خود میں اس درجہ منہمک ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ذاتِ ہستی کو بالکل بھول جاتا ہے۔ اس لیے اگر اس نے کسی بات کا پتہ لگایا تو بس یہی لگایا کہ ذاتِ خود سے ذاتِ موجودہ کو کیا تعلق ہے؟ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ انسان اپنے جذبات میں بالکل جذب ہو جاتا ہے (لفظ انسان یہاں پر بحث طلب ہے انشاء اللہ آئندہ کسی نمبر میں ہم لفظ ''انسان'' کے مادّہ و معنی پر کافی روشنی ڈالیں گے) گویا وہ اُس وقت ایک دوسرے عالم میں ہوتا ہے، لیکن وہ عالم ارواح میں نہیں ہوتا۔

عالم ارواح کی ایک یہ بھی صفت ہے کہ وہ روح کے پرواز ہو جانے کے بعد روح کا مسکن ہو جاتے ہیں اور جب تک روح کو جسم سے تعلق ہے اُس کا وہاں تک گزر ہونا ناممکن ہے۔

(مطبوعہ: العصر لکھنؤ۔ شمارہ نمبر: 4، جلد نمبر: 1، 1916 تا 1917)

●●●

قفس قفس میں

خدا مادرِ تعلیمی کو عمرِ نوح عطا فرمائے کیوں کہ اس کے وسیع مرغ زار میں جہاں طرح طرح کے خوش نما و نظر فریب گل بوٹے دکھائی دیتے ہیں وہاں چٹ پٹے دسترخوان کا مسالہ مہیا کرنے کو اک کشت زارِ زعفران کا پر کیف وجود بھی تمام رہی سہی کی پورا کر دیتا ہے۔ ایک طرف ہمیں چند زاہدانِ خشک مغز ریشِ مبارک کے بال منتشر و پراگندہ، شانہ و دستِ مشاطہ سے بے نیاز مسجد کی طرف لپکتے ہوئے ملتے ہیں۔ دوسری سمت بادۂ مغرب کے متوالے، نگارِ فرنگ کی ایک ایک ادا کو غور سے دیکھنے اور یاد کر لینے کے بعد پکی بارک[1] کے پیچھے سے گزرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک گروہ لٹن لائبریری[2] کی چار دیواری میں محصور دنیا اور اُس کی مکروہات سے بے خبر۔ ہومر، ابنِ رُشد کی جانکاہیوں پر سر دُھنتا ہے۔ تھوڑے حضرات یونین کے شیدائی اپنے کمرے کو طوطے کا پنجرہ ثابت کرنے کی سعیِ بے حاصل میں مصروف۔ غرض ان میں سے ہر اک کچھ نہ کچھ مشن اور کوئی نہ کوئی نصب العین ضرور رکھتا ہے، لیکن ان کے علاوہ اس دارالاضدلو میں ایک جماعت ایسی بھی موجود نکلے گی جس کے دماغ میں حقیقتاً انجام کار اور تفکراتِ دنیاوی کا سودائے عام یکسر مفقود ہے۔ آیئے اسی چھوٹی سی دنیا کی سیر کریں اور بتلائیں کہ ذہین دماغ خواہ نپولین کی طرح میدانِ جنگ میں

---

1 سر سید ہال، طلبا کی اقامت گاہ کا نام ہے۔

2 مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا قدیم نام۔

برسرپیکار ہوں یا میزنی کی مانند حریت خیال اور آزادی کا علم بردار ہو یا غالب وشیکسپیئر کے قالب میں شاعرانہ نازک خیالی پیدا کرنے میں سرگرم ہو یا..... کسی طرح (نام نہیں بتلاؤں گا) لوفنگ میں ید طولیٰ رکھتا ہو۔ بہر حال جہاں کہیں اور جس کسی مشغلے میں ہوگا، کچھ نہ کچھ جدت ضرور پیدا کرے گا۔

کالج لوفرس کی تاریخ میں وہ دن بھی زرّیں حروف سے لکھا جائے گا جب کہ سادہ لوحوں کے سردار اور (احمق تو حش کی پوری گردان) یہاں رونق افروز ہوئے۔ 4/اگست 1900 کو بذریعہ خط اطلاع پہنچی کہ جناب ممدوح (جو بعد میں قفس کے قابل رشک نام سے ملقب ہوں گے) تشریف لانے والے ہیں۔ اسی روز حسنِ اتفاق سے میرے ہم دم دیرینہ اور کالج ڈائننگ ہال کے پُرانے نمک خوار بھی آنے والے تھے۔ چنانچہ ہم اسٹیشن پہنچے۔ ٹرین ذرا دیر سے آئی (تعجب کہ حادثہ تصادم کیوں نہ پیش آیا؟) ایک کے انتظار سے کوفت اور دوسرے کے انتظار میں ناقابلِ بیان مسرت ہو رہی تھی۔ بہر حال میں اسی کش مکش میں تھا کہ گاڑی سنسناتی ہوئی آ پہنچی اور ایک درجہ سے دو متضاد ہستیاں نمودار ہوئیں۔ ہمارے مولانا بھاگل پوری[1] کا بے حد باریک ٹرکش کوٹ (جو کرتہ سے بھی دو بالشت سے زیادہ اُونچا اور پیچھے اور آگے سے خندہ دنداں نما بنا ہوا تھا) زیب تن کیے سر پر ایک چھوٹی سی (خوش نما) لال ٹوپی، لیکن مع پھندنے کے (حالاں کہ یہ شیرازہ بھی منتشر ہو چکا تھا اور استدادِ زمانہ کی جیتی جاگتی تصویر تھا) ٹخنوں سے اُونچا مغلیٔ وضع کا پاجامہ (جسے شرعی کہتے ہیں) دبیز گبرون کا ڈھیلا ڈھالا کرتا (جس کی خوب صورت اور موٹی موٹی دھاریاں باریک کوٹ کی نقاب کو ہر لالٹین کے پاس آ کر اُلٹ دیتی ہیں) پیر میں منڈا (رنگ کی تمیز گرد و غبار اور جگہ جگہ سے چھل جانے کی وجہ سے نہ ہو سکی)۔ اس سج دھج سے ہمارا، ہیرو انٹر کلاس گیٹ کی طرف روانہ ہوا۔ ٹکٹ بابو بھی ایک ہی قیافہ شناس ہوتے ہیں کم بخت فوراً تاڑ گئے اور مولانا کے استقبال کے لیے تیار ہو گئے۔ اسباب روک لیا گیا۔ ''ٹمک'' پر رکھا ہی تھا کہ سفارش اور کہنے سننے سے محصول معاف ہو گیا۔ جان چھوٹی گاڑی میں بیٹھ کالج روانہ ہوئے۔ راستہ بھر استفسارات اور استفہامیہ جملوں نے ناطقہ بند کر دیا۔

---

1 جناب قفس۔

وکٹوریہ گیٹ میں داخل ہوئے۔ ہمارے مولانا ہمہ تن استعجاب وتحیر تھے۔

دیکھ کر ہردر و دیوار کو حیراں ہونا

وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا [1]

(اس شعر کی تشریح صرف اس وقت ہو سکتی تھی) خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ داخلہ کی تمام ضروری و غیرضروری منازل طے کرنے کے بعد مولانا نے بابو صاحب کے رجسٹر میں نام لکھوایا اور اپنے میزبان کے ساتھ کمرہ پسند کرنے کے لیے بورڈنگ واپس آئے۔ یہ کہاں تک لکھوں کہ قدم قدم پر ٹھوکر لگتی تھی باتوں سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ سیدھے سادھے مولانا قبل از وقت جنت میں پہنچ گئے ہیں (کیوں کہ کالج کو 'ایک نئی دنیا' ہونے کا اقبال تو اب بھی کرتے ہیں)۔

پکی بارک میں رہنے کا خیال مدتوں سے دماغ میں کروٹیں لے رہا تھا۔ یہاں کی ''لائف'' اور گوناگوں دلچسپیوں کا حال سن سن کر اور خوش ہوتے، لیکن غریب کو خزانہ مستقبل کی بشارت ابھی نہیں ہوئی تھی انھیں اس کا احساس کب ہوا تھا کہ اس سال کی بیالوجی کے مینڈک کا قرعۂ فال ہنوز معرضِ ظہور میں نہیں آیا تھا۔

معاملہ فہمی اور تقریر کرنے کا مغالطہ اپنے پرانے الما میٹر کے چھوٹے سے ہال اور اپنے مواضعات کے محدود الخیال اور انگریزی خواں زمیں دار سے مرعوب، کاشت کاروں کی معرفت کافی ہو چکا تھا۔ تلاشِ منصب، اور خدمتِ خلق کی اُمید موہوم، سونے پر سہاگہ، یارانِ طریقت اس قسم کے حضرات کے ہمیشہ متلاشی ہی رہتے ہیں۔ مولانا کی ذات میں انھیں سب کچھ مل گیا۔

تجویز ہوئی کہ سائڈ میں ایک دارالمباحثہ قائم کیا جائے۔ ابھی سرگوشیاں ہی ہو رہی تھیں کہ مولانا بھی آدھمکے۔ گویا جال بچھانے نہ پائے تھے کہ خود شکار پھنس گیا۔ آپ کی بھی صلاح لی گئی مولانا کی خواہشات، اُمیدیں اور پوشیدہ اطوار حسنہ زیادہ مشہور نہ ہونے پائے تھے کہ الیکشن کی ٹھہر گئی۔ ایک جنگ زرگری شروع ہوئی۔ دو پارٹیاں بنائی گئیں۔ ایک طرف اپنی جماعت میں سے ایک صاحب کو (دھوکے کی ٹٹی کی طرح) اسٹینڈ کرایا گیا۔ یونین کنویسنگ بھی شاید ہی اس سرگری سے کی جاتی ہو (کیوں کہ مولانا کو سبز باغ دکھائے جانے کے ساتھ ساتھ کچھ مشکلات اور

---

1 مومن خاں مومن

دقتوں کو بھی پیش کرتا تھا تا کہ اس منصب جلیلہ کی پوری قدر ہو) فریق مخالف کے ممبروں سے سلام و پیام ترک کیا گیا دو روز تک جہاں ایک پارٹی دوسری جماعت کو دیکھتی۔ ''ہس ہس'' اور ''شوشو'' سے خیر مقدم کرتی۔

حتیٰ کہ شب انتخاب آ پہنچی۔ دو پروفیسر صاحبان کو (جن میں سے ایک مولانا کے خیال میں پرنسپل کے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔ (کیوں کہ داخلہ کے دن وہ پرنسپل صاحب کے برابر بیٹھے ہوئے ایک کاپی پر نام لکھتے جاتے تھے) طلب کیا گیا، اور انھیں دو حضرات کی نگرانی میں Ballot Box تھا۔ ہر شخص پچھلے کمرے کے دروازہ سے داخل ہوتا اور دوسرے سے (گویا) ووٹ دے کر نکلتا۔ خود مولانا موصوف نے بڑے زور شور سے اپنے آپ کو ووٹ دیا، اور چند منٹ کے بعد نتیجہ برآمد ہوا یعنی یہ کہ ــــ مولانا موصوف صرف ایک ووٹ سے کامیاب ہوئے۔ تمام پروگرام پہلے ہی سے تیار تھا۔ غیب داں لوگوں کی طرح مستقبل کی ہر بات طے ہو جاتی۔ چنانچہ کامیابی و کامرانی کے نقیب نے خطبۂ صدارت بھی مرتب کرالیا تھا۔ ایڈریس نہایت طول طویل، مبسوط اور کئی دماغوں کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ مسلمانوں کے ہر شعبہ اور جدوجہد کے ہر صیغہ پر کافی روشنی ڈالی گئی تھی۔ یہاں تک کہ (League of Nations) میں ایک کرسی حاصل کرنے کی بھی استدعا پریذیڈنٹ ولسن سے کی گئی تھی۔ کیوں کہ بقول مولانائے محترم ''علی گڑھ کالج 7 کروڑ مسلمانوں کا ذہنی و دماغی مرکز ہے اور میں اُن کا نمائندہ، چنانچہ ضروری ہے کہ ایک ایسی جماعت میں جو آئندہ ''کردیم وشد'' کا اختیار رکھے گی مسلمانانِ ہند کا ایک قائم مقام رکھا جائے۔'' اسی خطبہ کے آخری حصہ میں آپ نے ہاؤس سے درخواست کی تھی کہ اس کلب کے نام میں میرا نام بھی ایزاد کر دیا جائے اور صدر اوّلین ہونے کے صلہ میں قوم کی طرف سے (کم از کم) ''قفس'' کا خطاب عطا کیا جائے۔

انتخاب کے بعد ہی رسم اور نگ نشینی ادا کی گئی۔ پُر جوش نعرہ ہائے مسرت اور مسلسل چیرز کے ساتھ میاں قفس کرسی پر رونق افروز ہوئے۔ سوا اتفاق کہ اُس دن پھول مہیا نہ ہو سکے بدرجہ مجبوری ایک عدد تسبیح اور ایک ریشمی کمر بند (جس کے دونوں سرے پھندنے کی طرح سامنے لٹک رہے تھے) اور املتاس کے پتوں کا ایک ہار پریذیڈنٹ کا گلو گیر ہوا۔ بعد ازاں بلند آواز سے پورا

خطبہ صدارت ارشاد فرمایا۔ حسب موقع چیرز اور شرم شرم کی آوازیں کانگریس کا سماں آنکھوں میں پھرائے دیتی تھیں۔ پھر یونین کے دستور کے موافق چند نظمیں پڑھی گئیں۔ جو ہمارے ایک دوست کی بدیہہ گوئی کا نتیجہ تھیں۔ یہ قصائد بھی مدح بالذّم اور ذمّ بالمدح وغیرہ وغیرہ تمام محسنات اور صنعتوں سے مالا مال تھے۔

چیئر مین صاحب کے آخری ریمارکس کے بعد کارروائی جلسہ ختم ہوئی۔ فریقِ مخالف جو بہ خیالِ قفس کے داغِ ناکامی کی وجہ سے آنکھیں چار نہ کرسکتا تھا آپ سے گلے ملا۔ تسلی وتشفی کے چند کلمات کے بعد سب لوگ اپنے اپنے کمرے آئے، اور یہ سمجھتے ہوئے کہ آج کی محنت وصول ہوگئی مصروف خواب ہوگئے۔

قفس ہیں کہ ہنسے دیتے ہیں۔ گلی کوچے میں اُن کی دھوم تھی ہر جگہ اُن کا تعارف اُن کے نئے نام سے کرایا جاتا ہے، اور وہ خاموش بیٹھے ہیں (تبسّم زیرلب چہرہ پر خوشی کی سُرخی اور زیادہ مضحکہ خیز ہوتی)۔

جناب قفس کا اسسٹنٹ ٹیوٹر کے کمرہ پر جانا اور تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد یہ کہہ کر چل دینا کہ "حاضری دینے حاضر ہوا تھا" قہقہوں کا ایک طوفان برپا کردینے کو کافی سے زیادہ تھا۔ خیر یہ تو ادنیٰ اور روزمرّہ کی باتیں ہیں۔ ان کا تذکرہ لکھ کر ناظرین کرام کا وقت عزیز کہاں تک ضائع کروں۔ آں جناب کی ستودہ شخصیت ان فروگذاشتوں سے کہیں بالاتر ہے۔

یہ جملہ معترضہ تھا اب ہم پھر اُسی کلب کی طرف چلتے ہیں۔ اس کا دوسرا جلسہ ضوابط و قوانین طے کرنے کے لیے منعقد کیا گیا۔

خلاصہ قواعد وضوابط.... کلب

نمبر 1۔ یونی فارم، قمیض یا کرتہ گلے کا بٹن دورانِ جلسہ میں کھلا رہے گا۔
پریزیڈنٹ ہمیشہ سیاہ کوٹ پہنے گا۔

نمبر 2۔ کوئی شخص مجاز نہ ہوگا کہ کسی بکس یا کرسی وغیرہ پر بیٹھے۔ ممبرانِ اسٹاف بھی اس قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں سمجھے جائیں گے (چنانچہ ایک پروفیسر صاحب کو ان کی تبحر علمی کے باوجود ایک ٹرنک پر سے اُترنا پڑا)۔

نمبر3۔ پوائنٹ آف آرڈر کرتے وقت ہر شخص اپنے ہاتھ سے سوالیہ جملہ کی نشانی بھی بنانے پر مجبور ہوگا ورنہ اُس کو دخل در معقولات کا اختیار نہ ہوگا (اس ضابطہ سے Public Nuisance کا خوف ہوا اور اس کو حذف کر دیا گیا۔)

نمبر4۔ مشاعرہ بھی ہوا کرے گا، لیکن سنجیدہ مضامین خارج از حدود خیال کیے جائیں گے۔

نمبر5۔ مختلف کمروں سے دعوت ہوا کرے گی، اور حسب منشا صدر کوئی مناسب مقام جلسہ کے لیے منظور کیا جائے گا۔ (جس طرح کہ کانگریس و لیگ کا دستور ہے)۔

نمبر6۔ موسیقی و نغمہ، لوازمات میں سے ہیں بشرطیکہ مغنی بلا معاوضہ دستیاب ہو سکے۔

ایک نو وارد طالب علم جن کی موسیقی کا بہت شہرہ تھا اپنی شیریں نوائی سے حضار کو محظوظ فرماتے اور پھر سب لوگ خوش خوش اپنے کمروں کو واپس آتے (بعض ممبران کا نغمہ یونانیو نابڑھتا گیا اور ان معتراضات کی وجہ سے یہ رسم بھی مسدود کی گئی)۔

داستان طویل ہوتی جاتی ہے۔ دوسرے خوف ہے کہ کہنے سننے سے میاں قفس (کانوں کے کچے ہمیشہ ہی سے ہیں) کہیں دامِ فریب میں گرفتار ہو کر اور تھوڑی سی قانون دانی کے مغالطہ سے راقم الحروف پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ نہ کر دیں، اس وجہ سے اجمالاً چند واقعات ہدیۂ ناظرین کرنے کے بعد خود بھی اتنا قانون پڑھنے کی کوشش کروں گا کہ اپنی مدافعت کر سکوں۔

یونین کی دُرفشانیاں آپ حضرات نے اوّل تو خود دیکھی ہوں گی۔ رہی سہی خدا بھلا کرے بے چارے "رپ"[1] کا اُن سے کسی کا عیب چھپا ہی نہیں رہتا، آپ کے روبرو داستان عجیب بیان کر دی تھی۔ مسٹر بوہیمین[2] کو اس طرف کچھ توجہ نہیں ہوئی ہے۔ ورنہ شاید قفس پنجرے کی کھڑکی کھول کر شام کے وقت اسٹریچی ہال کے کلس پر دکھلائی دیتی۔

---

1. ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب Rip کے نام سے انگریزی میں دلچسپ مضامین علی گڑھ میگزین میں لکھا کرتے تھے۔

2. رشید صاحب انگریزی میں بوہیمین کے قلمی نام سے علی گڑھ میگزین میں لکھتے تھے اور مندرجہ بالا نکا یہ مضمون "لوفر" کے نام سے تحریر کیا تھا۔ مرتبین: م۔ ندیم (علیگ) لطیف الزماں خاں

مشاعرہ کی شان یہ ہوتی تھی کہ ایک سرخ دھاری والی روئیں دار تولیہ زمین پر بچھائی جاتی۔ ایک کافوری شمع سامنے ہوتی (باوجود برقی روشنی کے) تولیہ پر جناب صدر جلوہ افروز ہوتے۔ چھوٹا سا ایک ٹرنک گاؤ تکیہ کی قائم مقامی کرتا۔ شعرا جناب صدر کے نزدیک دوررویہ قطار میں بٹھائے جاتے مصرع طرح ہمیشہ بہت ہی پھڑکتا ہوا ہوتا۔ واہ واہ سبحان اللہ کے علاوہ خود میاں ققنس خوش گو شعرا کی پیٹھ ٹھونکتے اور چائے پر بلاتے (اگرچہ آخر الذکر بات آج تک وقوع میں نہیں آئی)۔

ان تمام واقعات وحادثات کی وجہ سے ہمارے ققنس ایسے ہر دل عزیز ہوئے کہ پرنسپل سے لے کر ظہور وارڈ کا بچہ بچہ (احبابِ ظہور وارڈ معاف فرمائیں یہ ایک فعلِ اضطراری تھا) آپ کے نام نامی اور آپ کی خصوصیات سے واقف ہوگیا اور ہر جگہ اور ہر دستر خوان پر آپ کی آؤ بھگت ہونے لگی۔ (باقی)

ناظرین معاف فرمائیں ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

(مطبوعہ: علی گڑھ میگزین، جنوری۔فروری 1920)

●●●

می گزرد

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

صاحب باغ میں ایک مولانا بحیثیت پیش امام رہتے ہیں۔ مولانا کے ساتھ پیش امام ظاہر کردینا یوں ضروری ہے کہ کالج میں مولانا کی مختلف حیثیات ہیں۔ ہر ایک شخص جو داڑھی بے ضرورت یا باضرورت، معنی خیز یا بے معنی ایک مشت دو انگشت یا شُد شُد نشُد، رکھتا ہو مولانا ہونے پر مجبور ہے۔

ہر نو گرفتار ہے پرنسپل آفس کے نزدیک نوٹس بورڈ کے سامنے مبہوت کھڑا ہوا پروفیسر نما لڑکوں کو پروفیسر سمجھ کر سلام کرے مولانا ہے۔ ہر شخص جو کندھے پر تولیہ رکھے ہوئے بغیر موزہ اور اَچکن کے مسجد کی طرف جھپٹا ہوا چلا جاتا ہو، فھو المولانا۔

ان کے علاوہ اور بہت سے اقسام ہیں مثلاً ہر اجنبی یا کسی یتیم خانہ یا مسجد کا چندہ وصول کرنے والا یا اور دیگر قسم کے جنّتی لوگ جن سے کالج کی دنیا معمور ہے، لیکن ہمارے صاحب باغ کے مولانا اُن قرونِ اُولیٰ کے مولاناؤں [1] میں سے ہیں جن کی یاد سے کم سے کم میرے تو اب بھی

---

1. اس باب کے ظاہر کرنے کی تو ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ مولاناؤں کا مزاج ڈائننگ ہال کے کھانے کی طرح ہر زمانہ اور حالت میں یکساں رہا ہے۔ (رشید احمد صدیقی)

رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ خصوصاً جب سے یہ گھر سے واپس آئے ہیں اُن کا حلیہ بعینہ میرے اُن مولانا کا سا ہوگیا ہے جن سے عہدِ طفولیت میں، میں پڑھ چکا ہوں۔ اُن کا قاعدہ تھا کہ پنج شنبہ کی سہ پہر کو ہم لوگوں کو پڑھا کر اپنے مکان کو جو پاس ہی ایک گاؤں میں تھا چلے جاتے تھے۔

پنج شنبہ کا بقیہ روز اور جمعہ کا پورا دن کس مسرّت اور بے فکری سے گزرتا تھا اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو "مولوی صاحب" مولانا یا میاں جی سے پڑھ چکے ہیں۔ شنبہ کی صبح تو گویا صبح قیامت ہوا کرتی تھی۔ کتابیں سامنے ہوتی تھیں اور مولانا کا ہیولیٰ ذہن میں، تھوڑی دیر میں مولانا اپنی مختصر پوٹلی کمر سے باندھے ہوئے ایک ہاتھ میں ڈنڈا اور دوسرے میں ٹن کا زنگ خوردہ لوٹا اُسی پابندی سے پہنچ جاتے تھے جیسے کالج میں ملیریا اور کالرا۔ ہم سب نہایت سعادت مندی کے ساتھ جھک کر سلام کرتے۔ کسی نے دوڑ کر جریب (فضائے پیری) لے لی کسی نے لوٹے کو دونوں ہاتھوں سے لے کر نہایت قرینے کے ساتھ مولانا کی چارپائی کے سرہانے رکھ دیا۔ کوئی پنکھا لے کر کھڑا ہوگیا۔ یہاں ابھی اوسان خطا ہی تھے کہ نظر مولانا کے خط بنے ہوئے چہرہ پر جا پڑی۔ لبیں باریک ترشی ہوئی داڑھی، مختصر رسولی ڈھب کی، پیشانی کے ہر دو طرف ہلال خطوط، لب خشک، دانت چمکتے ہوئے اور لبیں مختصر ہونے کی وجہ سے آپے سے باہر دوسرے مولانا کا تیور دیکھ کر بقیہ حواس بھی جاتے رہے۔ مولانا کو جمعہ گزرنے پر غصہ، ہمیں اس کا رنج آخر مولانا نے ہمیں تک ہی لیا، بلا کر دونوں ہاتھوں سے کانوں پر جو دستِ شفقت پھیرا ہے تو پھر سناٹا تھا۔ خفیف کم وبیشی کے ساتھ ہر ہفتہ کا یہی پروگرام تھا۔

اُس وقت سے آج تک میں جب خط بنے ہوئے مولاناؤں کو دیکھتا ہوں تو کانوں پر ہاتھ دھر لیتا ہوں۔ یہی حالت میری ان صاحب باغ کے مولانا کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ ایک روز صبح کے وقت میں نیچے آیا تو مولانا سے ملاقات ہوئی۔ فرمانے لگے "صاحب نیچے تو سقابے وغیرہ کچھ نہیں ہیں، تکلیف ہوتی ہے۔ آخر اگر کسی کو نہانے وغیرہ.... تو کیا کرے؟"

میں نے عرض کیا مولانا ہم لوگوں کی موجودگی میں اس شکایتِ مشترک میں آپ کو تقدم حاصل ہو ہم سب کے لیے باعثِ شرم ہے۔ یہ سب باتیں تو خیر جملہ معترضہ میں سے تھیں ہمارے مولانا پچھلی شب کو جب اذان دے رہے تھے تو میں بستر پر تھا۔ تنہائی میں انسان خواہ مخواہ

فلاسفر بن جاتا ہے۔ میں غور کرنے لگا کہ قانون اور نادری مہمل اور تاریخ مہمل (الف نثر مرتب) دونوں کا کورس بالکل کورا ہے۔ علی گڑھ منتقلی الگ شام کا مردہ بنا ہوا ہے۔ یونین کے قاضی اور قضایا قضائے مبرم کی طرح منڈلا رہے ہیں۔ ٹینس کلب میں ''بدہا اور لائٹنگ'' کے مسئلہ پر صدائے احتجاج بلند ہونے والی ہے۔ گھر سے خط آیا۔۔ کہ تمہارے اخراجات کا حساب ہی نہیں سمجھ میں آتا۔ میں کہتا ہوں حساب ایسی چیز ہے، میں خود نہیں سمجھتا۔ مقتدی خاں صاحب[1] کی تاکید آتی ہے۔ ''انگریزی کے پروف ارسال ہیں شاباش۔ دیکھ لیجیے، علی الصباح پیک حاضر ہوگا۔ اردو کے دو صفحے خالی ہیں۔ مضامین دے دیجیے پچھلا بل پڑا ہوا ہے۔ اسے ادا کر دیجیے۔ یہ دو کتابیں ہیں ان پر ریویو کر دیجیے۔'' ذاکر صاحب فرماتے ہیں ''رشید صاحب کھانا بہت بُرا ہوتا ہے نہ پیٹ بھرتا ہے نہ لذت ملتی ہے۔ علاج کے لیے مجھے دہلی جانا چاہیے یا لکھنؤ؟ روپیہ کا کچھ بندوبست کر دیجیے۔'' (بندوبست کے معنی قرض لینا) اس کے بعد بغیر جواب کا انتظار کیے ہوئے آپ مثنوی اسرار خودی کو باواز بلند زبانی دُہرانا شروع کرتے ہیں۔ مجھے نیند آتی ہے (خدا اس فن کے موجد کو جزائے خیر دے)۔

صبح آٹھ بجے دروازہ پر کھٹکا ہوا۔ دیکھتا ہوں تو ملک الموت بشکل اعرابی کھڑے ہوئے ہیں۔ ''میاں! آدھ سیر کہ تین پاؤ''۔ (دودھ دے دوں) اس آدھ سیر تین پاؤ سے گزر کر پھر کھڑے ہو گئے اب کیا؟''

''میاں......میاں...... بابا...... بیمار......ایک روپیہ۔''

''کیوں بھائی ظفر اس ماہ میں تم پیشگی لے چکے ہو اور ابھی شاید دو میر دودھ بھی نہیں لیا ہوگا۔ پھر یہ ایک روپیہ کیسا؟''

''ہاں میاں ہیں...... پانچ روپیہ...... میاں کوئی نہیں دیتا...... میاں...... بابا بیمار۔''

''جی نہیں تشریف لے جایئے۔ میرے پاس روپے نہیں ہیں۔''

''نہیں میاں....'' اور پھر وہی میاں اور بابا۔ اب مجھے تاب نہ رہی۔ ڈانٹ کر، ''بھاگ جاؤ میرے پاس کچھ نہیں ہے۔''

---

1. مولانا محمد مقتدیٰ خاں شروانی منیجر مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ۔ شروانی صاحب کا 1968 میں 91 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ مرتب

''نہیں میاں....... پانچ روپیہ........ بابا........ میاں کہاں جاؤں سب لوگ میاں ڈانٹ چکے ہیں۔''

اب میں اپنے جذبات کو متلاطم پاتا ہوں ایک روپیہ اور دیتا ہوں اور کوشش کرتا جاتا ہوں کہ وہ میری اس کمزوری کو بھانپ نہ سکے۔

تھوڑی دیر میں دھوبی صاحب کپڑے لے کر تشریف لاتے ہیں۔ آپ آج ایک ماہ کے بعد نازل ہوئے ہیں ان کی عدم موجودگی میں مجھے کیا کچھ پیچ وتاب نہیں ہوا ہے۔ بڑے بڑے منصوبے باندھ رکھے تھے کہ ان کی معقول خبر لی جائے گی۔

''تمھاری شرارت کی سزا یہ ہے کہ ان کپڑوں کی دُھلائی کچھ نہ دی جائے اور میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ کچھ نہ دوں گا۔'' خاموش میں چلنے لگا۔ ''میاں میری لڑکی بیمار ہے، گھر میں کھانے کو نہیں ہے۔ کوئی آسرا نہیں ہے۔''

''نہیں اب تم بڑی شرارت کرنے لگے ہو میں تمھیں کچھ نہ دوں گا۔''

میں آگے بڑھا اُس نے گڑگڑانا شروع کیا، ''میاں اُسی بچے کی قسم بس آج آپ ہی کا آسرا تھا۔''

''اچھا یہ لو تمہارے آج کے کپڑوں کی دُھلائی ہے۔ اب کب کپڑے واپس کرنے کا وعدہ کرتے ہو۔''

''میاں میں جلد دے دوں گا۔ دونوں ماں بیٹیاں بھوکی ہیں اُنھیں یہ سمجھا کر آیا ہوں کہ بازار سے جنس لاؤں گا۔ آپ اگر آج ایک روپیہ دے دیں تو ہمارا سب دُکھ دور ہوجائے۔''

قوتِ متخیلہ نے ماں بیٹیوں کی حالتِ زار میرے سامنے کردی۔ میں نے خیال کیا کہ ممکن ہے، یہ شخص جھوٹا ہو، لیکن یہ اُن مجسم رحمت ہستیوں کو شفیع لایا ہے جن کے سایۂ عاطفت میں دنیا کی کوئی تکلیف نہیں محسوس ہوسکتی، اور پھر میں نے خیال کیا کہ ان نعمتوں کے زوال کے بعد دنیا کی بہترین دلچسپیاں بھی اُن کا نعم البدل نہیں پیدا کرسکتیں۔

وہ مجھ سے روپیہ لے جاتا ہے اور میں ایک دفعہ پھر کوشش کرتا ہوں کہ میری اس کمزوری سے میرے سوا اور کوئی نہ واقف ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد بھنگی صاحب وارد ہوتے ہیں۔ ان کا کریکٹر دنیا میں نرالا ہے۔ آج سات مہینہ سے میں دیکھ رہا ہوں، پندرھویں یا بیسویں روز کوئی نہ کوئی اُن کے خاندان کا مرجاتا ہے اور اس کی تجہیز و تکفین کا بارگراں ان پر نہیں تو میرے اوپر ضرور پڑتا ہے۔ آپ انھیں ہر وقت کمر بستہ پائیں گے۔ دنیا میں ہر آفت سے نجات ممکن ہے، لیکن ان کے سلام سے گلوخلاصی بالکل ناممکن۔ کہیں ہوں گے، کتنے ہی دور ہوں گے کوئی حالت یا وقت ہو، آپ سلام کیے بغیر نہیں رہیں گے۔ آپ بے خبران کی حدودِ عمل میں جاتے ہوں یہ ناممکن ہے کہ کہیں سے آپ کے کانوں میں آواز نہ آئے۔ آپ مُڑکر دیکھنے سے قبل ہی سمجھ جائیں گے کہ یہ کون حضرت ہیں۔ اگر آپ کہیں جاتے ہوں اور حدِ نظر تک بھی کوئی پرند مویشی یا آدمی آپ کے راستہ میں نظر آجائے، اور یہ خدائی فوج دار بھی قریب ہوں تو یہ بغیر اُس غریب کو ہٹائے یا آواز دیے کبھی نہ مانیں گے اور اس میں اس قدر انہماک، چستی اور سرگرمی ظاہر کریں گے کہ آپ بھی نظر بچا کر تھوڑی دیر کے لیے اپنی عظمت کو کسی نہ کسی طرح سے ضرور محسوس کرنے لگیں گے۔ خواہ اس سے قبل آپ کے ذہن میں اس کا کبھی خطرہ نہ گزرا ہو، چلنے میں آپ کی نظر متوازی اُلافق ہوجائے یا قدم نیچے تلے پڑنے لگیں یا آپ ہلکے سے کھانسنے کے بعد خدا کے جمیع موجودات کو ایک حکمانہ یا بزرگانہ نظر سے دیکھنے لگیں۔ صبح ہی صبح آپ قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ "میاں ایک روپیہ دے دیجیے شام تک دے دوں گا۔"

اس بے تکلفی سے یہ سوال کیا گیا کہ تھوڑی دیر تک میں غور کرتا رہا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے کہ اتنے میں آپ نے تجدیدِ سلام کی۔ اب مجھے یقین ہوگیا کہ میرا اس وقت ایک غیر معمولی شخصیت سے سامنا ہے۔

میں نے دریافت کیا کہ گھر والے تو آپ کے بفضلہٖ مع الخیر ہیں، میری اور آپ کی گفتگو کا موضوع ذرا ہمیشہ سے غم ناک ہوتا چلا آیا ہے۔ رہا آپ کی پابندی وضع کا سوال وہ آپ کی کمر بندی سے ظاہر ہے۔ خیریت تو ہے؟ بہرحال بادلِ ناخواستہ واپس گئے۔

اس بازدید میں 9.30 بج گئے۔ ناشتہ کیا گیا۔ ایک بڑے پیالہ میں دلیا لاکر رکھا گیا، جس ہیئت کذائی سے ناشتہ ہوتا ہے اور جس قدر ہوتا ہے وہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے جس پر ہم کبھی آگے چل کر بحث کریں گے۔ مختصر یہ کہ پہلے محض خشک ناشتہ ہوتا تھا۔ یعنی مٹھائی اور

نمک پارے۔ بعد میں تر ہونے لگا یعنی ولیا۔ اب کچھ دنوں سے خشک تر ہے۔ ناشتہ کے بعد کچھ دیر تک غپ شپ ہوتی رہی اُس کے بعد کالج آئے کالج میں کوئی کام نہیں ہے، لیکن اضطراری کیفیت کا کیا جواب جس نے ہمارے افعال اور ارادوں کو اپنا بنا رکھا ہے۔ یا بقول نورالرحمٰن صاحب بزرگوں سے یہی معمول ہے۔

ہم سیدھے نورالرحمٰن صاحب کے کمرے میں پہنچتے ہیں۔

صاحب موصوف ابھی شکن بستر ہی ہوتے ہیں، ناشتہ ہو چکا ہوتا ہے۔ چائے کے برتن ویسے ہی رکھے ہوتے ہیں۔ ایک سمت پان دان ہوتا ہے جس کا ایک نہ ایک جز آپ ہمیشہ غائب پائیں گے۔ گو سخت ناانصافی ہوگی اگر میں یہ نہ کہوں کہ اس کی تلافی دوسرے جز سے کہیں زیادہ ہو جاتی ہے۔ اگر پان نہ ہوا تو کتھا ایک گلاس میں جما ہوا آپ کو ملے گا، اور اگر کتھا غائب ہوا تو پوری ایک تھیلی کتری ہوئی چھالیوں کی موجودگی، کلیوں کے ڈھکنے غائب اور پان کا کپڑا اس طرح رکھا ہوا ملے گا کہ آپ کو پان کی موجودگی کا یقین ہو جانا بدیہی بات میں سے ہے۔

آپ شوق سے اسے اُٹھائیں گے، کھولنا شروع کریں گے۔ اوّل تو کپڑا اتنا بڑا ہوگا کہ اگر آپ کوشش کریں تو پان اور پان دان دونوں کا غلاف بنا سکیں۔ ایک تہ کھولنے کے بعد آپ کو مایوسی کا خطرہ ہونے لگے گا۔ کپڑے کا ایک ایک حصہ آپ کے دونوں ہاتھوں میں ہوگا۔ آپ زیادہ وزنی حصہ کو فوراً دبا کر موڑ دیں گے تا کہ ٹریجڈی کے آخری پلاٹ سے پہلے ہی نتیجہ پر عبور حاصل کر سکیں، لیکن ستم ظریفی ابھی ختم نہیں ہوتی اس فعل سے آپ کو اپنی مایوسی غیر متیقّن معلوم ہونے لگے گی، اور آپ ایک دفعہ اور عقدہ کشائی میں حسنِ عقیدت سے کام لیں گے لیکن۔

آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

آپ کپڑے کو رکھ دیں گے اور مجموعی حالت دیکھ کر یہ شعر محض موضوع بدل کر پڑھ دیں گے۔

نامہ جو میرا قاصد رستہ سے پھیر لایا
ہر حرف اُس میں گویا مردہ ہے اک کفن میں

کل منزل کا یہ کمرہ ارباب قضا وقدر نے خاص مصلحت سے بنایا تھا، اور شاید یہ دو عالم میں جتنی اسکیمیں اقوام عالم کے تہذیب اور تمدن کے متعلق بنائی گئی تھیں اسی کمرہ میں نافذ ہوئیں۔
ذاتی، سیاسی، معاشرتی، تاریخی، طبی، فلسفیانہ، منطقیانہ، یونین، ڈائننگ ہال، الیکشن غرض کہ کوئی مبحث ایسا نہیں ہے جس پر نہایت شد و مد کے ساتھ اس کمرہ میں بحث نہ کی جاتی ہو۔ جس کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ ہر ایک شخص اپنی پوری آواز سے مختلف مسائل پر، مختلف جذبات کے ساتھ مختلف طریق سے لیکن ایک ساتھ داد جحت دیتا ہے اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ ہم بھی یہ فرمائے۔

اک نالہ تو بھی پیش کش صبح گاہ کر

اس نقار خانہ میں جہاں طوطوں یا تُو تُو کی آواز سنی جاسکتی تھی آ دھمکے۔ ہم نے قدرتا ٹینس کا تذکرہ چھیڑا، لیکن پریسیڈنٹ نے قطعی فیصلہ نافذ کیا کہ ٹینس کی کوئی بات اس مقدس احاطہ میں نہ کی جائے۔ ہم خاموش ہو رہے، وہ تو خیریت یہ ہوئی کہ نفسیات کے چند ماہرین خصوصی موجود تھے۔ جنھوں نے میری توجہ سہارن پوری گنوں کی طرف مائل کر دی ورنہ معاملات ذرا طول کھینچتے۔ ان گنوں کی طبی خواص کا بھی آخر میں قائل ہو گیا مُسکّن قلب اور مفرح دل و دماغ ضرور ہیں اور ان کا اثر دیرپا بھی ہوتا ہے کیوں کہ مجھے باوجود کوشش کے پچھلے واقعات پر اظہار ناراضگی کا موقع نہیں ملا۔ وہاں سے اُٹھ کر پرنسپل آفس کے سامنے نوٹسوں کا آموختہ پڑھا اور 2 / بجے کے قریب صاحب باغ واپس آیا۔
ڈائننگ ہال کا کھانا موجود ہوتا ہے۔ انگیٹھی الگ تیار رہتی ہے سالن گرم کیا جاتا ہے۔ روٹیاں سینکی جاتی ہیں اور پھر داد شجاعت دی جاتی ہے۔ سالن کے متعلق صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ معدہ نے اپنے فرائض منصبی کا بیش تر حصہ ارباب پخت و پز کے سپرد کر رکھا ہے۔ جس کو موخرالذکر بہ حسن وخوبی ادا کرتے ہیں۔
ہڈیاں گوشت کی سرگرانی سے آزاد اور گوشت ترکاری سے واصل بحق رہا شوربہ وہ ان کی گلاوٹ میں شامل ہے۔ فطرت کی کارسازی ملاحظہ فرمایئے۔ قطب شمال کی برفستانی دامن یا دیگر سرد ممالک میں موسم زمستاں کی سرد مہری سے جب سمندر، رود بار اور دریائیں یخ بستہ ہو جاتے ہیں تو سقف بلوریں آبی جانوروں کو جو تہ آب ہوتے ہیں موسم کی سختیوں سے محفوظ رکھتی ہے۔

موسم گرم میں جب دوشیزہ زعفرانی کرنیں فضائے تابستانی میں رقص کرتی ہیں اور برف کسی عشوہ طراز کے دل کی طرح پگھلنے لگتی ہے تو محصورین باہر نکلتے ہیں بجنسہ یہ حالت سالن کی ہوتی ہے۔ سردی کے موسم میں یخ بستہ قوس قزح تمام مقویات پر محیط ہوتی ہے یا بالفاظ دیگر صحیفۂ ڈائننگ ہال کی تفسیر روغنی مخشی اور مذہب ہمارے سامنے ہوتی ہے، کھانا گرم کیا جاتا ہے۔ گھی اور اس کے ساتھ گوشت اور ترکاری کا جو شاندہ پگھلنا شروع ہوتا ہے اس وقت دو چار فلفل پرّاں اور ایک آدھ اور کیڑے مکوڑے باہر نکالے جاتے ہیں۔ ان شاہدانِ محل نشیں کے لیے رہ نوردانِ بیشہ گرسنگی پہلے ہی سے چپاتی بکف رہتے ہیں۔ کتنے بوالہوس یہاں جواب دے جاتے ہیں، لیکن۔

ایں دلم ہست کزیں گونہ ہزاراں دیدست

روٹیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ اوّل چپاتیاں دوسرے نان یا آبی۔ اوّل الذکر کے متعلق یہ طے کیا گیا ہے کہ ان سے آئندہ لیڈیوں کا اسکارف یا چہرہ کا نقاب بنایا جائے۔ بعض بعض نقابوں پر ہلکی اور چھوٹی چھوٹی چکن کی بوٹیاں پڑی ہوتی ہیں وہ ان میں قدرتاً موجود ہوتی ہیں۔ باریکی کا کوئی سوال ہی نہیں کیوں کہ اقلیدس نے سطح کا تخیل انھیں سے مستعار لیا تھا، اور پھر اس سے ایک بہت بڑے واقعہ بلکہ اُمّ اُلواقعہ کی یاد تازہ رہے گی۔ بی بی حوا نے بہشت میں گندم نوازی فرمائی تھی اس لیے ان کی صنف کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی یادگار بھی نہیں ہو سکتی۔ اتباع سنت کے لیے ''دستِ خود'' سے زیادہ ''دہانِ خود'' نزدیک ہوگا، اور پھر یہ بھی سنا گیا ہے کہ ڈائننگ ہال کی فیس بڑھائی جا رہی ہے اگر یہ ایجاد پٹینٹ (محفوظ) کرائی گئی تو کافی آمدنی ہو جائے گی۔

دوسری قسم آبی کی ہے اس کے لیے اربابِ ڈائننگ ہال کوشش کر رہے ہیں کہ تعداد میں چار ہی رہیں، لیکن صورت اور سیرت میں چپاتیوں سے بھی آگے بڑھ جائیں۔ ان کی ایک سطح بالکل سیاہ ہوتی ہے۔ دو ایک سوراخ ضرور ہوتے ہیں اور وقتاً فوقتاً دروازے اور کھڑکیاں بھی موجود ہوتی ہیں پھر یہ روٹیاں آگ پر پکائی جاتی ہیں کیوں کہ انھیں اصلی حالت میں کھانے سے یا تو حکیم صاحب دردِ شکم کی دوا دینے سے پہلے سرمہ مقوی بصر تجویز فرمائیں گے (اور ایسی حالت میں ان سے کچھ تعرض نہیں کیا جا سکتا) ورنہ پھر سلوف بلین کے لیے کہنا ہوگا۔

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

ظہر کے قریب کھانا ملتا ہے۔ بھوک یوں ہی متلون ہوتی ہے۔ اگر سالن کی طرف خیال ہے تو روٹیاں ختم اور اگر روٹیوں کو قابو میں رکھیے تو سالن غائب (ذاکر صاحب دوسری حالت سے پریشان رہتے ہیں (لیکن آپ کی پریشانی ان دونوں کی مجموعی اصلاح سے بھی شاید دور نہ ہو سکے گی) اسی بھوک اعداد متوالی کی طرح قائم بالذات خدا اللہ آباد........ عمر بھر نصیب نہ ہوتا، اور مالتھس کی روح پر (اپنے کلیہ کو ہندوستان میں کامیاب دیکھ کر) شادی مرگ طاری ہو جاتی۔

ہماری رائے ہے کہ کم سے کم مونگ کی دال کے لیے ڈائننگ ہال سے لائسنس جاری کیا جائے اور شاید اسی خیال سے فی وقت دو پیسے زائد لیے جاتے ہیں۔ کیوں کہ بھوک میں غصہ لازمی ہے اور اگر اسی حالت میں کسی پر مونگ کی دال سے حملہ کر دیجیے تو ایک اچھے خاصے چہرہ کو آپ چیچک رو بنا سکتے ہیں اور چوں کہ یہ عمر بھر کے لیے رونمائی ہوگی اس لیے اس کا شمار ضربِ شدید میں کیا جا سکتا ہے۔

معمولی دال دیکھیے تو ایک عجیب عالم نظر آئے گا۔ بس یہی جی چاہتا ہے سوئمنگ باتھ کے تہ نشیں مقویات میں کپڑے اُتار کر ایک غوطہ لگا لیجیے اور گل حکمت ہو جائیے۔ بہر حال اس قوتِ لا یموت سے تمتع ہو کر ہم نمائش کو چلے۔

شام کا وقت قریب تھا، دُکانیں آراستہ تھیں۔ اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ گھومتے گھومتے ہم لوگ جاپانی نیٹ میں آئے۔ یہاں پر مہذب قسم کی قمار بازی کی گرم بازاری تھی لوگ چھوٹی چھوٹی پھرکیوں میں گولیاں ڈال کر قسمت کی گردش کا تماشا دیکھتے یاد کھلاتے تھے مختلف خانوں میں مختلف اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ پھرکی کے جس خانہ میں گولی رُکتی تھی اس کی چیزیں مل جاتی تھیں۔ کھلانے والا کچی گولیاں تو کھیلا نہ تھا، آخر میں اُسی کی گوٹی لال ہوتی تھی۔ قسمت آزمائی کرنے والوں کی حالت اس وقت قابلِ دید ہوتی تھی جب روپیہ دے کر گولی پھرکی میں پھینک دیتے تھے۔ ایک صاحب جو اپنی قسمت کی کرشمہ سازیوں کے اب تک قائل نہ تھے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ پھرکی پھری، گولی ڈالی گئی اور چھ سکنڈ تک اُن کے بشرہ پر مختلف جذبات کس طرح منعکس ہو رہے تھے، اس کا اندازہ محض تخیل سے بمشکل ہو سکتا ہے۔ جن دو اُنگلیوں نے گولی پھینکی تھی ٹھیک پھرکی کے اُوپر قائم بالذات تھیں۔ منہ کھلا رہ گیا تھا اور آنکھیں تمام جسم کے ساتھ اس

طرح آگے کو جھکی ہوئی تھیں گویا اپنی تمام قوت باطنی سے گولی اور پھرکی کی گردش اپنے موافق کرلیں گے۔ قلب کی حرکت شاید پھرکی سے بھی زیادہ تیز تھی۔ گولی جس نمبر پر رُکی اُس میں صرف 2 کی چائے کی طشتری تھی یہی کیفیت اور لوگوں کی بھی تھی۔ حتیٰ کہ ایک شخص نے پے در پے ایک وقت میں ضائع کردیئے اور چیزیں بمشکل ملے یا کم ملی ہوں گی، ہاں اس میں بھی شک نہیں کہ بعضوں کی اقتصادی قماربازی صیغہ مالیات میں شمار اعداد کی حیثیت سے کامیاب بھی رہی۔ وہاں سے پلٹ کر ہم سینما آئے۔ ٹکٹ خریدے اور پنڈال میں جاکر اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ انجن نے شتر غمزے شروع کیے۔ برقی روشنی معدوم اور ''چراغ گل پگڑی غائب'' کی کیفیت پیدا ہونے والی تھی کہ ایک گیس کا لیمپ لایا گیا۔ اب ہم نے گرد وپیش کا نظری جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ایک طرف سُن میم صاحب مع اپنے ''بابالوگ'' کے رونق افروز ہیں۔ دوسری طرف کوئی نواب صاحب تشریف فرما ہیں جن کے مصاحبین، لواحقین اور دیگر ذرّیات گرد وپیش بیٹھے ہوئے ہیں۔ نواب صاحب مسکرائے تو انھوں نے قہقہے لگادیے۔ نواب صاحب خاموش ہیں اور خاموشی کا محل ہے تو انھیں جمائیاں آنے لگیں۔ نواب صاحب نے کوئی فقرہ کسا اور داد کے بھی طالب ہوئے تو انھوں نے واہ واہ کے شور سے سسکتے ہوئے انجن کو اور خوف زدہ بنادیا۔ ایک طرف لالہ للّن اور للّن کی ماں بیٹھی ہوئی تھیں کچھ دیر کے بعد روشنی ہوئی اور تصویریں پردہ پر نمایاں ہونے لگیں، لیکن روشنی کافی نہ تھی اس لیے تماشا میں کافی لطف نہیں آیا۔

9 بجے کے قریب ہم پنڈال سے باہر آئے۔ پاس ہی ایک اور تماشا ہو رہا تھا۔ ذاکر صاحب کے اصرار سے ہم لوگ وہاں بھی پہنچے، تو کیا دیکھتے ہیں بقول مولانا سہیل۔

کرشمۂ کہ متاعِ خرد بہ اُنگر زد

شاید کوئی ناٹک ہو رہا تھا، تماشا کرنے والے اور تماشا بیں اس طرح سے تیتر بٹیر ہو رہے تھے کہ اُن کے سمجھنے، پہچاننے اور علاحدہ کرنے میں ممکن ہے کہ کامیابی ہوجائے۔ لیکن حاضرین کی دُھواں دھار دم کشی سے دماغ میں کسی اور چیز کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

ہیرو، بادشاہ، مصاحب، سپاہی، منیجر کمپنی جو سمجھ لیجیے ایک لکڑی کے بکس پر جو کاغذ سے منڈھا تھا بیٹھے ہوئے تھے۔ پوشاک سیاہ تھی پاؤں میں بوسیدہ اُونی پٹیاں اور سیاہ فوجی جوتا جیسا

آپ نے اسٹیشنوں پر قلیوں کو پہنے ہوئے اکثر دیکھا ہوگا۔ پورے حلیہ کا اندازہ کچھ اُن قلیوں کی صورت سے ہوسکتا ہے جو کلکتہ یا رنگون سے خوب کما کر واپس آتے ہیں اور جب اپنے گاؤں کے قریب پہنچتے ہیں تو کسی گڑھے کے کنارہ پر بیٹھ کر اپنے پاؤں دھوتے ہیں اور گدڑی کا ایمونیشن بوٹ پہن کر اپنی کثیف دھوتی پر ایک سفید کرتا جس میں زنجیر دار گلٹ کے بٹن لگے ہوتے ہیں، زیب تن کرتے ہیں اور اس کے اوپر ایک سیاہ بوسیدہ واسکٹ ہوتی ہے جس کی جیب میں ریلوے ریگولیٹر گھڑی ہوتی ہے اور جس کی زنجیر میں رنگین شیشوں کے بڑے بڑے گول اور مخروطی دانے پڑے ہوتے ہیں۔ سب کے اوپر ایک پتلا رنگین گلوبند ڈال لیتے ہیں (خواہ مئی جون ہی کا مہینہ کیوں نہ ہو) اور بالکل نئی چھتری جس پر سنہری رنگ کے شیر کا خوب نمایاں ٹھپہ ہوتا ہے کاغذ کے خول میں سے نکال کر ہاتھ میں لیتے ہیں اور 'ماچس' سے بیڑی سلگا کر پیتے ہیں۔ کندھوں پر کپڑوں کا ایک وزنی خوشہ رکھے اور دوسرے ہاتھ میں ایک میلا وزنی ریل بیگ لیے لنگڑاتے ہوئے گاؤں میں داخل ہوتے ہیں۔

سامنے ہیروئن صاحبہ بھی گری محفل بنی ہوئی تھیں۔ انھیں ہیروئن بننے کا حق محض اس لیے تھا کہ ہیرو پہلے ہی سے موجود تھے۔ ورنہ پوشاک کے علاوہ ان میں اور کوئی خصوصیت ہیروئن بننے کی نہ تھی۔ چہرہ پر غازہ تھا یا کوئی ضماد، رنگ پکا ہندستانی قسم کا، داڑھی مونچھوں پر شاید دو تین روز سے دست درازی نہیں کی گئی تھی کیوں کہ کھونٹیاں لیپ سے کہیں کہیں تو گلوخلاصی حاصل کر چکی تھیں اور کہیں محض لیپ کو جلد سے بلند کر رہی تھیں۔ جس طرح سے برسات میں گھاس کے کلّے زمین کے اندر پھوٹنے لگتے ہیں تو تمام سطح زمین پولی ہوجاتی ہے کہیں گھاس کے زرد زرد کلّے کسی قدر اوپر نمایاں ہوجاتے ہیں اور کہیں محض سطح کے نیچے ہوتے ہیں، لیکن مٹی کی تہ اُبھر آتی ہے۔ بجنسہ یہ حالت یہاں نمایاں تھی۔ چہرہ پر چمکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی ڈاک چپکی ہوئی تھی، اور کبھی کبھی تانوں کے درمیان میں تماشابینوں سے چرس کی سلگتی ہوئی چلم لے لیتیں اور ایک آدھ کش لے کر پھر دُھواں دھار گانے میں مشغول ہوجاتیں۔ تماشابین چپہ چپہ پر بیٹھے ہوئے تھے، حتیٰ کہ ہیرو اور ہیروئن کے درمیان میں بھی تل رکھنے کی گنجائش نہ تھی اور موخرالذکر کے کودنے پھاندنے (رقص کرنے) کے لیے اتنی ہی جگہ بچائی جاسکی تھی جو ان کے پاؤں تلے تھے۔ بہر حال اس گرمی ہنگامہ سے ہم لوگوں نے اُلٹے پیر نجات حاصل کی اور وہاں سے سیدھے اُس طبقہ میں آئے جہاں

خوردونوش کی گرم بازاری تھی۔ ایک طرف خورجہ کی داروغہ کی شلجم کے اچاروں کی دُکان تھی، ادھر اُدھر ہوٹل تھے جن میں لوگ پراٹھوں سے دست و گریباں ہو رہے تھے اور کباب پر دندان تیز کر رہے تھے اس میں شک نہیں کہ ''حلوا خوردن روئے باید'' کی مثل بہت دنوں سے سنتے آئے ہیں، لیکن اس کا نفاذ جس خوبی سے ہوتے ہوئے ہم نے ان ہوٹلوں میں دیکھا آج تک دیکھنا کبھی اور نصیب نہیں ہوا تھا۔ یوں تو اس کلیہ کو آپ نمائش کے چپہ چپہ پر صحیح پائیں گے۔ لیکن اس کی بہترین اور روشن ترین مثال اکثر انھیں مقامات پر مل سکتی ہے۔

پراٹھے نمائش کی خصوصیات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ جس طرح سے تیار کیے جاتے ہیں اس کا مطالعہ اور مشاہدہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ گندھے ہوئے امدہ کی رسیاں شیخ چلی کے منصوبہ یا شیطان کی آنت کی طرح بڑھائی جاتی ہیں۔ موخرالذکر مثال معنوی حیثیت سے ذرا خطرناک ہے، ممکن ہے بعض حضرات کی سانس یہاں تیز چلنے لگے یا بالکل رُک جائے اور نتھنے اس طرح پھولنے لگیں جیسے تلنے کے وقت پراٹھے کے بعض بعض حصے پھول جاتے ہیں، لیکن مجھے اُمید ہے کہ ان نتھنوں کا حجم اتنا ہی جلد کم ہو جائے گا جتنے جلد ان پراٹھوں کے ماؤف حصے اپنی اصلی حالت میں آجاتے ہیں پھر انھیں گنڈ ڈکر کے پھیلا دیتے ہیں اور کڑاہی میں ڈال کر صرف ایک مرتبہ پلٹ دیتے ہیں۔ ایک حصہ جوں ہی داغ دار ہو چلا اُٹھا کر علاحدہ رکھ دیا گیا۔ اب یہ پراٹھا تیار ہے دوسرا حصہ اگر دیکھیے تو روئے کتابی بالکل صاف نظر آئے گا۔ اس کی سزائے قید تنہائی معدہ میں رکھی گئی ہے، نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہی سفوف ملیّن۔

سب سے دلچسپ دُکان خورجہ کے اچاروں کی تھی جس کا تذکرہ اُوپر آچکا ہے۔ یہاں تھوڑی پالیسی سے کام لیجیے تو بڑا فائدہ ہوتا ہے، خریدنے سے پہلے تمام اچاروں کے نرخ پوچھیے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر تک اپنے کو مشتبہ بنا رکھیے۔ دُکان والا فوراً آپ سے فرمائش کرے گا کہ آپ سب قسم کے اچاروں کو ذری ذری چکھ لیجیے۔ اب کچھ معنی یا بے معنی ہوں ہاں سے انکار کرنے کی کوشش کیجیے اور اس کے بعد مزید اصرار پر (جو آپ مطمئن رہیں یقینی ہے) چکھنے کے لیے تیار ہو جائیے۔ اب اس کے بعد آپ کیا کریں گے، یہ میرا ذمہ ہے میں بتلا سکتا ہوں آپ (بوجوہات چند جن کے اظہار کی یوں ضرورت نہیں ہے کہ ہم آپ دونوں سے زیادہ ہمارے ناظرین سمجھ سکتے

ہیں) دو یا ایک آنہ کا 8 آنہ سیر والا اچار خرید کر کے اصرار کریں گے کہ وہ کم سے کم ایک پیسہ کا مٹی کا برتن اور رستی خرچ کر کے آپ کے خرید کردہ اچار کو آپ کے حوالہ کرے۔ اگر آپ کو اس سے انکار ہے تو میں ہاکی کیپٹن کو گواہی میں پیش کر سکتا ہوں۔ آپ دوسری قسم کے اچاروں کو دبی زبان سے بُرا بتلائیں گے چار روپیہ سیر والے کے متعلق آپ کی رائے یہ ہوگی کہ بہت میٹھا ہے اور قیمت کے لحاظ سے بُرا ہے گو اتنی ہی دیر میں کسی دفعہ آپ کی زبان ہونٹوں پر دست درازی کر چکی ہوگی۔

یہاں سے رخصت ہو کر ہم سیدھے صاحب باغ پہنچے۔ ایک روز بدقسمتی سے راستہ بدل کر خزانہ گارد کے پاس سے گزرے۔ ہمارے ساتھ ہمارے ایک دوست بھی تھے جو ہم سے دو قدم آگے جارہے تھے۔ ہاتھ میں شلجم کے اچاروں کا برتن تھا۔ رات تھی اندھیری دور کی چیز بہ مشکل دکھلائی دیتی تھی۔ یک بہ یک سنتری نے کڑک کر آواز دی، ہلٹ ہو کمس دیر۔ Halt! who comes there.

مولانا چونکے تو برتن زمین پر آرہا اور آواز گلو گیر، لیکن تھے جہاں دیدہ فوراً سنبھلے گلا صاف کر کے جواب دیا کا....کا....کالج (لج پر کافی جھٹکا تھا) اور اچار کے برتن کا خیال بھی نہ کیا اور جلد جلد چلنے لگے۔ اچار کے برتن کے متعلق دریافت کیا گیا تو کہنے لگے کہ گرہ کھل گئی تھی۔ بہرحال دس بجے کے قریب ہم صاحب باغ واپس آئے، کھانا کھایا اور ارادہ کر لیا کہ کل سے پابندی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ گو ہمیں اب تک اس کا علم نہیں ہے کہ ہمارے لغتِ عمل میں کل اور پابندی کا وجود بھی ہے یا نہیں یہ ہے ہماری ''زندگی'' اور ''مگ گزرد'' کا روزانہ پروگرام۔

(علی گڑھ میگزین۔ جنوری۔ فروری 1920)

●●●

قربان عید قربان

آج چھوٹے بچوں کی عید ہے۔ جنھیں خوشی میں تمام رات نیند نہیں آئی ہے۔ صبح ہوئی اور بستر سے اُٹھ کر صحن و سائبان میں دوڑتے پھرتے ہیں، کوئی اپنی اچکن ہاتھوں میں لے کر فرط خوشی سے دوڑ رہا ہے دوسرا اپنی ٹوپی سر پر رکھ کر میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے کودتا پھاندتا باورچی خانے میں پہنچتا ہے جہاں مامتا بھری ہوئی ماں پسینہ میں تر، اور گرمی سے پریشان چولہے کے سامنے بیٹھی ہوئی جلد جلد روٹیاں جھل رہی ہے۔ کبھی صافی سے گرم کفگیر پکڑ کر گوشت بھوننے لگتی ہے، اور لڑکے کی از خود رفتگی اور ہیجان مسرّت دیکھ کر دل ہی دل میں باغ باغ ہو جاتی ہے اور چولہے کے قریب آنے سے منع کرتی ہے اور بچے سے چمکار کر باہر خاص دان لے جانے کو کہتی ہے۔ چھوٹا بچہ پان لے کر باہر جاتا ہے اور یہ تمام ضروریات سے قطع نظر کر کے بچے کو اس وقت تک دیکھتی جاتی ہے جب تک وہ لڑکھڑاتا ہوا سائبان کی دہلیز سے اُتر نہیں جاتا ہے۔ صحن کے نشیب و فراز سے بچے کو خبردار کرتی جاتی ہے اور اس کے ہر لڑکھڑا لڑکھڑا کر بچنے پر شاباش کہتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ دونوں ہاتھوں میں خاص دان لیے ہوئے باہر چلا جاتا ہے اور یہ جلد جلد کھانا پکانے میں مشغول ہو جاتی ہے تاکہ شوہر کو عید گاہ سے واپس ہونے پر فوراً ہی کھانا مل جائے۔ شوہر باہر سے بچے کی اُنگلی پکڑے ہوئے آتا ہے۔ اُس کے تمام کپڑے چارپائی پر رکھے ہوتے ہیں۔ بی بی فوراً چولہے سے آگ کھینچ کر توے کی آنچ دھیمی کر دیتی ہے۔ گوشت میں شوربہ دے دیتی ہے اور

سائبان میں آ کر کپڑوں کے انتظام میں مصروف ہو جاتی ہے۔شوہر غسل کرنے جاتا ہے اور یہ بچوں کو کپڑے پہناتی ہے۔تھوڑی دیر میں شوہر بھی آ جاتا ہے اور بچوں کو لے کر عیدگاہ کو چلا جاتا ہے۔چلتے چلتے بھی فرائض کا ایک دفتر بیوی کے سر تھوپ جاتا ہے، لیکن باہر نکلتے نکلتے ایک آن کے لیے مکان کے اندر آتا ہے اور ایک تبسم کے ساتھ بیوی پر تاکید کر جاتا ہے کہ اب کھانا ختم کرو، اور لباس تبدیل کر ڈالو۔شوہر ایک گھنٹہ کے بعد واپس آ کر تمام مکان کی ہیئت تبدیل پاتا ہے تمام چیزیں قرینہ سے رکھی ہوئی ہیں۔ ہر جگہ صفائی اور ستھرا پن نمایاں ہے۔ مکان میں ایک سکون اور اطمینان کا سا پیدا ہے۔خود بھی نہایت سادہ اور پاکیزہ لباس زیب تن کر لیا ہے اور اب کھڑی ہوئی عالم بے خبری میں چھالیہ کتر رہی تھی اور مکان کی تمام چیزوں کو ایک ایک کر کے دیکھتی بھی جاتی تھی کہ بچے باہر سے دوڑتے ہوئے آتے ہیں کسی کے ہاتھ میں باجا ہے کسی کے ہاتھ میں مٹھائی سب کے بعد شوہر آتا ہے دونوں کی آنکھیں ملتی ہیں اور خدا جانے چشم زدن میں کیا کیا کہہ جاتی ہیں اور دونوں متبسم ہو کر تھوڑی دیر کے لیے بچوں سے گفتگو کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

....

آج علی گڑھ کی عید ہے۔صبح ہی سے ''بہشتی بہشتی'' کی پکار ہو رہی ہے۔نہا دھو کر لوگ فارغ ہو گئے ہیں۔کوئی صاحب ''عارضِ تقاضی'' کو مصدر اُسترودن پر گردان رہے ہیں کچھ نمو کی سعی سے تنگ آ کر لیکن حیلہ شرعی کو مدِ نظر رکھ کر محض کتر بیونت پر اکتفا کر رہے ہیں (فرنچ کٹ کو ریش شرعی سے وہی نسبت ہے جیسے قوالی کو سماع سے) کسی نے تولیے اور روغنیات کے زور سے زنگ فطرت کو چہرہ سے دور کرنا چاہا۔کوئی کنگھی چوٹی میں مشغول ہے۔کسی نے آج ہی کے دن کے لیے پان کھانا موقوف کر رکھا تھا، کوئی ایسی چست مہریوں کا پائجامہ پہن رہا ہے جیسے بندوق پر غلاف چڑھا دی گئی ہو۔ کوئی ایسی اچکن سے دست و گریباں ہے جسے اُس نے اپنے خانہ آبادی کے سلسلے میں پہنا تھا اور عمر بھر میں پہلے پہل سودا کے گھوڑے پر سوار ہو کر اور منہ پر دو گز کا سُرخ تھان رکھ کر ''کانفرنس [1] کو چلے''

---

1 اودھ پنچ میں ایک کارٹون نظر آیا تھا جس میں ایک گدھے کے چاروں پاؤں باندھ دیے تھے اور ان کے اندر سے ایک مضبوط ڈنڈا نکال کر دو طرف سے دو آدمیوں نے اپنے کندھے پر لٹکا لیا تھا اور لیے چلے جا رہے تھے نیچے لکھا ہوا تھا ''کانفرنس کو چلے۔''

بنا ہوا گھوڑے کے ہر ہر قدم پر وجد کرتا ہوا ''عقل مندوں کے گروہ میں حماقت کا نمونہ'' چلا جاتا تھا۔ کوئی ایسے پائجامے پہنے ہوئے ہے جس میں اگر ہوا بھر جائے تو پھر ہوا کے گھوڑے پر سوار معلوم ہو ورنہ ہوائی جہاز تو ''زیران'' سمجھنا ہی چاہیے۔

مسجد میں سب لوگ جمع ہوئے۔ ہم نے بھی اپنا جوتا کسی عمدہ قسم کے جوتے کے پاس رکھ دیا تاکہ اگر کسی کی نیت میں فتور ہو اور وہ عقل مند بھی ہو تو ہم پر آفت نہ آئے۔ نماز ختم ہوئی۔ اب مصافحہ اور معانقہ کی نوبت آئی۔ معاذ اللہ اب سینوں کی خیر نظر نہیں آتی اور ہم ''نعلین در بغلین'' اپنے ناظرین سے .... گستاخی معاف !! مضمون کا دلچسپ حصہ تو اب شروع ہوتا ہے لیکن ہمارے مولانا محمد مقتدیٰ خاں صاحب نے پہلے سے نوٹس دے رکھا ہے کہ صرف دو ہی صفحے خالی ہیں اس لیے مجبوری ہے۔ انشاءاللہ آئندہ عید کو!!

(مطبوعہ: علی گڑھ میگزین۔ مارچ-اگست 1920)

●●●

کعبۂ ہندوستان

عبادت خانۂ ناقوسیان است
ہما نا کعبۂ ہندوستان است غالب (چراغِ دیر)

....

بنارس کو عبادت خانۂ ناقوسیاں کہیے
بنارس کو، بجا ہے، کعبۂ ہندوستاں کہیے

ترجمہ: اختر حسین

کعبۂ ہندوستان (بنارس) میں آج گنگا اشنان کا میلہ ہے، عقیدت مند زائرین کا گروہ مختلف حصصِ ملک سے جوق جوق آیا ہے اور صبح کے وقت جب آفتاب کی زرتار زنا مادرِ گنگ کے قدم لیتی ہوئی پیکر کاشی پر حائل ہو چکی تھی اور شہر کے بے شمار مندروں اور معبدگاہوں سے گھنٹے اور ناقوس کی آواز نکل کر یاسمینی فضا میں پیوست ہو رہی تھی، اور کوئی پیکرِ رعنائی پردۂ آب سے بے حجاب ہو کر صبح کے دھندلکے ہی میں آفتاب محشر بن چکا تھا۔ ہمارا گزر بنارس کے اُس مشہور گھاٹ پر ہوا جہاں حسن و عشق، دولت و افلاس، ناتوانی و شہ زوری، کبر و علم، ظلم و انصاف، حق پرستی و ہی و باطل پرستی، صرف ایک مشتِ خاکستر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جنھیں علم الکیمیا کے کیسے ہی جید عالم کے پاس تجزیہ کے لیے کیوں نہ لے جایئے وہ یہ ہرگز نہ بتلا سکے گا کہ یہ ہی مشت خاک کبھی صحرائے نجد میں ایک بگولۂ اضطراب تھا، یا یہ اسی خاکستری پُتلے کی جادو نظری تھی جس کے ایک ہی

جُرعہ سے اینٹونی نے اور نگ رُوما کو "غرقِ مےِ نابِ اُولیٰ" کردیا۔ یا انھیں سرد ذرات کا خاکی پُتلا بغداد کے خونیں کفن کی دھجیاں اُڑا رہا تھا اور "نازنینانِ حرم" کے حلقِ نازنیں سے خون کے فوارے بے نقاب ہو کر "آستان" سے گزر رہے تھے یا انھیں افسردہ ذرّات کا مجسمہ سر بہ فلک کشیدہ محلات میں الوانِ نعمت کے مزے لے رہا تھا، لیکن اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ اس سامانِ طرب کی تعمیر و تخلیق میں کتنی عورتیں قبل از وقت بیوہ ہو گئیں، کتنے بوڑھے نورِ نظر کھو چکے، کتنے معصوم بچے یتیم ہو گئے اور کتنی جانیں شدتِ گرسنگی سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس بے رحم دنیا سے گزر گئیں۔ اس وقت اُس کے لیے یہ اغذیۂ لطیف فراہم ہوئی ہوں گی، کتنے بھولے بھالے معصوم بچے آغوشِ مادر میں سسک سسک کر دم توڑ چکے ہوں گے اور بدقسمت ماں اس نیم مردہ وجود کو کلیجے سے لگائے ہوگی اور دوسری طرف گھبرا گھبرا کر تاریک اور طوفانی شب میں ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ یا جھلملاتی ہوئی بتّی کے سامنے بیٹھی ہوئی اس زرتار ملبوس کو دیکھتی ہوگی جس کے نامکمل رہ جانے سے اسے خدشہ ہے کہ صبح کو مزدوری کے پیسے نہ ملیں گے اور بچی کے گور و کفن کا بھی سامان نہ ہو سکے گا، کتنی دوشیزہ اور عفیفہ لڑکیاں ہوں گی جو عسرت اور ضیقِ گرسنگی سے بے بس ہو کر اُن مکانوں کی چہار دیواری سے جھجکتی اور لڑکھڑاتی ہوئی نکلی ہوں گی جن کی سقف و دیوار اُن کی دوشیزگی کی امین اور اُن کی عفت کی پاسبان تھیں، اور جن معصوموں کی تنہا اور گراں ترین متاع کو فنا کر دینے کے لیے محض دو چار لقمے غذا کے اور ایک گھونٹ پانی کا کافی ہے جو کسی بے رحم نفس پرست کے دو چار تانبے یا نکل کے ٹکڑوں سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ کسے معلوم ہے کہ ہر روز ایسے جاں گسل واقعات ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں رونما ہوتے ہیں اور وہی قدم جو پہلے پہل مکان سے لغزش کھاتے ہوئے نکلتے ہیں۔ آخر میں یا تو رفتہ رفتہ اس عفت سوز اور شرم ناک وادی کے ہر نشیب و فراز سے آشنا ہو جاتے ہیں یا پھر کسی روز شب کی تاریک خاموشی میں دریائے گنگ کے کنارے پہنچ جاتے ہیں، جہاں ہلکی ہلکی موجیں سنگی کناروں سے نہایت خفیف آواز کے ساتھ ٹکراتی ہیں۔ کچھ کچھ پھواریں پڑنے لگتی ہیں۔ ہر چہار طرف سکوت و سکون کا بحرِ ظلمات طاری ہوتا ہے۔ کسی بلند مقام سے ایک دُھندلی سی چیز سطحِ آب کی طرف گرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ گمان ہوتا ہے کہ نظر نے غلطی کی ہوگی، لیکن معاً پانی میں گرنے کا دھماکا ہوتا ہے۔ دم بہ دم قریب ہونے والی موجیں کنارہ سے ہم آغوش ہونے کے لیے

عالم بے خبری میں چلی آ رہی تھیں۔ یک بہ یک ہچکولا کھا کر پیچھے ہٹتی ہیں، پانی میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ چھینٹیں دور دور تک جا پہنچتی ہیں اور کوئی چیز گہوارۂ آبی سے دیکھتے دیکھتے غائب ہو جاتی ہے۔ موجیں بے قرار ہو کر اس دردناک منظر پر جمع ہوتی ہیں اور گزری ہوئی ہستی کی عبرت ناک زندگی کی پردہ پوش ہو جاتی ہیں۔

سوسائٹی کو کیا معلوم کہ اس کے بے رحم قوانین نے کتنی ہستیوں کو بدنصیب بنادیا اور کتنے بدنصیب فنا کے گھاٹ اُتار دیے گئے۔

لیکن نہیں سوسائٹی کا گلہ عبث ہے۔ فطرت کے قوانین خوش نصیبی، یا بدنصیبی کے مفہوم سے معرا ہوتے ہیں۔ سوسائٹی کیا ہے؟ فطرت کی گوناگوں حیثیات کا ایک مصنوعی نظام، کون فطرت؟ وہ فطرت جسے یہ نہیں معلوم کہ انسان اور حیوان میں کیا فرق ہے۔ حیوانات اور نباتات میں کیا چیز مابہ الامتیاز ہے اور نباتات اور جمادات میں کون سی شے حدِ فاصل ہے، احساس کسے کہتے ہیں یا محسوسات کن کا نام ہے۔ اس کے قوانین سب کے لیے یکساں ہیں اُس کے پاس صرف ایک ہی لاٹھی ہے اور ایک ہی ہانکنے والا ہے!

فطرت اور سوسائٹی میں ہمیشہ جنگ ہوتی رہی ہے۔ فطرت کے عریاں اور ناتراشیدہ اُصول ہمیشہ سوسائٹی کے قالب میں ڈھلتے رہتے ہیں۔ ورنہ نظامِ تمدن چند لمحوں میں درہم برہم ہو جائے اسی طرح خود سوسائٹی کی قیود اور پابندیاں طوق ورسن سے گلوخلاصی کرنا چاہتی ہیں۔ حتیٰ کہ ان کا قدم فطرت کی آزاد لیکن طوفانی وادی میں پڑنے لگتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمدن کا ردِ عمل انھیں پھر اُسی منزل پر لا کھڑا کرتا ہے جہاں سے اُن کے قدم "ارضِ ممنوعہ" کی طرف بڑھ چلے تھے۔

فطرت اور سوسائٹی کے قوانین میں ہمیشہ کشاکش رہتی ہے اور تہذیب اور تمدن کا معیار فی الحقیقت اُس فتح و شکست پر رکھا گیا ہے جو اُن کی باہمی کسر وانکسار سے رونما ہوتا ہے۔

آفتاب اب کافی بلند ہو چکا تھا، پجاری، پجارنیں، نہادھو، پوجاپاٹ سے فارغ ہو کر اشلوک و منتر پڑھتی ہوئی اپنی اپنی اقامت گاہوں کو واپس ہو رہی تھیں۔ ہر چہار طرف کاروباری لوگ اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ ہم نے بھی واپس ہونے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اتنے میں ایک دوسرا منظر پیشِ نظر ہو گیا۔ دریا کے کنارے سطحِ آب سے ہٹ کر دور تک تھوڑے

فاصلہ پر ایک دوسرے کے مقابل ڈیڑھ ڈیڑھ یا دو دو اینٹیں رکھی ہوئی تھیں۔ اُن میں سے کسی پر ایک نائی بیٹھا ہوا اپنے دوسرے ''ہم عصروں'' سے تبادلۂ خیالات کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک دہقانی سڑک کے موڑ سے دریا کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ گفت وشنید کا سلسلہ فوراً موقوف کر دیا گیا، اور ہر ایک اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد پر (پر، ہی کچھ زیادہ موزوں ہے) غیر مطمئن نظر آنے لگا، تھوڑے ہی عرصہ میں ایک من چلا کھڑا ہو گیا اور آنے والے شخص کی طرف بڑھا۔ یہ گویا آگے بڑھنے کا ایک سگنل تھا، کوئی نصف درجن نائی اپنی اپنی دھوتیوں سے گرد جھاڑتے اور دوسروں کے حصے کی اینٹوں سے ٹکراتے اور اُن کی ترتیب بگاڑتے ہوئے غریب دہقانی کے پاس پہنچ گئے اور اُسے اپنا بنانے کی پہلے تو زبانی ترغیب دیتے رہے اُس کے بعد سبھوں نے اپنے دلائل اور براہین کو جسمانی طاقت سے موثر بنانا چاہا۔ کسی نے ہاتھ پکڑا، کوئی دامن گیر ہوا، ایک نے دھوتی کا گوشہ کھینچا، دوسرے نے کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ تیسرے نے گلے میں باہیں حمائل کر دیں، چوتھے نے گردن کی چادر کھینچ کر۔

می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

کا مصداق بنا دیا۔ غرض کہ یہ تمام کیفیت کچھ اُس سین سے ملتی جلتی تھی جو ہمارے سٹڈنس یونین کلب میں الیکشن کے روز نظر آتی ہے۔ نئے نئے ووٹروں کو مخالف جماعتوں کے ممبران کس گرم جوشی کے ساتھ ''ہاتھوں ہاتھ'' لیتے ہیں۔ ''پا بہ دست دگرے دست بہ دست دگرے'' کشاں کشاں لے جاتے ہیں یا رواروی میں ''دست و گریباں'' بھی ہو لیتے ہیں۔ بہر حال ابھی یہ ہنگامہ ترقی ہی پر تھا کہ حریفوں میں سے ایک کا پاؤں کسی دوسرے کے پاؤں سے ٹکرایا، پھر کیا تھا دوسرے شیر قالین کچھ یوں بھی نیاز مند ہو چلے تھے۔ اس کش مکش سے نجات حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ اپنے مقابل کو کسی صیغۂ واحد مونث غائب کے ساتھ منسوب کر کے قوانین فطرت کی عریانی اور اپنی بہیمیت کا نہایت بلند آہنگی سے اعلان کرنے والے ہی تھے کہ دوسرے نے واحد مذکر حاضر کوزدن کی گردان پر رکھ ہی لیا۔ ادھر اُن کا وصال ہو رہا تھا، دوسری طرف بے چارے دہقانی کو اپنی حالت کا اندازہ ہوا تو اس نے بھی گلو خلاصی کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔ اسی دار و گیر میں کسی مرد میدان کی دھوتی اور کسی کی پگڑی بے قابو ہونے لگی، اور انھوں نے اس کی طرف

توجہ ڈالی ہی تھی کہ آخری حریف نے مالِ منقولہ پر قبضہ کر ہی لیا اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد پر کھینچ لایا۔ دوسروں نے شکار کو اس طرح ہاتھ سے جاتے ہوئے دیکھا تو رگِ حمیت جوش میں آئی، لیکن قبل اس کے کہ ہنگامہ آرائی نئے سرے سے شروع کی جائے ہمارے ہیرو نے فوراً ہی پانی کی لٹیا دہقانی کے سر پر اُلٹ دی اور سر پر دستِ شفقت پھیرنے لگا۔ یہ گویا فتح وظفر کا آخری اعلان تھا۔ سب اپنے اپنے دم دموں پر واپس آئے۔ اینٹوں کی ترتیب درست کی اور اُن میں سے حقہ کے دو چار کش لے کر یا دو ایک متفرق اور اُڑتی پڑتی بے نقط کی سن سنا کر خاموش ہو گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نوگرفتار جس کے "سر سے پانی گزر چکا تھا"۔ چھرے تلے کس طرح دم لے رہا تھا۔

نائی کے ہاتھ کسی ماہر علم الکیمیا کو اپنی تحقیق وتفتیش میں عمر بھر سرگرداں رکھ سکتے ہیں، اس کے ہاتھ اُن تمام چیزوں میں پڑتے ہیں جن کے چھونے یا استعمال کرنے کے لیے جسم کا یہ عضو کام میں لایا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ عقلِ انسانی کی اس ابتدائی ایجاد سے عمداً بے خبر ہوتا ہے کہ پانی سے کثافت یا نجاست دور ہو سکتی ہے، آلودگیوں کے دور کرنے کا اُس کے پاس صرف ایک ذریعہ ہے۔ یعنی اوّل تو دونوں ہاتھ خوب ملے جائیں گے اور اگر اُن میں چکنائی بھی ہے پہلے دونوں ہاتھ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر اس قدر دبا کر پھیرے جائیں گے کہ چہرے پر کی تمام جائداد غیر منقولہ ناک، آنکھ، لب، زنخداں۔ سب علی الترتیب یا تو الیکشن کے کسی ناکامیاب اُمیدوار کے منہ کی طرح لٹک آئیں گے یا پھر کسی کلیت مآب ناظر کی "ناک بھوں" کی طرح چڑھ جائیں گے۔ اس کے بعد دونوں گھٹنوں کی مالش ہوگی، لیکن فرصت اگر اتنی ورزش کی متقاضی نہ ہوئی تو دونوں ہاتھ دھوتی کے اس حصے پر پھیر لیے جائیں گے جو رانوں کی ستر پوشی کرتی ہے۔ پسی ہوئی ہلدی، دھنیہ، پیاز و مرچ کی وہ تیز بو جو مدت ہائے آمدید تک گانجا، بھنگ یا چرس سے بسے ہوئے ہاتھوں میں موجود رہی ہو اور جس میں وقتاً فوقتاً سُرتی کے پتے اور چونے کی ایک کافی مقدار کھرل کی گئی ہو۔ کچھ وہی بدقسمت برداشت کر سکتا ہے جو اُن کے دستِ تطاول میں آپھنسا ہو۔ بہر حال اب غریب، دہقانی تھا اور اُن حضرت کا آلۂ کند دھار دار!!

پانی کا تیمم دیا جا چکا تھا، مالش زوروں پر تھی۔ اُسترے اور قینچی کے فرائض کو ہلکا ہی نہیں بلکہ مختصر کر دینے کے لیے کچھ ایسی کھینچ تان شروع کر دی گئی تھی کہ بال کا بیش تر حصہ اُنگلی کے

اشارہ پر چٹکیوں میں آ گیا تھا۔ سر کی حالت اُس کھال کی سی تھی جو دباغت کے لیے کسی کے سپرد کردی گئی ہو۔ کثافت سے یوں ہی گراں بار تھا پھر نائی کا ہاتھ ''ہندوستانی دواخانہ دہلی'' کے سنگ سماق کا کھرل تو تھا نہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ سائیدہ وحل کردہ زلال کا چشمہ ہر طرف سے بہہ نکلا یا یہ کہیے کہ ہمالہ کے کوہستانی سلسلہ سے دریائیں بہہ نکلی تھیں جن کا پانی برسات کی وجہ سے گدلا ہو گیا تھا۔ یا سب سے زیادہ ''گھریلو'' مثال گل منزل (یادش بخیر!) کی لے لیجیے، جب دیواروں پر نئی قلعی ہوئی ہو، پانی کا ایک اچھا چھینٹا پڑ گیا ہو اور گل منزل کے خاکستری عارض پر جھریاں نمودار ہو گئی ہوں۔ بہرحال رسم اصطباغ ختم ہوئی۔ اب نائی نے عملِ جراحی کے لیے اپنی کسوت کی طرف رُخ کیا۔ اگر نائی کے ہاتھ کی آلودگیوں کے تجربہ کرنے سے زبردست عالم قاصر ہیں تو پھر بڑے بڑے اُولوالعزم سیاح اُس کی کسوت کے وسیع اور پُراسرار وادی میں عمر بھر سر ٹکراتے پھریں اور منزل مقصود کا پتا نہ لگ سکے۔ خیر سر منڈنا شروع ہوا۔ اُسترہ کند، سر پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی، لیکن ''سر تسلیم خم'' ہے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ کہیں کہیں سے سر نے لعل اُگلنا بھی شروع کر دیا تھا، اور اسی دوران میں اگر غریب کے چہرے پر نظر ڈالی جاتی تو ایک عجیب عالم نظر آتا۔ اوّل تو اُس مالش کا فشار، دوسرے اُسترہ کا کند ہونا جس کو مہمیز کرنے سے سر پر اور آفت ٹوٹتی تھی اور پھر اُن چرکوں پر نائی کے ہاتھوں کا ''نمک مرچ'' غرض کہ اُس وقت بے چارے کا چہرہ ہندوستان کا نقشۂ طبعی بنا ہوا تھا، لیکن ستم ظریفی یہ کہ خود نائی کے چہرہ پر اطمینان وسکون کا وہ عالم تھا کہ بیان سے باہر اُس نے اپنے سکون واستقلال کو محض اپنے سکوت سے ظاہر کرنا ناپسند نہیں کیا۔ بلکہ بتلانا شروع کیا کہ وہ کب سے اس کام کو کرتا ہے، کتنے لوگوں کو اس نے ''مونڈ دیا'' اُس کا باپ کس مہاجن کے پاس نوکر تھا اور مہاجن کی بیوی اُس پر کتنی مہربان تھی، اس کے کتنے بچے ہیں وہ اپنے ''معمول'' کے تمام خاندان سے واقف ہے۔ آج کل کس کے یہاں شادی ہونے والی ہے اور وہ لوگ اُس کی امداد کے کتنے متمنی ہیں۔ آفتاب کس بُرج میں ہے، موسم کیا ہے آئندہ کیا ہوگا، گورنمنٹ کو بھرتی میں کہاں تک کامیابی ہوئی، یورپ کی لڑائی کس حد تک پہنچ چکی ہے وغیرہ وغیرہ۔ غرض کہ کوئی ایسا موضوع نہیں ہے جس پر وہ نہایت شرح وبسط کے ساتھ بغیر اس خیال کے کہ سننے والے میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت بھی ہے یا وہ پسند بھی کرے گا یا نہیں یا اُس کے سر پر

کیسے گزر رہی ہے بحث نہ کرسکتا ہو! ''سر سے کھیلنے'' کے بعد داڑھی کی باری آتی ہے۔ آج کل کے فیشن ایبل نوجوان اس کے لیے کیا کیا اہتمام کرتے ہیں، بہترین اُسترہ ہو، اسٹراپ، برش، کنگھا، صابون، فتنہ، غازہ، لوشن، ہرا، پھٹکری سب کچھ موجود ہونا چاہیے۔ ہر روز صبح کو اُٹھ کر آئینے کے سامنے ''رخساروں پر صابون لگائے ہوئے'' ''ہوا'' بنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد کنگھی چوٹی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ایک ایک بال کا پیچ وخم درست کیا جاتا ہے، ایسی مانگ نکالنے کی فکر ہوتی ہے کہ پرکار و پیمانہ پر بھی بال بال صحیح اُتر سکے۔ اگر مونچھیں اب بھی بہ قیدِ حیات ہیں تو پھر کاسمیٹک کی پٹ دے کر دونوں گوشے اینٹھ اینٹھ کر ایک ایسے آکۂ نوک دار کے بنانے کی فکر کی جاتی ہے جس پر موجودہ قانون اسلحہ پاس ہوجانے کے بعد بھی لائسنس حاصل کرنے کا حکم نافذ ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ انسان کی فطری کمزوریوں کے چند ایسے لمحات بھی ہوتے ہیں جن میں اگر خصوصیت کے ساتھ آدمی محتاط نہ رہے تو فریق ثانی کو ضرب شدید پہنچ جانے کا احتمال رہتا ہے۔ بہر حال داڑھی منڈنی شروع ہوئی، نائی نے بھی بال کی کھال نکالتے نکالتے کھال کے بال اس سختی سے نکالنے شروع کر دیے کہ بے چارے دہقانی کی جان پر آبنی۔ خیر خدا خدا کر کے فرصت ہوئی نائی نے ہاتھ پاؤں دبانے کی رسم پوری کی۔ تو گرفتار کا پورا ہاتھ شانہ تک سامنے سے اپنے اوپر رکھ لیا اور خوب پیٹھ وغیرہ ٹھونک کر اُنگلیاں چٹخائیں اور پیسے وغیرہ لے کر انھیں چلتا کر دیا۔

نائیوں کے مختلف درجے اور مختلف اقسام ہوتے ہیں۔ منطق اور فلسفہ والے تو انھیں جنس وار علاحدہ کر دیں گے، لیکن اگر اس مسئلہ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن میں سے ہر ایک بجائے خود ایک مخصوص جنس ہوتا ہے اس لیے اُن کی تقسیم بالکل ناممکن ہے۔ ہندی میں انھیں ''چھتیس بدّھا'' کہتے ہیں یعنی ان میں چھتیس ہنر ہوتے ہیں۔ جراحی میں اس کا ناخن گیر و اُسترہ ڈاکٹروں کے نشتر وسلائی، عالموں کی زبان وقلم، سپاہیوں کی تلوار و نیزہ اور ایشیائی معشوقوں کی مژگان وابرو سے زیادہ کاٹ کرتا ہے۔ ایک دفعہ راقم کو بھی اس کامل اُلفن ہستی کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنا پڑا تھا۔ تمام ہفت خواں سر ہو چکا تھا، ناخن کی باری آئی، تو بزرگ نے ایک ناخن گیر نکالا جو بلا مبالغہ کھانے کی چھری سے کچھ ہی چھوٹا تھا میں نے گھبرا کر پوچھا ''کیا بھئی میرے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں گھر پر لے جا کر ناخن تراشنے کا ارادہ ہے؟ اس پر نہایت

اطمینان سے جواب دیا۔ ''نہیں ایک شخص کی ایڑی میں ایک کچا پھوڑا تھا اُس میں شگاف دیا گیا تھا اس لیے فی الحال اسی ناخن گیر سے کام لینے کا ارادہ ہے۔'' میں نے کہا ''تم غلطی پر ہو اس کے پاؤں میں نہیں دماغ میں پھوڑا ہوگا ورنہ آنکھ میں تو ضرور کچھ نہ کچھ نقص ہوگا، اور للہ مجھے تو معاف ہی رکھو۔ 1920 کی مردم شماری میں مجھے اپنی ہستی تسلیم کرانی ہے اور تمہارے ناخن گیر کو دیکھ کر تو یوں ہی قلب کی حرکت رُکی جاتی ہے، یہ تو جراحی ہوئی۔''

ایک مدبّر سلطنت کے مقابلے میں اُس کی ہستی بھی ایک مخصوص حیثیت رکھتی ہے۔ ہندوستان میں زیادہ تر شادی غمی کا پیغام بر نائی ہی ہوتا ہے۔ جب یہ منزل مقصود پر پہنچتا ہے تو گھر والے اُس کا آنا اتنا ہی معنی خیز سمجھتے ہیں جتنا معزز طبقے میں آج کل ایک ملک سے دوسرے ملک میں مدبرانِ سلطنت کا آنا جانا اہم خیال کیا جاتا ہے۔ تھوڑے سے غور کرنے کے بعد آپ پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ فن سیاست کا امام کیسا ہی کامل فن کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے ہمارے ہندستانی نائیوں سے چہرہ بشرہ بنا رکھنے میں، اپنے اصلی جذبات کو دل و دماغ کے تاریک ترین غار میں دفن کر دینے اور مصنوعی جذبات کو بانگ دہل مشہور کر دینے میں وہ کبھی گوئے پر سبقت نہیں لے جاسکتا۔ شکست پر شاندار پسپائی اور فتح پر انتہائی بلکہ بزدلی کی حد تک انتقام لینا مصیبت کے وقت وعدہ و اقرار کا پل باندھ دینا اور فراغت کے وقت انھیں طاق نسیان پر رکھ دینا، وقت پر پابوس ہو جانا اور پھر دوسرے وقت ٹھکرا دینا، یہ سب اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اصلی اور نجیب الطرفین پالیٹیشین کی طرح یہ سوالات کا قطعی یا مشرح جواب کبھی نہ دے گا۔ یہ جب کبھی شادی وغیرہ کا پیغام لے جاتا ہے تو اس کی حیثیت دونوں خاندانوں میں سب سے زیادہ قابل وقعت فرد کی ہوتی ہے۔ اس کے الفاظ حرکات و سکنات اُن کے دلوں کو اُمید و بیم سے پُر کر دیتے ہیں۔ یہ جب کبھی ایک سفید کورا، لیکن ملگجی ململ کا چھوٹا کرتا اور ایک نہایت کثیف دھوتی پہن کر اور کمر کو ایک نہایت لمبے چوڑے دوپٹے سے باندھ کر ایک بڑا ڈنڈا کندھے پر رکھے ہوئے (جس پر اُس کا نیا جوتا جس میں خوب تیل دیا رہتا ہے اور گرد کی ایک تہ جمی رہتی ہے، چڑھا ہوتا ہے) بستی میں داخل ہوتا ہے تو تمام لوگ واقف ہو جاتے ہیں کہ کون شخص ہے۔ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا۔ یہ جب مکان پر پہنچتا ہے تو ایک عجیب ہم ہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے پان و شربت کا انتظام کیا

جاتا ہے۔ صاحب خانہ خدمت میں حاضر رہتا ہے اور یہ پاؤں پھیلائے ہوئے چارپائی یا تخت پر دراز رہتا ہے اور بہت عرصہ میں ایک خط اپنی دھوتی کی چند در چند تہوں میں سے سینکڑوں ،کر ہیں کھول کر مالک مکان کے حوالہ کرتا ہے۔ خط کا ملخص یہ ہوتا ہے کہ "مفصل کیفیت حاملِ رقعہ سے معلوم ہوگی" اب ناظرین خود خیال فرماسکتے ہیں کہ حاملِ رقعہ کی کیا کیا مدارات ہوسکتی ہیں۔

یہ گاؤں کا پنڈت اور حکیم بھی ہوتا ہے۔ یہ بتلاسکتا ہے کہ کس روز کدھر کی "جاترا" ہے یا کون سے مرض میں کون سی دوا مفید ثابت ہوگی گو اس کا علاج اکثر اس اُصول پر مبنی ہوتا ہے کہ "مرض رہے نہ مریض۔"

اس کی ذرا زیادہ سفید پوش برادری وہ ہے جو ایک روز ناغہ دے کر کالج میں نظر آتی ہے۔ ان کا اُسترہ ایک منٹ میں صحرانوردی کر کے واپس آجاتا ہے اور اس دارو گیر میں اگرچہ بہت سے چپۂ زمین روئیدگی سے سبک دوش نہ ہوسکیں یا بہت سے حصے ضرورت سے زیادہ صاف ہو کر یاقوت رُمانی[1] کے سوتے بہانے لگیں تو کچھ تعجب نہیں۔ کالج کے فیشن ایبل زندگی کا نمایاں ترین پہلو اسی فرقہ کی چابک دستیوں کا رہینِ منت ہے۔ آپ نے شاید کسی بدقسمت یا تباہ حال شخص کو بھی اتنا پریشان نہ دیکھا ہوگا جتنا ہمارے کالج کے نوجوان اُس روز نظر آتے ہیں جب باربر (نائی یا حجام کا انگلو انڈین سوتیلا بھائی) یا تو بالکل نہ آیا ہو یا آکر نکل گیا ہو اور یہ حضرت یوں ہی رہ گئے ہوں۔ اس کے برش اور صابن سے زیادہ مکروہ چیز بہ مشکل خیال کی جاسکتی ہے، لیکن جب تک عارضِ رنگین یا "بوسیدہ" پر اس کا دستِ تطاول دراز نہ ہولے ہمارے دوستوں کو چین ہی نہیں!!

شام کا وقت تھا۔ پانی برس کر کھل گیا تھا۔ آسمان پر بادلوں کا رنگین لباس نوخیز دیوتا، اُفقِ مغرب سے جہاں شفق پھول رہی تھی۔ پھول اور سیندور کا تحفہ لے کر ٹھنڈے اور خوش گوار ہوا کے رتھ پر، کاشی کا درشن کرنے آرہا تھا۔ بنارس کے بڑے بڑے رئیس اور مہاجن اپنے سفید کرتے اور دھوتی میں گاڑیوں پر یا پاپیادہ ادھر اُدھر آجارہے تھے ہم بھی گھومتے گھومتے چوک ہوتے ہوئے دال منڈی میں داخل ہوئے۔ سڑک نہایت تنگ تھی، دو رویہ مختلف اقسام کی دوکانیں آراستہ تھیں آیندوروندگان کا وہ ہجوم تھا کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ تنبولیوں کی پاکیزہ دُکانیں قریب قریب

1۔ یاقوت رُمانی: ایک عمدہ قسم کا نہایت سرخ رنگ یاقوت جو انار کے دانے سے مشابہ ہوتا ہے۔

فاصلہ پر موجود تھیں، جن کے سامنے لوگ کھڑے ہو کر پان خریدتے اور کھاتے تھے اور آئینہ میں حلیہ دیکھ کر اور پھر یہ خیال کر کے شاید کوئی اور بھی دم خم کا دیکھنے والا موجود ہو۔ تھوڑی دیر کے لیے اکڑ بھی لیتے تھے۔ سامنے سے ایک دیہاتی ٹھاکر صاحب تشریف لا رہے تھے۔ گلے میں طلائی کنٹھا نہایت صاف چکن کا کرتا جس کے نیچے شربتی رنگ کی ایک بنیائن تھی ہاتھ میں سونے کا تعویذ پڑا ہوا تھا۔ تنبولی کی دُکان سے پان کھایا اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے آگے بڑھے، چل تو زمین پر رہے تھے لیکن آنکھیں بالا خانوں پر لگی تھیں۔ کئی جگہ آنے جانے والوں سے ٹکرائے مگر ہوش نہ آیا۔ بارش کی وجہ سے تمام سڑک کیچڑ سے بھری ہوئی تھی۔ ایک جگہ پاؤں تلے سے زمین سن سے نکل گئی اور خود کوئے جاناں کے گز بن گئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ آدمی کو پھسل کر گرنے سے خواہ کیسی ہی چوٹ کیوں نہ آئی ہو، دوسروں کو ہنسی ضرور آجاتی ہے اور لوگ اس سے کافی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب کا سراپا اب دیکھنے کے قابل تھا، گرنے سے منہ کو کچھ ایسا جھکولا لگا کہ تمام پیک کرتے اور دھوتی پر آ گئی۔ کل حکمت پہلے ہی ہو چکے تھے، بےفکروں نے یہ صورت دیکھی تو لگے تالیاں بجانے۔ ٹھاکر صاحب کو اوّل تو اس بے تکے پن سے گرنے کا غم اور پھر یہ رُسوائی مزید برآں نتیجہ یہ ہوا کہ لگے یک طرف سے گالیاں دینے! اُن کے نوٹس لینے سے اور لوگ بھی جمع ہو گئے، ٹھاکر صاحب اب اپنے سے باہر ہو گئے تھے۔ ڈنڈا پھینک کر ایک سب سے شوخ اور شریر لڑکے پر دار کیا جو دور بھاگ گیا تھا۔ اتفاق وقت دیکھئے لاٹھی ایک دوسرے بگڑے دل کے جا لگی۔ اس پر ایک اور فرمائشی قہقہہ لگا۔ دوسرے فریق کو خیال آیا کہ تمام بالا خانہ سے عیش و عشرت کی دیویاں، اُس کی جاں بازی اور عصبیت کا کتنا حقیر اندازہ لگائیں گی فوراً ہی دوڑ کر ٹھاکر سے گتھ گئے۔ تماشائیوں نے تالیوں اور واہ واہ کے شور سے اور ہنگامہ برپا کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس کا کنسٹبل آیا اور دونوں سورماؤں کو دوڑائے لے گیا۔

بالا خانے، جنت نگاہ فردوس گوش بنے ہوئے تھے، جہاں عفت فروشی کا بازار گرم تھا۔ جہاں ملک اور قوم کا گراں بہا سرمایہ تباہ ہو رہا تھا اور جہاں سے آئندہ نسلوں کے لیے تندرست اور غیور لڑکے اور باعصمت لڑکیاں نکلتیں۔

اے وہ لوگو! جو عورت کی عصمت فروشی کو اپنا مشغلہ تفریح یا اپنے متاع اور دولت کا ایک جائز مصرف سمجھتے ہو کیا تمہیں کبھی اس کا خیال بھی آیا ہے کہ تمہارے اس عافیت سوز فعل سے

سوسائٹی کی رگ و پے میں کیساز ہر سرایت کر رہا ہے کیا تمہیں کبھی اس کا خطرہ بھی گزرا ہے کہ انسانی کمزوریوں کا بد قسمت وجود فوق البھڑک پوشاک اور زاہد فریب تبسم کے گونا گوں حجابات میں ایک ایسا مجروح قلب رکھتا ہے، جس کی محض ایک دل دوز آہ تمام دنیا کے شیرازۂ انبساط کو بکھیر سکتی ہے۔ کیا تمہیں کبھی بھولے سے بھی یہ خیال آیا ہے کہ سوسائٹی کے آہنی قوانین اس کمزور ہستی کو خفیف ترین کمزوری کے شبہ پر ہمیشہ کے لیے قعر مذلت میں ڈھکیل سکتے ہیں۔ لیکن وہی قوانین تمہارے لیے ایک مشغلۂ تفریح ہیں اور یہ محض اس لیے کہ اُن قوانین کے وضع کرنے میں عورت کا ہاتھ ہمیشہ سے مفلوج سمجھ لیا گیا ہے۔

کیا تم نے اس پر بھی غور کیا ہے کہ ان کے قلب پر کیا گزر جاتی ہے جب وہ نصف شب تک اپنی تاریک قسمت کے خلاف اور اپنی محزونیت اور کس میری کو محسوس کرتے ہوئے تمہیں اور تمہارے دیگر ہم مشربوں کو محض قوت لا یموت حاصل کرنے کے لیے اپنی طرف مائل کرتی ہیں اور جب انھیں مایوسی ہوتی ہے تو کلیجہ تھام کر کس بے بسی اور لاچاری سے اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔

کیا تمہیں اس حقیقت سے انکار کرنے کی جرأت ہو سکتی ہے کہ اُن کے اس جگر خراش کراہنے کی آواز سے ایک شقی القلب کے جسم پر بھی لرزہ پڑ سکتا ہے۔ اگر نہیں ہے تو پھر میرے عزیزو! اس ساعت کے آنے سے ڈرو جب تم سے پوچھنے والا پوچھے گا کہ مقصد کائنات کی تکمیل کا بار تمہارے سر پر تھا تم اُس سے کہاں تک عہدہ برآ ہو سکے؟ کس قدر حسرت ناک اور عبرت خیز وہ لمحہ ہوگا جب تمہیں اُمید افزا جواب دینے کا ارمان ہوگا۔ لیکن تم دے نہ سکو گے اور تمہاری خاموشی تمہارا اضطراب اور تمہاری بے چارگی تمہاری معصیت تمہاری سرکشی اور تمہاری ذلت کی وہ لا متناہی فضا ہوگی جس کی ابتدا اور انتہا کا علم اُس خدائے قہار کو ہے جس کی ہستی کے ہم بہ مشکل قائل ہیں!!!

(مطبوعہ: علی گڑھ میگزین۔ ستمبر-اکتوبر 1920)

●●●

کارِ طفلاں تمام خواہد شد

شہر یا قصبہ سے دور، چند منتشر، شکستہ اور ویران جھونپڑیوں کا ایک گاؤں ہے جس میں آم یا نیب کے چند درخت ہیں۔ ہر چہار طرف حدِ نظر تک، وہاں کے کاشت کے لیے خشک تال پھیلے ہوئے ہیں جو برسات کے موسم میں پانی سے لبریز ہو جاتے ہیں اور پھر گاؤں دیگر آبادیوں سے الگ تھلگ ایک جزیرہ بن کر رہ جاتا ہے۔ سیاہ چھپّروں پر موسمی ترکاریوں کی بیل چڑھی ہوتی ہے جن پر رنگ برنگ کے پھول ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا جنگل کے نیم وحشی باشندوں نے اپنی ملکہ کے سر پر پھولوں کا تاج رکھ دیا ہے۔ گاؤں کے اندر درختوں کے نیچے لاغر اور کمزور مویشیاں بندھی ہوتی ہیں جو اپنی اور اپنے مالک کی فلاکت اور بدقسمتی کا احساس محض اُس متوکلانہ تشکر آمیز جگالی سے کرتی ہیں جن کی ہم زبانی وہ گرسنہ لیکن حسرت آلود نظر کرتی جاتی ہے جو بار بار اور بے اختیار اپنے مالک کے اُن کمزور دست و بازو کی طرف اُٹھ جاتی ہے جس پر جھرّیاں پڑ گئی ہیں اور جنھیں فطرت نے غریبوں کے لیے ذہانت و طباعی، فصاحت و بلاغت، حسن و جمال، شہرت و ثروت، جاہ و جلال کا نعم البدل پیدا کیا ہے، لیکن غیور کسان پاس ہی بیٹھا ہوا گنڈاسے سے یہی چری کاٹتا جاتا ہے اور کبھی کبھی پیار سے اپنی بے زبان اہل و عیال کو ان کی بے اختیاری اور ازخود رفتگی پر چمکارتا جاتا ہے یا فرطِ محبت سے جھڑکیاں بھی دے دیتا ہے خوب صورت، لیکن پھرتیلا بچھڑا کسان کے چاروں طرف اُچھلتا کودتا ہے اور جب کبھی بالکل زد کے قریب آ جاتا ہے تو کسان ڈانٹتا ہے اور وہ

پھلانگیں مارتا ہوا اپنی ماں کے پاس چلا جاتا ہے۔ وہاں تھوڑی دیر تک دودھ پیتا ہے، گائے اپنی زبان سے جلد صاف کرتی ہے، وہ وہاں سے چوکڑیاں بھرتا ہوا جھونپڑے کے نزدیک آتا ہے۔ کسان کے چھوٹے چھوٹے بچے اس کے خیر مقدم میں چلا اُٹھتے ہیں وہ بھی اس کے ساتھ کودتے پھاندتے کسان کے پاس پہنچتے ہیں، جو دونوں کو ڈانٹتا ہے اور یہ سب کھیلتے کودتے دوسری طرف نکل جاتے ہیں۔ پاس ہی میلے پانی کا ایک گڈھا ہے جس پر کائی جمی ہوئی ہے اور جس کے قریب بانسوں کی ایک گنجان کوٹھی ہے۔ شام کے قریب اردگرد کے پرند آکر بسیرا لیتے ہیں اور اپنے شوروغل سے تمام گاؤں سر پر اُٹھالیا کرتے ہیں۔ چھپروں کی آڑ میں کچھ دور پر، اٹھلاتا اور بل کھاتا ہوا، ہماری قدامت پرستی کا تنہا دیکہ علم بردار، شتر بے مہار، کولھو، نظر آتا ہے۔ زمیں دار کی چوپال میں ایک طرف اسکول قائم ہے جس میں ٹاٹ کے چند نہایت کثیف اور بوسیدہ ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں۔ غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ آج اس مقام پر کچھ غیر معمولی تگ و دَو ہو رہی ہے، کیوں کہ مدرسوں کے بھگوان ''ڈپٹی صاحب'' آنے والے ہیں۔ کسی بڑے ملک میں حاکم یا حکمرانِ وقت کے آنے پر شاید ہی اتنا اہتمام کیا جاتا ہو یا جس کی ذات کے ساتھ اپنی بھلی یا بُری توقعات وابستہ ہوں جتنی دیہاتی اسکولوں میں ''ڈپٹی صاحب'' کے ورودِ مسعود پر ہم ہی پیدا ہوتی ہے یا جتنی دوررس اثرات کی توقع کی جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے کچھ تو جھٹک جھٹک کر ٹاٹ صاف کر رہے ہیں کچھ کمرہ اور سائبان میں جھاڑو دے رہے ہیں۔ کچھ گڈھے سے نہایت کثیف گھڑے میں پانی لا رہے ہیں، کوئی ٹوکری میں اردگرد کے مویشیوں کا گوبر لیے چلا آرہا ہے اور اب فرش پر ''تکمید تدہین یا ضماد'' (ملاحظہ ہو فہرست ادویات ہندستانی دواخانہ دہلی) کی فکر کی جارہی ہے۔ دوسری طرف ایک اُمیدوار مدرس صاحب بانس کی سیڑھیوں پر چڑھے ہوئے دیواروں کو چکنی مٹی سے لیپ اور لیس رہے ہیں، لیکن یہ تفریق البتہ ناممکن ہے کہ مٹی کا زیادہ حصہ دیواروں پر صَرف ہو رہا ہے یا خود ان کے جسم مبارک پر۔ ان کا انہماک سب سے بڑھا ہوا ہے کیوں کہ ان کے اصلی ''آقائے نام دار'' ڈپٹی صاحب نہیں بلکہ ''بابو صاحب'' ہیں اور چوں کہ سال ہا سال کی اُمیدواری کے بعد اب کی دفعہ ڈپٹی صاحب سے اُن کی سفارش ہونے والی ہے۔ اس لیے ایک طرف تو یہ شغل جاری ہے دوسری طرف بابو صاحب کو کن انکھیوں سے دیکھے جاتے جو

کنویں کی جگت پر بیٹھے ہوئے ناریل سے دُھواں دھار کش لے رہے ہیں۔ صرف ایک دھوتی کمر سے نیچے اور گھٹنوں سے بہت اوپر لپٹی ہوئی ہے۔ جسم پر" دیئے" کے تیل کی مالش ہو رہی ہے اور جس کے لیے لڑکوں سے سخت تاکید کی گئی ہے کہ وہ رات کو دیر تک نہ پڑھیں تاکہ چراغ کا تیل ختم یا کم نہ ہو جائے۔ وقتاً فوقتاً گھسیاریوں یا پنہاریوں سے مذاق بھی کرتے جاتے ہیں، یا بسلسلہ کفارہ لڑکوں کو عموماً اور اُمیدوار مدرس صاحب کو خصوصاً دو چار گالیاں بھی دیتے جاتے ہیں۔ کچھ لڑکے پھاوڑہ لیے ہوئے اُس زمین کی سطح ہموار کر رہے ہیں جس پر ڈپٹی صاحب کا خیمہ نصب ہوگا۔ بابو صاحب کا سب سے چہیتا طالب علم اُن کے لیے چلم بھر رہا ہے اور جس سے بار بار فرمائش اور تاکید ہو رہی ہے کہ اب تک مویشیوں کو چارہ اور بھوسہ نہیں پہنچا ہے گھر میں " تیل، نون لکڑی" نہیں ہے اس لیے بازار جانا چاہیے۔ بابو صاحب کا لڑکا گھر میں سے روتا ہوا نکلا، اسے گود میں لے کر بہلانا بھی چاہیے۔ غرض کہ غریب لڑکے کے ذمہ اتنے ہی فرائض عائد کر دیے گئے ہیں جو اوائل جنگ میں گولہ بارود اور دیگر سامانِ جدال وقتال کی فراہمی کے لیے انگلستان کے بڑے سے بڑے افسر کے ذمہ کر دیے گئے ہوں گے۔ بایں مشغولیت، خود بابو صاحب، تحصیل کے اُس چپراسی سے کچھ کم منہمک نہیں نظر آتے جس نے رسد کی بہم رسانی کے لیے تحصیل دار صاحب (رشتہ میں اُمیدوار چپراسی، غریب کسان اور مقروض زمیں دار کے" غریب پرور"، " دھرما اوتار"، " اَن داتا"، " تائی باپ") نے ہر قسم کی آزادی دے رکھی ہو۔ ان کی ظاہری وجاہت اور پوشش کو ان کے ماحول سے ایک خاص نسبت ہے۔ ان کی کئی اقسام ہیں۔ ایک بابو صاحب خود، یہ جنس عام ہے۔ دوسرے "پنڈت جی" ہوتے ہیں یہ قسم اب کم یاب ہے، تیسرے "منشی جی" ہیں کیا کہنا۔

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میری نطق نے بوسے مری زباں کے لیے [1]

ان کی ہیئت، ان کا کریکٹر، ان کے افعال واقوال، بجائے خود ایک مستقل بحث کے محتاج ہیں۔ خصوصاً "منشی جی" تو "بیوروکریسی" کی اُس منزل پر ہوتے ہیں جہاں سے ایک ہی جست یا قلابازی میں وہ پٹواری کے منصب جلیلہ پر ممتاز ہو جاتے ہیں۔ ان ہر سہ اقسام کی جبلت بھی

1 مرزا غالب۔

جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اس وقت ہم صرف ''بابوصاحب'' (نقطوں کی شمار اور ترتیب میں احتیاط لازمی ہے ورنہ آپ نہیں تو بابوصاحب کہیں سے کہیں پہنچ جائیں گے اور بابوصاحب کے الف ہوجانے کا بھی احتمال ہے) کے کریکٹر سے ناظرین کرام کو روشناس کرنا چاہتے ہیں۔ رہا ''پنڈت جی'' اور ''منشی جی'' کا سوال اس کے متعلق تو بس فی الحال۔

یار زندہ صحت باقی

پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اوّل تو اس امر کو بخوبی ذہن نشیں کر لینا چاہیے کہ محض ''بابو'' اور ''بابوصاحب'' میں بیّن فرق ہے۔ سب سے بڑی صفت جو اِن دونوں میں مابہ الامتیاز ہے وہ ایک طرف علم و مسکنت اور دوسرے طرف اشتداد و تمرّد کا ہے۔

بابو علم و مسکنت کا ایک گراں قدر اور وزنی نمونہ ہے اور ''بابوصاحب'' اشتداد و تمرّد'' کا ایک ہیبت ناک مجسمہ! ''بابو'' کے تخیل سے ہمارا خیال ایک ایسے پیکر انسانی کی طرف منتقل ہوتا ہے جو فطرتاً حلیم و بُردبار ہو، خلطِ بلغم اور اس سے زیادہ فطرت کی ستم ظریفیوں کا ڈھیلا ڈھالا پشتارہ جس کی حجم و ضخامت اور غصہ و عصبیت میں بعدالمشرقین ہو اگر یہ اپنے مخالف کے دراز دستیوں کا جواب ترکی بہ ترکی نہیں دے سکتا تو پھر اپنی مضحکہ انگیز زبان درازی کو پوری طاقت کے ساتھ برسرکار لاتا ہے۔ یہ ان تمام مواقع سے بچنا چاہتا ہے جس میں اسے اپنی حجم و ضخامت کو متحرک کرنا پڑے۔

لیکن برخلاف اس کے ''بابوصاحب'' وان ڈر گولٹز'' اور ''ہنڈنبرگ'' اسکول کا سند یافتہ ہوتا ہے۔ یہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنی پوری وحشیانہ طاقت اور درندگی کو برسرکار لاتا ہے اس کے لغتِ عمل میں صلح و آشتی یا ہمدردی و رواداری کا لفظ عنقا ہے۔ سفاکی و بے رحمی اس کے تیور سے نمایاں ہوتی ہے، لڑکوں سے خواہ فیس یا اس کا المضاعف وصول کرنا ہو یا ان سے ''پوری'' اور ''جگناتھ جی'' کا زادِ راہ یا سفر خرچ لینا ہو، یا امتحان میں شریک ہونے کی غرض سے نذرانہ حاصل کرنا ہو، یا ڈپٹی صاحب اور انسپکٹر صاحب کی ''خاطر تواضع'' منظور ہو، یا اس کی کسی عزیز کے یہاں شادی یا غمی کی تقریب ہو اور روپیہ یا آدمی کی ضرورت ہو، ہر صورت میں یہ اپنی کرخت اور ہولناک آواز ہی سے کام نہیں لیتا بلکہ اپنے مضبوط بانس کے ڈنڈے کی بھی مدد لیتا ہے یا پھر مجبوری کی

حالت میں، بشرطیکہ لڑکوں کی قسمت بھی اچھی ہو۔ اُس کھڑاؤں سے کام لیتا ہے جس کا جولاں گاہ یا تو گاؤں کی ناہموار زمین ہوتی ہے یا بے کس اور بے زبان معصوم بچوں کا سر ہوتا ہے، اور جس کے ایڑی کے گھسنے اور کھونٹی کے ڈھیلے ہونے کا ایک باعث یہ شرمناک "سرکوبی" بھی ہے۔

یہ ایک عجیب مغلوب الغیض ہستی ہے جس کے فیصلہ کی اپیل کہیں نہیں ہو سکتی۔ مدعی، جج اور جلاد یہ خود ہوتا ہے۔ اُن بچوں کی دماغی نشو ونما اور ارتقائے ذہنی کی کیا اُمید کی جاسکتی ہے جن کی تربیت کا ذمہ دار اس نیم وحشی شخص کا بے پناہ کھڑاؤں ہو۔ اس کے نزدیک ہر قسم کی ضرورت جو کسی معصوم بچے کو تعلیم وتربیت کی اس منزل پر ہو سکتی ہے صرف زدوکوب سے دی جاسکتی ہے اور اس طرح اس کے وجود کے ساتھ ایسی روایات وابستہ ہو جاتی ہیں کہ بچے اپنی ضرورتوں اور دقتوں کو اس کے سامنے دل میں بھی نہیں لاسکتے، اور اس طرح سے اس مضرّت ناک اور عافیت سوز ماحول کے پائیدار اثرات ہر وقت اور ہر ساعت بچوں کے دلوں پر نقش ہوتے رہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ جیسا کچھ ہو سکتا ہے ظاہر ہے!

....

بہر حال گاؤں کے اس اسکول میں آج ڈپٹی صاحب تشریف لانے والے ہیں صفائی کا انتظام جو کچھ کیا گیا ہے اس کا تذکرہ ہم مجملاً ابھی ابھی کر چکے ہیں۔ بابو صاحب اور دیگر لڑکے اور لواحقین ہر قسم کے کاروبار میں (سوائے لکھنے پڑھنے کے) منہمک ہیں اور اسی صلہ میں آج اسکول میں تعطیل دی گئی ہے۔ اس میں تو شک ہی نہیں کہ لڑکوں یا طالب علموں کو (اس میں اسکول یا کالج کی بھی تخصیص نہیں ہے) صرف تعطیل کی اُمید دلا دیجیے پھر دیکھیے وہ کیا کیا نہیں کر گزرتے۔ بڑے بڑے خطیب اور جادو بیاں اپنے دلائل اور براہین (جن میں جذبات کو اپیل کرنا بھی خصوصیت کے ساتھ شامل ہے) سے وہ کام نہیں نکال سکتے جو صرف ایک فقرہ یا اشارہ سے نکل سکتا ہے یعنی طالب علموں کو نوشت وخواند سے ترک تعلق کی اُمید دلانا۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو بر سبیل تذکرہ عرض کر دیا گیا۔

غرض کہ ڈپٹی صاحب دوسرے روز اسکول کے معائنہ کے لیے تشریف لانے والے ہیں، آج ہی تمام کام ختم کر دیا گیا ہے اور لڑکوں سے تاکید کر دی گئی ہے کہ اگلے دن علی الصباح

اسکول پہنچ جائیں، کپڑے صاف پہن کر اسکول آئیں۔ کتابوں اور نوشت و خواند کے دیگر لوازمات کے علاوہ جسے جو توفیق ہو وہی نہیں بلکہ شرائط (صلح نامہ) کی رو سے اور بھی بہت سی چیزیں اپنے اپنے گھروں سے "ڈپٹی صاحب ریلیف فنڈ" کے لیے لیتے آئیں ورنہ پھر بابو صاحب کے پیر کی عزت (کھڑاؤں) ہاتھ میں ہوگی اور زبان ان کے بس میں! یہ وہ اعلانِ جنگ تھا جس میں مہلت کی کوئی گنجائش نہ تھی!!

....

صبح ہوئی، اسکول کا وقت دس بجے دن کا ہے، لیکن بابو صاحب کے پہنائے خیال میں ڈپٹی صاحب کا بھوت کچھ اس طرح سے گشت لگا تا رہا ہے کہ علی الصباح اسکول پہنچ گئے۔ تمام رجسٹر اور کاغذات درست کر دیے گئے ہیں، رجسٹروں پر نئی ابریاں چڑھا دی گئی ہیں۔ ان پر خوش خط نام لکھے گئے ہیں اور سب چیزیں نہایت قرینہ اور ضابطہ سے میزوں پر یا الماریوں میں لگا دی گئی ہیں۔ ہر طرف پاکیزگی اور صفائی نظر آ رہی ہے۔

اب آفتاب رفتہ رفتہ بلند ہونے لگا ہے۔ تمام لڑکے اپنے اپنے گھروں سے سفید کرتے اور میلی دھوتی یا میلے کرتے اور سفید دھوتی پہن کر اسکول چلے آ رہے ہیں۔ ہر ایک کے پاس سرکنڈے کے ایک ایک درجن تازے بنے ہوئے قلم موجود ہیں، دوات بھی نئی ہے اور روشنائی بھی تازی اور بسا اوقات خانہ ساز۔ بغل میں سفید یا بادامی کاغذ کا ایک ایک پلندہ بستہ نہایت صفائی کے ساتھ بندھا ہوا گلے میں حمائل!

لڑکے ایک ایک کر کے جمع ہونے لگے اور چوں کہ زندگی میں اس قسم کی صفائی کے موقعے "بہ ثباتِ ہوش و حواس" نہیں بلکہ "بہ ثباتِ جان" کم ملتے تھے اس لیے ہر ایک لڑکا اپنے اپنے کپڑے بچانے کی فکر میں ٹاٹ پر اس طرح سے بیٹھا ہوا تھا کہ کپڑے کا کوئی حصہ سطح فرش سے نہ لگ سکے۔ سب نے اپنے اپنے بستے سامنے رکھ دیے ہیں پہلو میں دوات رکھی گئی اور دوسری طرف قلموں کا ترکش کھڑا کر دیا گیا۔ یہ سین اکثر پولیس لائن یا پولیس اسٹیشنوں میں نظر آتا ہے۔ جب ہر سپاہی یا رنگروٹ اپنے اپنے سامان لائن انسپکٹر یا سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ملاحظہ کے لیے نکال کر قرینہ سے رکھ دیتا ہے۔

اب بابوصاحب کے چہرہ پر تردّد کے آثار پیدا ہونے لگے ہیں۔ انھیں خاص خاص لڑکوں کا خصوصیت کے ساتھ انتظار ہے۔ بارے خدا خدا کر کے ایک لڑکا دور سے نظر آیا، جس کے سر پر لکڑیوں اور اُپلوں کا گٹھا رکھا ہوا تھا۔ دیر ہو جانے سے کارگزاری کا مسئلہ تو ختم ہو چکا تھا۔ بابوصاحب کے عتاب کا پارہ البتہ بانسوں اُچھل رہا تھا کہ دوسرا لڑکا ہاتھ میں ایک لوٹا لٹکائے ہوئے بہت دور پر نظر آیا، اب بابوصاحب کے جان میں جان آئی، لیکن اس تردّد اور تفکر نے انتقام کے جذبہ کو اور مشتعل کر دیا تھا۔ ابھی بے چارہ دور ہی تھا کہ بابوصاحب نے چیخ کر دو چار صلواتیں سنائیں اور ''بقیہ آئندہ'' کے سلسلہ میں یہ دھمکی بھی دے دی کہ ڈپٹی صاحب خیریت سے ''جاتے رہیں'' تو بس گردن ہی ناپنے کا سامان کیا جائے گا۔ لیکن بایں ہمہ دونوں بے گناہوں کو پاس بلا کر ''نیکی بر باد گناہ لازم'' کا فلسفہ بھی ذہن میں نہیں تو جسم کے اوپر منقش کر دیا۔ کچھ زبانی فہمائش بھی کر دی، لیکن اس دوران میں اُن کا ''رفیقِ زندگی''، ''کھڑاؤں'' خلافِ اُمید بابوصاحب کا منہ ہی تکتا رہ گیا۔ اتنے میں ایک تیسرا لڑکا ایک بڑا ٹوکرہ سر پر رکھے ہوئے ہانپتا کانپتا آموجود ہوا جس میں ہر قسم کی جنس ترکاری اور ''مقویات'' موجود تھیں، لیکن اسی سلسلہ میں کسی لڑکے نے یہ خبر پہنچائی کہ ڈپٹی صاحب آ گئے، بابوصاحب نے دوڑ کر پگڑی اپنے سر پر رکھی، گو اس سے قبل یہ ''سرگرانی'' وبالِ دوش نہیں ہوئی تھی۔ کھڑاؤں سے گلوخلاصی حاصل کر کے ایک سفید موزہ پہنا جس کی ایڑی تلوؤں کے بیچ تک آ کر رہ گئی تھی اور سب سے اوپر کا کنارہ ٹخنوں تک آ گیا تھا۔ تیل دیا ہوا جوتا جس میں کھلی بھی موجود تھی، زیبِ تن یا زیبِ پا کیا! اس جوتے کو اسی گاؤں کے ایک بدمزاج موچی نے تیار کیا تھا اور قیمت ادا کرتے وقت جب معاملات نے نہایت نازک صورت اختیار کی اور ضرورت تو ایجاد کی ماں پہلے ہی سے کہلاتی تھی قریب تھا کہ جوتے کے جائز مصرف کے علاوہ کوئی اور جدید طریقہ استعمال عمل میں آتا، لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ لیکن اس کی قیمت بابوصاحب کی طرف سے ''جان کا صدقہ مال'' کے سلسلہ میں ایک ایسے لڑکے کی قسمت میں جا پڑی جسے امتحان میں یہ نہیں معلوم ہوا تھا کہ وہ کامیاب ہوا یا ناکامیاب۔ کیوں کہ بابوصاحب بغیر کسی ''پوجا'' کے لڑکوں کا نتیجہ امتحان ظاہر نہیں کرتے تھے۔ غرض کہ اب بابوصاحب نئے جوتے میں قدم چل رہے تھے، اسکول سے باہر نکل کر، مہوہ کے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر

ڈپٹی صاحب کا انتظار کرنے لگے۔ کہیں اتفاق وقت سے ٹھیک اُن کے سر کے اوپر ایک ڈالی پر کوئی تھکا ماندہ کوا بیٹھا ہوا تھا۔ حوائج ضروریہ کے سلسلہ میں اُس نے بابو صاحب کی عظیم الشان ہستی کا احساس نہیں کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ بابو صاحب کی پگڑی اور زنخداں کے بیچ میں ایک خطِ مستقیم سفید لیس دار مادّہ کا بن گیا جس میں ناک کا بانسہ اور لب و دہن سب شامل تھے۔ اس بلائے ناگہانی کا پہلا اثر یہ ہوا کہ بابو صاحب نے فوراً اوپر نظر کر کے گالیاں دینی شروع کیں، کوّے نے بھی کچھ گفت وشنید شروع کی، لیکن بابو صاحب کو معلوم ہوگیا کہ اس حرکت اضطراری میں "تحفۂ طائر" دہن مبارک کی آڑ پکڑنے لگا تھا۔ جلدی سے پگڑی اُتاری اور اسے دونوں ہاتھوں میں لے کر ایک طرف دھوتی پر مل کر صاف کرلیا۔ صفائی میں اب محض نقلِ مکان کی تفریق ہوگئی تھی ورنہ وزن اور وسعت میں کوئی تخفیف نہیں ہوئی۔

رفتہ رفتہ ایک چھکڑا گاڑی قریب آئی جس پر ڈپٹی صاحب کا ہم جلیس، پرائیویٹ سکریٹری، چیمبرلین یا باورچی یا جاروب کش، چپراسی مع اپنے تمام خیمہ خرگاہ کے بیٹھا ہوا تھا۔ بابو صاحب نے اوّل تو چپراسی کو جھک کر سلام کیا۔ اُس نے سمجھا گاؤں کا کوئی سادہ لوح دیہقانی ہے یا رنگون یا کلکتہ سے واپس شدہ کوئلہ جھونکنے والا مزدور۔ غرض کہ انھیں بیرنگ ہی رکھا، انھیں اتنی ہمت کہاں کہ بڑھ کر ڈپٹی صاحب وغیرہ کے متعلق کچھ دریافت کرتے۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کوئی لڑکا بھی نظر نہ آیا کہ اسی سے اس معاملہ میں مشورہ یا امداد لیتے، لیکن یہ اور معلوم ہوگیا تھا کہ دور سے طالب علموں کا جھرمٹ اس تماشا کو دیکھ رہا ہے، جی کڑا کر کے بڑھے اور چپراسی سے دریافت کیا کہ گاڑی کس کی ہے۔ اس نے منہ لگانے سے اغماض کیا، لیکن یہ اب گاڑی بان کی طرف اس نظر سے دیکھنے لگے گویا وہی مخاطب تھا۔ لیکن اُسے یہ دماغ کہ بھلا ڈپٹی صاحب کا گاڑی بان ہو کر اس آسانی کے ساتھ جواب دے دے! اور وہ بھی اس حالت میں جب وہ انھیں کے دائرہ حکومت میں آگیا ہو، اُس نے بھی مخاطب ہونے سے احتراز کیا۔ بابو صاحب کو اپنی اہمیت جتلانے پر اصرار تھا، اب کی بار جی پر کھیل کر تجدید سوال کی اور گاڑی کے ساتھ ساتھ ہولیے۔ گاڑی بان چپراسی سے گفتگو کرنے میں مشغول تھا یہ تھے کہ بلائے بے درماں کی طرح چمٹ گئے۔ چپراسی نے ان کی جسارت کا احساس کیا تو ایک ڈانٹ بتائی۔ یہ بے چارے اس آفت کے لیے کب تیار تھے

کچھ ایسے جھٹکے کہ بگڑی گر کر پہیے کے دُھرے میں آ گئی۔ گھبرا کر اُٹھانے والے ہی تھے کہ پاؤں کا پنجہ پہیے کے نیچے آ گیا۔ گاڑی ذرا رُک کر صاف اُتر گئی، اُنگلیوں کا کچومر نکل آیا اور خود تلملا ہی نہیں بلکہ بلبلا اُٹھے اور معاذ مین ناپنے لگے۔ دور سے لڑکوں نے بابو صاحب کی یہ حالت دیکھی تو سمجھے کہ چپراسی نے دست درازی کی سب کے سب دوڑ کر پہنچے، تھوڑے ہی دیر میں ڈپٹی صاحب بھی گدڑی سے حال ہی میں خریدی ہوئی سائیکل پر سوار جس کے مڈگارڈ سے ایک مستقل گھنٹی کا کام لے رہے تھے آ گئے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ گھنٹی خاص خاص اوقات میں بجائی جاتی ہے، ان کی ایجاد ہر لحظہ اور ہر لحہ آیند روندگان کو اپنے مقدس بوجھ کی گراں باری کا گلہ گلا پھاڑ پھاڑ کر سنائی جاتی تھی۔ پیچھے کتابوں کا ایک بستہ بندھا ہوا تھا اور سامنے آموں کی ایک گٹھری تھی جس میں کوئی دو آم ایک قسم کے نہ تھے۔ اس کے اسباب وعلل پر زیادہ بحث کی گنجائش یوں نہیں ہے کہ ڈپٹی صاحب اس شعر کے بصدقِ دل اور بطیبِ خاطر قائل تھے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے [1]

ڈپٹی صاحب نے بابو صاحب کو اس حال میں دیکھا تو پہلے تو یہ سمجھے کہ "دم سادھے" ہوئے ہے کیوں کہ بابو صاحب شدت کرب سے بے ہوش ہو گئے تھے دو ایک جھڑکیاں دیں، لیکن یہاں تو

آنکھیں تو کھلی رہ گئیں پر مر گئی بکری

کا قصہ ہو رہا تھا۔ لڑکے لاد پھاند کر انھیں اسکول لائے اور جب کچھ دیر کے بعد ہوش آیا تو ڈپٹی صاحب کو مسلط پایا۔

غشی میں شاید حضرت عزرائیل سے دوچار ہو چکے تھے۔ بیداری میں بھی وہی خیال قائم تھا، سمجھے کہ گلوخلاصی نہیں ہوئی ہے گڑگڑا کر ڈپٹی صاحب کو عزرائیل سمجھ کر کہنے لگے۔ "ہمیں چھوڑ دو، ہم بڑے غریب ہیں ڈپٹی صاحب کو اس دفعہ لے جاتے، ہماری خبر دوسری دفعہ لے لینا۔"

---

[1] آتش لکھنوی۔

ڈپٹی صاحب یہ سمجھے کہ بغیر کچھ خاطر مدارات کیے ہوئے مجھے خشک ہی ٹالنا چاہتا ہے اور ایسی حالت میں جب انھوں نے اسی اُمید پر پچھلی شب سے اپنے اوپر کھانا پینا حرام کرلیا تھا، یہ بات نہایت اُمید شکن اور جاں گسل معلوم ہوئی۔

ضابطہ کی آڑ پکڑ کے کہنے لگے۔ ''ہم کبھی نہ جائیں گے، جب تک کہ اسکول کا معائنہ بالکل ختم نہ ہوجائے۔'' ان الفاظ نے بابو صاحب کے طلسمی توہمات کو بالکل توڑ دیا اور اب انھیں معلوم ہوا کہ

یک نہ شد دو شد

کے کیا معنی ہوتے ہیں۔

غرض کہ کچھ عرصہ کے بعد بابو صاحب کے حواس درست ہوئے۔ معائنہ شروع ہوا۔ صفائی نامکمل، رجسٹر گندے اور غلط، لڑکے تعلیم میں کمزور، اسٹاف نا قابل، غرض کہ بھوکے، ڈپٹی صاحب کے نزدیک تمام نقائص ہی نقائص موجود تھے۔ لیکن بابو صاحب بھی تو آخر ''گرگ باراں دیدہ'' تھے موقع تاڑ گئے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگے ''کرپاندھان! دھوپ میں چل کر آئے ہیں، کچھ ''جل پانی'' ہوجائے تو ''آنند'' سے معائنہ کریں۔''

ڈپٹی صاحب نے اب دیکھا کہ معاملات روبہ اصلاح ہیں پہلے تو کچھ استغنا ظاہر کرتے رہے، لیکن وہ بھی تو آخر انھیں ہتھ کنڈوں کی روٹی کھاتے تھے۔ کچھ ناک بھوں چڑھا کر خاموش ہوگئے، اور کچھ ہی دیر کے بعد مسکرانے اور بے تکلفی کی ضرورت محسوس کرنے لگے تو ازراہ ہمدردی بابو صاحب کی مزاج پرسی فرمائی۔ بابو صاحب اپنی ''گشل تھیم'' بتلاتے جاتے تھے، ادھر ڈپٹی صاحب کن انکھیوں سے یہ بھی دیکھتے جاتے تھے کہ ان کے خیمہ میں بابو صاحب کے کن کن آدمیوں کی آمد و رفت تھی اور یہ لوگ کس قسم کی چیزیں لے کر آ جا رہے تھے۔ بارے کچھ مسکرا کر کچھ جمائی اور انگڑائی لے کر ڈپٹی صاحب نے معائنہ کا وقت ٹالا اور اپنی فرودگاہ پر واپس آ گئے۔ بابو صاحب وغیرہ واپس کیے گئے۔ کچھ دور تک تو بابو صاحب لنگڑاتے اور نہایت تکلیف کے ساتھ چلتے رہے، لیکن ڈپٹی صاحب کی نظر سے اُوجھل ہوکر آرام سے مکان پہنچے۔ چپراسی کو بلا کر سب سے پہلا سوال ڈپٹی صاحب نے یہ کیا کہ کیا کیا چیزیں اب تک وصول ہوچکی تھیں۔ چپراسی نے

تمام چیزیں لاکر سامنے رکھ دیں جس میں سے نصف چیزیں وہ پہلے ہی غائب کر چکا تھا۔ دودھ، دہی، گھی، پوریاں، مٹھائی، ترکاری، اچار، مربّے غرض کہ ہر قسم کی چیزیں بہ کثرت موجود تھیں۔ پہلے تو ڈپٹی صاحب نے خوب دادِ شجاعت دی اس کے بعد چپراسی کو یہ حکم دیا کہ تمام چیزیں مقفل کردے اور اپنا کھانا بابو صاحب سے علاحدہ جاکر لے لے۔ تھوڑی دیر تک تو ڈپٹی صاحب نے آرام فرمایا، لیکن خواب میں پوریوں اور مٹھائیوں کا خیال کچھ ایسا غالب رہا کہ اُٹھنے پر بھی ڈپٹی صاحب کے دماغ میں اسکول اور بابو صاحب کے خیال کے ساتھ ان اغذیہ کا دھیان بھی برابر جاگزیں رہا۔

شام قریب ہونے کو آئی تو ڈپٹی صاحب نے اسکول کا رُخ کیا۔ بابو صاحب نے پہلے ہی سے تمام لڑکوں کو درست کر رکھا تھا اور گو اس سے قبل کئی بار تمام لڑکے حوائج ضروریہ سے فارغ ہو چکے تھے، لیکن جب بابو صاحب نے فرمایا کہ اب امتحان شروع ہونے والا ہے اور جس کسی کو حوائج ضروریہ سے فراغت حاصل کرنی ہو وہ کر سکتا ہے تو تمام کلاس یک بہ یک سامنے کے کھیت میں پرا جمائے ہوئے بیٹھا تھا!

لیکن یہ بات کچھ دہقانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ پچھلے سال ہم نے الٰہ آباد میں سینٹ ہال جاتے وقت بچشم خود مشاہدہ کیا ہے کہ اگر اتفاق سے کسی ایک شخص نے پیشاب کرنے کا ارادہ کیا تو پھر جتنے لوگ گزرتے سب کے سب تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر اسی شغل کے لیے بیٹھتے چلے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ جس وقت کا تذکرہ ہم کر رہے ہیں اس وقت سڑک کے دونوں طرف کم سے کم دو درجن حضرات بسلسلۂ تفریح یا ضرورت عالم استغراق میں بیٹھے ہوئے تھے، اور اس مشغلہ کے لیے وہ کم سے کم دس قدم سے تیار ہوتے جاتے تھے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس تہذیب اور شائستگی کے دور میں یہ حرکات کہاں تک پسندیدہ خیال کی جا سکتی ہیں۔

بہر حال لڑکوں نے اپنا یہ مشغلہ بھی ختم کیا، ڈپٹی صاحب نے جو اغذیہ لطیف دوپہر میں تناول فرمائی تھیں وہ ہضم سوم میں نہیں پہنچی تھیں اور پھر انھیں سے شام کو واصل بحق ہونے کا بھی وعدہ تھا۔ اب امتحان کے دردسری سے کیا واسطہ، ایسی حالت میں بابو صاحب، مختار مطلق بنائے جاتے ہیں۔ بابو صاحب ٹھہرے ''آٹھوں گانٹھ کمیت'' وہی سوالات معرضِ بحث میں لائے جو وہ

طلبا کو سینکڑوں بار ذہن نشیں کرا چکے ہیں۔ اردو ہندی کا مسئلہ بھی طے ہو جاتا ہے۔ امتحان انفصام کو پہنچتا ہے اور ڈپٹی صاحب پھر فرودگاہ پر واپس آتے ہیں۔

ان کے بعد بابو صاحب بازدید کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور معائنہ لکھنے کا وقت آتا ہے۔ یہ وقت نہایت نازک ہوتا ہے اور ایسی حالت میں اکثر ع

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے میں

کا انجام آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ڈپٹی صاحب اخلاقاً کھانے اور رسد مثلاً گھی، چنا، گیہوں وغیرہ کی تعریف کرتے ہیں۔ اگر بابو صاحب نے اشارہ کو سمجھنے میں تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا یا ڈپٹی صاحب نے بروقت تاڑ لیا کہ معاملہ کچھ ''یوں ہی سا'' رہا جاتا ہے تو فوراً فرمائش کر دی کہ اتنی اتنی چیزیں دوسرے پڑاؤ پر پہنچ جائیں اور معائنہ بک بھی وہیں لکھی جائے گی۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بابو صاحب یہ سب تاوان لے کر حاضر ہوتے ہیں اور ڈپٹی صاحب کو جب یہ یقین ہو جاتا ہے کہ قیمت وغیرہ کا تقاضا بالکل ناممکن ہے اس وقت معائنہ لکھ کر دے دیتے ہیں اور بابو صاحب نفع نقصان برابر کر کے واپس آجاتے ہیں۔

....

غور کرنے کی بات ہے، جس ملک و قوم کا تعلیمی نظام یہ ہو، اور جس حاکم و محکوم کا اخلاق اس قدر پست ہو وہاں تعلیم کس پایہ کی ہوگی۔

آہ! عاقبت اندیشی اور علو ہمتی کا فقدان ہماری قوم میں کیسا عبرت ناک ہے!

(مطبوعہ: علی گڑھ میگزین۔ نومبر-دسمبر 1920)

●●●

آل انڈیا مینڈک کانفرنس

جون کا موسم، آسمان کوہِ آتش ریز، زمین کرۂ نار، روئیدگی عنقا، برودت نایاب اور تازگی

معدوم فضائے عالم فطرت کا دامن آتشیں تھا یا انیس کی آتش نوائی

پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

ایک شعلۂ جوالہ!

لیکن ہاں غور سے دیکھنا ہائے ابر دوشِ نیلی فام پر

''پھر عناں تاب ہیں سوئے حجاز''

چشمِ زدن میں ''مہر عالم تاب کا منظر'' بند ہوتا ہے، ہوائیں چلتی ہیں روح پرور اور نشاط انگیز، بوندیں پڑتی ہیں ایک ایک دو، بادل گرجتا ہے اور ہوا کا ایک جھونکا پھُریریاں لیتا ہوا اس سے نکل جاتا ہے۔ بوندیں تیز ہوتی ہیں اور یکا یک رُک جاتی ہیں۔ معاً بڑے بڑے قطروں کا آبشار گرنے لگتا ہے۔ چند لمحوں تک درختوں کے پتوں اور شاخوں، عمارات کی دیوار اور چھتوں اور کھلی ہوئی زمین کے چپہ چپہ سے کچھ کچھ گرد اُٹھتی ہے گویا آنے والے مہمانوں کا خیر مقدم ادا کرتی ہے اور پھر اُن کے ساتھ آغوش زمین میں چھپ جاتی ہے۔ دیکھتے دیکھتے جل تھل ہو جاتا ہے۔ رندانِ شعلہ آشام۔

بادہ نوشی ہے بادپیائی [1]

---

1 پورا شعر: ہے ہوا میں شراب کی تاثیر + بادہ نوشی ہے بادہ پیائی — غالب

کہتے ہوئے نکلتے ہیں۔

شام ہونے کو آئی، آفتاب لب بام ہے، شفق پھولنے لگی ہے۔ خسرو خاور سنبھالا لیتا ہوا دریچہ مغرب کے زرنگار پردوں میں داخل ہوتا ہے اور کبھی کبھی اپنی سلطنت گذشتنی و گذاشتنی کو مُڑمُڑ کر دیکھتا جاتا ہے۔ وہ دیکھنا مرصّع تابوت بادلوں کی آخری گرج پر ہچکولے کھاتا ہوا وادیِ تاریک میں پہنچ جاتا ہے۔

آسمان پر تارے بکھرنے لگے تھے، ماہ تاب کسی دوشیزہ کی طرح افق مشرق سے، بڑے بڑے درختوں کی آڑ سے جھانکتا، جھجکتا، شرماتا اور مسکراتا بلند ہو رہا تھا۔ ہر چہار طرف قلزم حیات میں سکوت و انجماد محسوس ہوتا تھا۔

....

نربدا کے کنارے ایک کنکریلے غار میں آج مینڈکوں کی کانفرنس منعقد ہونے والی ہے۔ ہندوستان کے ہر گوشے اور ہر چشمے سے اراکین اور نمائندوں کی جماعت جوق جوق آئی ہے۔ کچھ مینڈک سات سمندر پار سے بھی آئے ہیں۔ پنڈال میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے۔ ڈائس کے سامنے پریس کے نمائندے پراجمائے بیٹھے ہیں۔ داہنے طرف صنفِ نازک (جن کی ذات کے ساتھ زکام، کا تخیل وابستہ ہے) کے لیے جگہ مخصوص ہے۔ تھوڑی دیر میں پریسیڈنٹ کی آمد کا غلغلہ ہوا، ہر چہار طرف سے غوغائے غوکاں بلند ہوا۔ رفتہ رفتہ یہ ہنگامہ فرو ہوا۔ استقبالیہ کمیٹی نے خیر مقدم کیا۔ پریسیڈنٹ کا انتخاب عمل میں آیا۔ پیر کہن سال کرسی صدارت پر (اُکڑوں) جلوہ افروز ہوئے، اور اپنا خطبہ صدارت پڑھنا شروع کیا۔

برادرانِ وطن، عزیزانِ ملت اور دیگر حضرات!

ہمارے عزیز دوست.......نے میری خدمات دیرینہ کا جن درخشاں الفاظ میں ذکر کیا ہے اس کا احساس مجھے بدرجۂ اتم ہوا ہے اور آپ یقین فرمائیں، میں اپنے کو فی الحقیقت اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ جب آپ کا رقعۂ دعوت پہلے پہل میرے پاس پہنچا ہے اُس وقت میرے ذہن میں یہ آیا کہ میں آپ کی دعوت شکریہ کے ساتھ واپس کردوں۔ کیوں کہ آپ جانتے ہیں ہماری نوع کا محشرستانِ خیال ایک پُرمسرّت، تاریک اور نمناک گوشۂ تنہائی ہوتا ہے اور ہمارا زاویۂ نظر فطرتاً اسی

کلبۂ احزاں تک محدود ہوتا ہے، اور پھر میں خود اس دور کش مکش میں خصوصیت کے ساتھ عزلت گزیں رہا۔ آپ مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں اپنے خیالات کے ادا کرنے میں حروف حلقی کا جا و بے جا طور پر استعمال کر جاؤں۔ کیوں کہ یہ ہماری فطرت ثانی ہے اور آج تمام دنیا میں اسی کا غلغلہ مچ رہا ہے۔ ہر فرد اپنی آواز کو منارہ کی بلندیوں سے (بہ بانگِ دہل) دوسروں کے پردۂ گوش تک انتہائی بلند آہنگی کے ساتھ پہنچا سکتا ہے اور بہ ایں ہمہ تعزیراتِ ہند کی اُن دفعات سے پنبہ در گوش بھی رہ سکتا ہے جو ضرب شدید کے تحت میں آتے ہیں، یا جو معمولی حالت میں ہمیشہ کے لیے گلوگیر کردی جاتیں۔ لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ ملک وملت کو میری ناچیز خدمت کی ضرورت ہے اور مجھے اس کے خلاف کوئی لفظ عذر و معذرت کا زبان پر نہیں لانا چاہیے، اس لیے میں نے فرصت کے پہلے لمحات میں آپ کا نوید دعوت قبول کرلیا۔

حضرات مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے میری انتہائی عزت افزائی فرمائی ہے۔ درآں حال کہ میں اس کا کسی طرح اہل نہ تھا اور ہمارے دیگر بزرگانِ وطن اس عظیم الشان فرض کو بہ طریق احسن پورا کرسکتے تھے۔ آج سے پہلے کبھی ہم اس تعداد میں جمع نہیں ہوئے تھے اور تبادلۂ خیالات کا اس سے بہتر موقع نہیں حاصل ہوا تھا۔ اب تک بیش تر ہم ایک دوسرے سے پوشیدہ محض ایک دوسرے کی آواز پر صدائے لبیک بلند کیا کرتے تھے۔

دریا کا کوئی سنسان کنارہ ہو، یا دامنِ کوہ میں کوئی تاریک غار، منہدم مکانات کا کوئی ویران اور نم ناک گوشہ ہو، یا کسی بانس کی کھونٹیوں کا ایک تاریک جھنڈ، آبادی سے دور کسی خشک جھاڑی کے خاردار دامن کے نیچے کوئی اندھا کنواں ہو جس میں جنگلی کبوتروں کی ہمسائیگی نصیب ہو یا کسی تالاب کے کنارہ کا ایک کنکریلا ٹیلہ جس کو موجیں ہر لحہ چھوتی ہوں، کسی سائنس لیبورٹری کا وہ مختصر چہ بچہ ہو جس میں ہمیں سزائے موت سے پہلے حبسِ دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا بھگتنی ہو یا حاجی بغلول کی وہ گڑھیا جہاں اپنی گوالن معشوق کی یاد میں مرحوم الاپتے تھے۔

ہوئے مر کے ہم جو رُسوا، ہوئے کیوں نہ در گڑھیا
وہیں رہتے مثلِ مینڈک وہیں عائیں عائیں کرتے [1]

---

1 یہ غالب کے درج ذیل شعر کی مزاحیہ تحریف ہے:

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا + نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا ہے   غالب

ہیر ہیر ٹرٹرٹرررر ....ٹرٹرٹرررر.................ٹرٹرٹرررر برسات کے پہلے چھینٹوں سے ہمارے ''قومی ہفتہ'' کی ابتدا ہوتی ہے۔

حضرات! اگر آپ اجازت دیں تو میں کانفرنس کے مقاصد اور نصب العین کو ذرا شرح و بسط کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کروں۔ اب تک ہم لوگ اصلی معنوں میں ''کنویں کے مینڈک'' رہے، گو بیداری کے علامات کسی قدر اب پیدا ہو چلے ہیں۔ ہم اس بے رحم اور برخود غلط قوم کی طرح جسے انسان کہتے ہیں اور جو بزعمِ خود اپنے کو اشرف المخلوقات کہتا ہے، اپنے معائب اور کمزوریوں کو ہرزہ سرائیوں کے طوفانِ تکلم سے چھپانا نہیں چاہتے۔ غور تو کیجیے خدا کی کائنات کی تکمیل کے لیے جن جن خوبیوں کا مظہر وہ اپنے کو بتلاتا ہے کیا وہ ہم میں موجود نہیں ہیں۔ آنکھ، ناک، ہاتھ، پاؤں، دل و دماغ کیا چیز ہے جو ہم میں مشترک نہیں ہے کیا آپ نے اس عجیب الخلقت ہستی کی عجیب تر منطق پر بھی کبھی غور کیا ہے۔ ان کے شعرا اور فلاسفروں کی حالت کا اندازہ کیجیے، ان کے علم و عمل، خصائل اور جبلت، اخلاق و محاسن، عزم و استقلال، تمدن و معاشرت پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ انھیں اپنے جن جن کارناموں پر ناز ہے وہ فی الحقیقت مغالطات کا ایک بحرِ بے پایاں ہے جس میں یہ غوطے کھا رہے ہیں۔ کوئی کشتی کا متلاشی ہے تو کوئی ساحل سے ناآشنا۔ ایک گروہ ایسا ہے جو خدا کی ہستی کا قائل ہے دوسرا اس سے منکر، ایک حسن و عشق پر جان دیتا ہے، دوسرا اس سے متنفر، ایک امن و عافیت کے لیے آسمان و زمین سر پر اُٹھا لیتا ہے تو دوسرا جنگ و غارت گری کے لیے آسمان و زمین کے قلابے ملا دیتا ہے، ایک ترکِ دنیا اور ترکِ لذات کے لیے گوشہ نشیں ہے تو دوسرا حظِ نفس اور عیش و عشرت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیتا ہے۔ ستم ظریفی تو دیکھیے ان میں سے اگر ایک نان کوآپریشن، کا حامی ہے تو دوسرا صرف کوآپریشن کا دلدادہ!

شرم شرم ٹرٹر ٹرر .... ٹرٹرٹررر .... ٹرٹر

ان حضرات انسان کو اپنی ذہنی اور دماغی قوتوں پر بڑا ناز ہے، لیکن کیا کبھی آپ نے ان کے فلاسفروں اور شاعروں کے حالات پر بھی غور کیا ہے۔ ان میں دو بڑی مشہور ہستیاں گزر گئی ہیں جن کی تعلیم کا لبِ لباب یہ ہے،

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے[1]

کیوں حضرات کیا ہم بھی اُنھیں میں سے ہیں جو تقلید پرستی کے طلسم میں گرفتار ہو کر آمنا وصدقنا کہنے پر تیار ہو جائیں گے۔

ٹرٹر......نہیں نہیں......ٹرٹر.........ہرگز نہیں.......ٹرٹرٹرر

کوئی ان سے دریافت کرے کہ عالم کے حلقۂ دام خیال ہونے سے عالم کے وجود میں کون سا فرق آ گیا ہستی اگر تسلیم کر لی جائے تو پھر فریب کیسا۔ لیکن برادرانِ ملت یہ نوع انسانی شاعر کے نام سے موسوم ہے جنھیں ہر قسم کے بے تکے پن کا لائسنس مل گیا ہے۔ آپ نے ان کے معشوقوں کو بھی دیکھا ہے۔

ٹرٹر......ضرور........ضرور........(ایک آواز "حاجی بغلول کا معشوق") ٹرٹر، ٹرٹر یہ دو پاؤں والا عجیب الخلقت جانور اپنے معشوق کی نوک و پلک اور ہر ادا کو تیر ونشتر سمجھتا ہے اور یہی نہیں بلکہ اس سے مجروح ہونے پر ناز بھی کرتا ہے اور شکوے بھی! ایک ہم ہیں کہ محبوب (داہنے طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے، کھانس کر مسکراتے ہوئے) بھی رکھتے ہیں اور اس قسم کے تیر ونشتر سے بھی آزاد! اور اگر تیر ونشتر کوئی چیز ہو بھی سکتی ہے تو ہم اور ہماری دل نواز برابر کے شریک ہیں، لیکن پھر یہ تو نہیں کرتے کہ زخم کھا کر بھی شکوہ کریں اور محفوظ رہنے پر صدائے شیون بھی بلند کریں۔ لیکن ایک امر جس کی طرف ہم گورنمنٹ کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں اور اگر گورنمنٹ کو اس کی فرصت نہیں ہے تو پھر ہم اپنی ہمسایہ قوم سے یہ درخواست کرتے ہیں (اس کے جذبات سے خصوصاً) کہ وہ آئندہ سے "بیالوجی" کلاس کا سد باب کر دے۔ آج کل، میں نے سنا ہے کہ تمام کالج اور یونیورسٹیاں "قومی" بنائی جا رہی ہیں، اس سے جو فوائد مترتب ہونے والے ہیں اس میں ایک یہ بھی ہے کہ ہم آئندہ سے اپنا تعلیمی نصاب بنا سکیں گے یا موجودہ نصاب سے قطع تعلق کر لیں گے، تو کیا اس مہتم بالشان موقع پر ہم اربابِ حل وعقد سے درخواست کر سکتے ہیں کہ وہ آئندہ سے دوسروں کے جذبات کی تحریم کریں یا نہ کریں، ہماری جان تو بخش دیں۔

---

1 پورا شعر اس طرح ہے:

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد + عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے   غالب

مشکل تو یہ آن پڑی ہے کہ ہماری جان کے خواہاں وہ پیر فرتوت نہیں ہیں جو ہمیں فنا کے گھاٹ اُتارتے ہوئے زبان حال سے یہ بھی کہتے جاتے ہوں۔

آج تم کل ہماری باری ہے۔[1]

دقت تو یہ ہے کہ بچوں اور طالب علموں کی نوخیز نسل نے ہمیں تاک رکھا ہے جنھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ہماری موت میں حسن و خوبی کے کیا کیا پہلو پیدا ہو سکتے ہیں۔ ہم مرنے کو تو مر جاتے ہیں لیکن یہ حسرت دل میں لے جاتے ہیں کہ ہماری موت و حیات میں جو شعریت ہے اس کا دیکھنے والا وہ بے وقوف گروہ ہے جسے ہمارے نزع و کرب کی باریکیوں کے سمجھنے کا فن بالکل نہیں آتا۔

یہ عجیب مصیبت ہے کہ ان کی ابتدائی زندگی گویا ہماری پوری زندگی کا تازیانہ ہے۔

موسم برشگال میں امساک باراں ہوا نہیں اور اُن کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں ہمیں گالیاں دیتی ہوئی باہر نکل پڑیں۔

کال کلوٹی اُجلی دھوتی، کالے سیگھا پانی دے

پانی اور کیچڑ میں لوٹ رہے ہیں اور 'کالے' اور 'پانی' کے ہم قافیہ جتنی صلواتیں ہو سکتی ہیں ہمیں دی جارہی ہیں۔ گویا قدرت کا کارخانہ نہ ہوا تارکین اور عاملین موالات کی "تو تو میں میں" ہوئی پھر دیکھیے کچھ اور بڑے ہوئے تو تالاب کے کنارے پر ہمارا سر ہے اور ان کے پتھر، اس پر ہم اگر گھبراہٹ میں، ایک تمسخرانگیز طریقے سے سر پر پاؤں رکھ کر۔

اگر خواہی سلامت بر کنار است

کے خوف ناک اور نقش بر آب فلسفہ پر صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے، قلابازی کھا کر تالاب میں روپوش ہو جاتے ہیں تو یہ ہماری ہیئت کذائی پر قہقہے لگاتے ہیں۔ بھلا آپ ہی بتلایئے اس میں شعریت کو کہاں دخل ہے۔ کہاں تو ہم کنار آب رکناباد، "گل گشت مصلیٰ"، کسی سنگ ریزہ کی ڈیوٹ پر "اک محشر خیال" بنے بیٹھے ہیں اور کہاں وہ از غیبی گولہ، جو ہمارے سروں پر آکے پھٹتا ہے کیوں صاحب اگر ہم اس وقت اپنے کسی منظور نظر سے خفیہ طور پر مل رہے ہوں، آپس میں اختلاط کی

1 مرزا شوق کا پورا شعر اس طرح ہے:

موت سے کس کو رستگاری ہے + آج تم کل ہماری باری ہے

باتیں ہوتی ہوں اُس وقت اس اضطراری طریقہ سے

جان بچی لاکھوں پائے

کا فلسفہ زبانِ حال سے کہتے ہوئے نفرو ہو گئے تو آپ ہی بتلایئے ہماری شو بلری کو کتنا بڑا نا قابلِ تلافی نقصان پہنچا۔

شرم شرم............ٹرٹرٹرر............ٹرٹرٹررر

اس کے بعد یہ فتنہ پرداز کالج پہنچتے ہیں، جسے دیکھیے وہی بیالوجی کا فدائی، کوئی ان سے پوچھے کہ کیوں بھئی بیالوجی کلاس کوئی دھرم شالہ ہے یا نان کوآپریشن کا جلسہ یا دائس چانسلر کا فوٹو گروپ جس میں اپنی صورتِ زیبا کی "نقل مطابق اصل" حاصل کرنے کے لیے ہر شخص سر بکف گھسا پڑتا ہے۔ گویا ہمائے شہرت بس انھیں کے سر پر چتر افگن ہونے کے لیے فضائے یونیورسٹی میں پرواز کرے گا۔

خدا ہم کو اس بلائے بے درماں سے محفوظ رکھے۔ میری سمجھ میں تو آتا نہیں کہ اس 'بلا' کو صرف خانۂ انوری کی کیوں تلاش رہتی ہے۔ خدا بھلا کرے ایم۔ سی۔ کالج کا کہ ان بے فکروں کو ''دور باش'' ''دور باش'' کی بانگ بہت دور سے سنائی دینے لگتی ہے اور وہاں سے اپنا ور نہ ہمارا سا منہ لیے ہوئے ''کانفرنس کو چلے'' (گدھا بدست زندہ) کا کارٹون بنے ہوئے سرسید خانی، مدرسہ میں پہنچ گئے۔ یہاں کا کیا کہنا۔

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے[1]

حضرات آپ کو یاد ہوگا چند ستم ظریفوں نے ایک دفعہ مقاومت مجہول یا معروف (ٹھیک یاد نہیں) ٹرٹر..... مجہول .....ٹرٹر نہیں معروف ......ٹرٹر نہیں مجہول ......ٹرٹر ہرگز نہیں معروف.....ٹرٹر

(ہنگامہ نازک صورت اختیار کرنے لگا۔ صدر کی آواز نحیف تھی لوگ سن نہیں سکتے تھے آخر کار ان کی جانب سے سب سے بڑے گلے باز میگھا نے کہا ''حضرات نہ معروف اور نہ مجہول بلکہ معروف بالمجہول''۔)

---

1 مکمل شعر:

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا + صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے غالب

ٹرٹر خوب خوب، کیا کہنا........ٹرٹرٹررر
تحریک ملک وقوم کے سامنے پیش کی تھی جس کا لب لباب یہ تھا

رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجیے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

کیوں حضرات اگر یہ شاعر کسی متمدن ملک میں پیدا ہوتا تو پہلے مصرع کو اس طور سے درست نہ کر دیتا؟

رہے نہ جان تو قاتل کا خوں بہا دیجیے

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا اگر ثانی مصرع سے اس نے اپنے فقدانِ عصبیت کا ثبوت نہ دے دیا ہوتا تو میں یہ فیصلہ کرتا کہ یہ کاتب کی ستم ظریفیوں کا ایک معمولی نمونہ ہے۔

اب میں بتلاؤں گا کہ اس مکار اور فتنہ جو قوم نے جسے انسان کہتے ہیں اپنی فتنہ پردازیوں کے جال کو کیسا پھیلا رکھا ہے اور ہم نے اُن کے اصول کو آمنا وصدقنا کہہ کر مان لینے میں کتنی بڑی غلطی کا ثبوت دیا ہے۔

تمام شہر میں منادی تھی "نی مینڈک 2"

اس دور جمہوریت میں جب ہر چہار طرف آزادی اور مساوات کا ایک ہنگامہ برپا ہے شرط انصاف تو یہ تھا کہ اس مسئلہ "دار و گیر" میں ہماری رائے بھی لی جاتی، لیکن یہ منافق مخلوق بھلا اسے کب گوارا کر سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مارشل لا جاری کر دیا گیا۔ اب ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ مقاومت مجہول کی آڑ پکڑیں اور

برسر فرزند مینڈک ہر چہ آید بگزرد

کا یقین کر کے خاموش ہو رہیں۔ بہر حال ہم لیبورٹری کے چہ بچہ میں پہنچ گئے۔ وہاں مدتوں، ایک پولیٹیکل قیدی کی طرح' جسے اپنے جرم کی بھی خبر نہیں، قید رہے۔ کچھ دنوں کے بعد یہ طلسم ٹوٹا اور ہم آخر کار لیبورٹری میں لائے گئے۔ اب ہمارے چاروں ہاتھ پاؤں ایک مسطح تختہ پر جڑے ہوئے ہیں اور ہمارے پرانے خون خوار دشمنوں کا نرغہ ہے اور ہم ہیں کہ

ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم

بنے ہوئے مقاومت مجہول کا وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ ہر لڑکا اپنی اپنی کسوت لیے ہوئے ہم پر دندانِ آز تیز کر رہا تھا۔ ایک قسم کی نہایت تیز اور دماغ سوز چیز ہمارے ناک کے سامنے لائی گئی اور ہم تھوڑی دیر میں بے ہوش ہو گئے۔ ہمارے شکم پر عمل جراحی شروع ہوا اور ہم زبانِ حال سے یہی کہتے رہے۔

پھٹے جو پیٹ تو نشتر کو مرحبا کہیے

ہم ہیں کہ ٹس سے مس نہیں کر سکتے اور ہمارے قاتلین ہیں کہ تمام امعا اور رگ و ریشہ کو کریدر ہے ہیں۔ شکایت کرنے کی تو گنجائش نہیں کیوں کہ اس وادی میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی

گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے "اُستاذ" کی ہے

کے اصول پر کار بند ہونے کی قسم کھائی تھی۔ صرف اتنی شکایت البتہ کروں گا کہ ان میں جو شخص سب سے پیش پیش تھا (شاید اسے پروفیسر کہتے ہیں) اس کی عامیانہ اور شعریت سے یکسر معرا مذاق نے ہماری شانِ شہادت کی تذلیل کی۔ کیوں کہ ہم شہادت خفی پر مرتے ہیں اور

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے [1]

کی بنا پر کتنی کوشش کی کہ کسی طرح سے

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟ [2]

کا تخیل ان کے ذہن نشین کر دیا جائے، لیکن خدا اس سائنس کا بُرا کرے اس نے عشق و محبت کے اس لطیف خیال،

بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

(اور جو فی الحقیقت شعریت کا شیریں اور نازک ترین ارتعاش ہے) کی کتنی تضحیک کی ہے!

ان حضرات انسان کو دیکھیے، آج کل ہندوستان میں دو بڑی قوموں میں اتحاد و اتفاق پھیلانے کے کتنے حامی نظر آرہے ہیں۔ میرا روئے سخن کچھ خصوصیت کے ساتھ ان کی طرف نہیں ہے لیکن غالباً ہماری کانفرنس کے مقاصد کے منافی نہ ہوگا، اگر میں بھی ضمناً اپنے مظلوم بھائی "خرگوش" کی طرف سے اُن ستم آرائیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کروں۔ جو کچھ ہم پر

---

1 گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے + رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے — غالب

2 جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو + اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا — غالب

گزرتی ہے اُس میں برابر کے شریک رہتے ہیں اور گو ہم دونوں میں بہت کم چیزیں مشترک نظر آئیں گی، لیکن چوں کہ ہم سب ایک ہی آفت میں مبتلا ہیں اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ ہم ان کے ساتھ ایک مقصد مشترک نہ قائم کرلیں۔ ہماری چیخ و پکار اور تگ و دو تو مشہور ہے، ان کے ''خوابِ خرگوش'' سے بھی غالباً آپ بخوبی واقف ہیں۔ لیکن حضرات آپ مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں یہاں ذری صاف گوئی سے کام لوں۔ جماعت غوکیان، برادرانِ خرگوش کی ایک بات سے کھٹکتی ہے، انھیں اگر کچھ بھی ''ملائم چارہ'' مل گیا یا ''سبز باغ'' دکھلا دیا پھر یہ ہیں اور ''خوابِ خرگوش'' اور ہم رہ گئے عالم برزخ میں!

لیکن انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے رضاعی بھائی ''کچھوا'' بھی ہمیں میں سے ہیں۔ ہم دونوں پانی اور خشکی دونوں میں رہ سکتے ہیں اور ہمارا مزاج ''خشک و تر'' یا محض ''خشک تر'' (گرم تر کا موقع نہیں) بھی ہے۔ بھائی کچھوا اور ہماری برادری میں محض ''اندازِ رفتار'' کا فرق ہے ورنہ اصل میں ہم سب ایک ہی ہیں۔

ابتدا میں ہم دونوں ایک ہی مشرب سے تعلق رکھتے تھے، لیکن ایک بار ہم پر نہایت سختی کا زمانہ گزر رہا تھا۔ شدتِ گرسنگی سے جان پر آبنی تھی اتنے میں سات سمندر پار سے خبر آئی کہ خوان ہائے اغذیہ لطیف بھیجے جاتے ہیں۔ کتنے ہم درجا کے بعد ساعتِ موعودہ قریب آئی یہ نہ پوچھئے ہماری اُمیدیں کس حد تک پوری ہوئیں۔ ہم میں سے بعضوں نے تو اس بنا پر کہ تین فاقہ پر ہر چیز حلال ہو جاتی ہے، اسے قبول کرلیا۔ لیکن دوسروں نے ایسا نہیں کیا اور کربِ گرسنگی کو دور کرنے کی فکر نہ کی۔ بہر حال اس میں تو شک کی گنجائش نہیں کہ جنھوں نے اس میں سے تناول کیا وہ بھی حق بجانب تھے اور جنھوں نے اس سے اجتناب کیا وہ بھی راستی سے دور نہ تھے۔ لیکن اب حال یہ ہے کہ برادرانِ کچھو کچھ ایسے مٹنگ پشت ہو گئے ہیں کہ اوّل تو انھیں ''ضرب بالضرب'' کا خطرہ نہیں رہا اور اگر بفرضِ محال کسی نے غلطی سے ایسا کیا بھی تو انھیں احساس ہونے کا نہیں،

شرم شرم..........ٹرٹر............ٹرٹرٹررر.....................

اب یہ ہیں اور ان کی ڈفلی اور ہم ہیں اور ہماری ڈفلی۔ غازی میاں کے ڈفالی، مجاوروں کی طرح ہر ایک کے جھمان علاحدہ علاحدہ ہیں۔ تیج تیوہار کا موقع ہوا، تقریب و تفریت کی ساعت آئی،

جشن وطرب کے ہنگامے ہوئے۔ کیا مجال ایک جمانی والا دوسرے جمانی میں چلا جائے، اور اگر بدقسمتی سے ایسا ہوا تو پھر الامان والحفیظ، نتھنے پھولنے لگیں گے، منہ سُرخ ہو جائیں گے، دانت باہر نکل آئیں گے، جھاگ اور کف منہ سے جاری ہو جائے گا، غرانا شروع کریں گے اور پھر آپس میں گتھ جائیں گے۔

برادرانِ ملت! یہ کیا بوالعجبی ہے، ہم لوگوں کا مقصد ایک ہے، لیکن فطرتیں جداگانہ ہیں۔ اب ہم اور ہمارے بھائی پھدو دونوں ایک دوسرے سے علاحدہ ہیں اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے۔ گویا ہماری زندگی کا مقصد اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کا نہیں رہا بلکہ ایک دوسرے کے خون سے اپنے ہاتھوں کو آلودہ کرنا، لیکن اگر آپ برا نہ مانیں تو میں کہوں گا کہ ہم دونوں کچھ نہ کچھ غلطی پر ضرور ہیں، اور نہیں تو آیئے ہم اپنی اپنی رفتار ہی اندازہ کر ڈالیں۔ برادر پھدو کے یکساں ہموار اور مستقل رہ نوردی تو مشہور ہے اس کا مزہ تو ہمارے دوسرے بھائی خرگوش خوب چکھ چکے ہیں۔

ہیر ہیر.........ٹرٹر..........ہیر ہیر

اور ہم ہیں کہ فطرتاً اُچک کر قطع مسافت کرنے کے خوگر ہیں، جو راستہ ہم کو چل کر طے کرنا چاہیے اسے ہم جست کر کے طے کرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لیے جو منازل اور مدارج مقرر کیے گئے ہیں اُن پر ہم رُکتے نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری جست تو جیسی کچھ تسخر انگیز ہوتی ہے اُس کا تو تذکرہ ہی کیا، خود مقصد بھی فوت ہو جاتا ہے۔ چوں کہ ایک مرتبہ جست کرنے کے بعد پھر قوتِ ارادی موثر طریقہ پر برسرکار نہیں لائی جاسکتی اس لیے ہماری قوتِ عمل سلب ہو جاتی ہے، اور ہم پھر لوٹ نہیں سکتے۔ اس طرح پر اوّل تو اس اُچکے پن سے منزلِ مقصود پر پہنچنے سے قبل ہی تھک جاتے ہیں یا چوں کہ وہ منزل جہاں ہم اُچک کر پہنچنا چاہتے ہیں، ایک حد تک نامعلوم ہوتی ہے اور ایک دفعہ جست لگانے کے بعد ہمارا وہاں نازل ہو جانا لازمی ہو جاتا ہے۔ اس لیے پھر یہ ہماری قدرت سے باہر ہو جاتا ہے کہ ہم لوگ پر گرتے ہیں، یا پانی پر، کانٹوں پر یا تلوار کی باڑھ پر!

میرے دوستو! کیا تم انکار کر سکتے ہو کہ آج کل ہندوستان کا طریق عمل ایسا نہیں ہے، لیکن بھائی پھدو کی حالت بھی اعتراض سے خالی نہیں ہے۔ آپ اجازت دیں میں یہاں پر اپنے ہی جنس کی ایک نہایت گھریلو مثال ان کے لیے پیش کر دوں یعنی ''کوئیں کے مینڈک'' کی۔

جس طرح ہمارے اس جنس کی وسیع دنیا صرف ایک اندھے کوئیں کا تاریک اور نم ناک گوشہ ہے اسی طرح سے ہمارے ان بھائیوں کی دنیا بھی چند مخصوص حلقوں تک محدود ہے۔ انھیں معلوم ہی نہیں کہ کوئیں سے باہر کوئی دوسرا عالم بھی ہے، جہاں روشنی اور ہوا ہے جہاں وسعت اور راحت میسّر ہے جہاں آزادی کی لہریں اُٹھتی ہیں جہاں اکل حلال اور صدقِ مقال مایۂ انسانیت ہے، جہاں فراغت، خدا ترسی اور ایثار نفسی کا اُمن برستا ہے، لیکن سمجھانے سے کیا حاصل۔ چوں کہ انھیں ان نعمت ہائے بیکراں سے کم واسطہ پڑا ہے، اس لیے ان خوبیوں کا احساس بھی ان میں باقی نہیں رہا۔ کسی حد تک ان کی مثال اُس مریض کی سی ہے جو اپنی تکالیف کا احساس کرتا ہے اور تندرستی کی نعمتوں کا قائل بھی ہے، لیکن پرہیز کرنے سے گریز کرتا ہے!

خیر یہ ایک جملۂ معترضہ کے سلسلہ میں، میں نے حاضرین کا وقت ضائع کیا۔ ہمیں اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم پر اس وقت جیسے کچھ ظلم توڑے جا رہے ہیں ان کا ازالہ کس طرح سے ہوسکتا ہے۔

اوّل تو یہ کہ ہمارا سر ہی نہیں بلکہ تمام جسم آج کل بیالوجی کے طالب علموں کی ہتھیلی پر جس طرح سے رکھا ہوتا ہے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے۔ گائے کی قربانی کا مسئلہ تو ہندو مسلمانوں میں داد و ستد کے آسان ترین اُصول پر طے ہوگیا۔ وہاں تو کسی کے قومی جذبات کے احترام کا سوال تھا یہاں خود جان کا سوال درپیش ہے۔ دوسرے یہ کہ مسئلہ ارتقا کے سلسلہ میں انسانی جسم کی ساخت اور ترکیب پر غور کرنے کے لیے آخر ہماری ہی جان کیوں فالتو سمجھی جاتی ہے۔ اس تھیوری کے جدِّ امجد نے تو کسی اور کو سوچ رکھا تھا۔ یہ ہم آخر کس طرح پکڑے گئے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ حضرت انسان سچ مچ ان جفادریوں کو اپنا مورثِ اعلیٰ سمجھنے لگے ہیں۔ جب تو ان سے کچھ تعرض نہیں کرتے۔ حالاں کہ یہ حضرات بین الاقوامی عافیت کے لیے ایک وبا سے کم مضرت ناک نہیں ہیں۔

تیسرے یہ کہ اس اسکیم نے ہماری نسل کو سخت صدمہ پہنچایا ہے۔ گذشتہ مینڈک شماری سے پتہ چلتا ہے کہ اب ہم میں صرف 25 فی صدی فرقۂ ذکور سے ہیں اور 70 فرقۂ اناث سے بقیہ پانچ کے متعلق کوئی بات تیقن کے ساتھ یوں نہیں کہی جاسکتی کہ یہ خود اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ ان کی جنس کے متعلق رائے قائم کرنے میں لوگوں کو مغالطہ ہو۔ اس طرح سے ہماری

سوسائٹی پر اس کا نہایت بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ یہ مسئلہ گورنمنٹ کے سامنے پیش ہے، اور ایک کمیٹی ڈاکٹروں کی ایسی بنائی جانے والی ہے جو نہایت تحقیق اور جستجو کے بعد ایک رپورٹ تیار کرے گی اور گورنمنٹ کے سامنے ایسی تجاویز پیش کرے گی جس سے یہ پتہ لگایا جاسکے گا کہ اس وقت ہماری قوم میں متاہل ہونے کی کہاں تک صلاحیت باقی رہ گئی ہے اور اس مسئلہ کو سلجھانے کے لیے نقل وطن کرنا چاہیے۔ تعدادِ زوج بڑھانا چاہیے یا دہلی اور لکھنؤ کے مشہور اطبا کے علم سینہ سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔

ٹرٹرٹرررر......دہلی اور لکھنؤ کے اطبا........ٹرٹرٹرررر

آپ یہ سُن کر غالباً مسرور ہوں گے کہ اس رپورٹ کے متعلق گورنمنٹ نے احکام صادر کیے ہیں کہ اس کی ضخامت اور مدت تیاری میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن رپورٹ کا حوالہ دینا یا اس کی مثال پیش نظر رکھنا ایک ایسا فعل ہوگا کہ جس کے ذمہ دار خود ممبرانِ کمیٹی ہوں گے۔

چوتھے یہ کہ جب کالج اور یونیورسٹیاں قومی بن جائیں اور بیالوجی کا استیصال ہو جائے یا کم سے کم خدا امانِ قوم موعودہ دو کروڑ روپے وصول ہو جائیں اس وقت سائنس لیبورٹری میں کسی نمایاں مقام پر ایک یادگار قائم کی جائے اور جلی حرفوں میں ڈارون، ہکسلے، ہیگل اور شر کا ہم کا نام کندہ کر دیا جائے تا کہ لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ ان لوگوں نے ہم پر کیا کیا ستم روا رکھے تھے اور ہم نے اپنی آزادی حاصل کرنے کے لیے کیا کیا قربانیاں کیں۔

ہاں میں یہ بھی تجویز کروں گا کہ کان پور کے ''میموریل ویل'' کی طرح کوئی بیالوجی کا طالب علم اس کے قریب بھی نہ آنے پائے۔

برادرانِ ملت! مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کا ایک مرتبہ اور شکریہ ادا کروں کہ آپ نے دور دراز سفر کی صعوبتیں بطیب خاطر گوارہ فرمائیں اور اس مجلس قومی میں شرکت کی زحمت برداشت کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اب کہنے سننے کا موقع نہیں رہا اب کام کرنے کا وقت ہے۔ اتمام حجت کی منزلیں بھی اب ختم ہو گئیں۔ اب یہ سوال نہیں رہ گیا کہ ہماری قومی تحریک بجا ہے یا بے جا اس میں تکالیف اور دقتیں ہیں یا آرام وسکون اب محض تن بہ تقدیر کام شروع کر دو، اور فرصت کے پہلے لمحوں میں اپنی بصیرت سے کام لو۔

ہاں اے دل مینڈک زا، اِک نعرۂ غوکانہ

ژرژرررر..........ژرژرر ....ژرژررر ....

....

پیرِ فلک اپنے گودڑی کے لعل ایک ایک کر کے چن رہا تھا، اُفق مشرق پر ظلمتِ شب کافور ہونے لگی تھی۔ تالاب کے بلوریں گہوارہ میں فتنۂ خوابیدہ لہریں نسیم سحری کی چھیڑ چھاڑ سے کروٹیں بدلنے لگی تھیں۔ آبی طیور صبح کے دُھندلکے میں رختِ سفر درست کر رہے تھے۔ ان کی لہریئے دار قطار یاسمینی فضا میں بلند ہونے لگی تھی۔ قضارا سارس کا ایک جوڑا پاس کی کہر آلود جھاڑی سے جس کا کچھ حصہ تالاب کے اوپر پھیلا ہوا تھا، نکل کر فضائے اثیر میں بلند ہونے لگا۔ یہاں جماعت غوکیان ابھی پنڈال ہی میں تھی، جاسوسوں نے خبر پہنچائی کہ زیلن نمودار ہو رہا ہے۔ پناہ کی فکر کرنی چاہیے۔ یہ سننا تھا کہ بھگدڑ مچ گئی۔ کتنے کچل گئے، کتنے زخمی ہوئے، معلوم ہوتا تھا گویا تالاب کے سامنے مشین گن لگا دی گئی ہے جس کے کارتوس میں بجائے گولی مینڈک بھرے ہوئے تھے۔ ''و لے باایں ہمہ'' سارس کا جوڑا ناشتۂ صبح کے لیے الرزاق کہتا ہوا آیا اور

سارساں را کجا کنی محروم
تو کہ با غوکیاں نظرداری

کہتا ہوا، آخری بارہ حدِ نظر پر دُھندلا دکھائی دیا۔

(مطبوعہ علی گڑھ میگزین علی گڑھ۔ جنوری 1921)

●●●

اب کے بھی دن گزر گئے یوں ہی بہار کے

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی   کیوں ترا راہ گزر یاد آیا![1]

اُردو صحائف کی اشاعت آج کل جب کبھی معرضِ تعویق میں پڑتی ہے اور ایسے واقعات اکثر پیش آتے رہتے ہیں، اُس وقت ایڈیٹروں کی معذرت خصوصیت کے ساتھ دلچسپ ہوتی ہے۔ لطف تو جب آتا ہے کہ ہمارے بزرگ محترم خان بہادر مرزا.....صاحب اس کے اسباب وعلل پر، اپنے مخصوص انداز میں بحث کرتے اور کم سے کم دو درجن ایسے وجوہ تحریر فرماتے جو مسلسل اور نمبر وار کسی متوسط تقطیع کے پورے صفحہ سے گزر کر دوسرے ورق پر بھی دو چار سطریں لے لیتے، لیکن زبان حال پر یہی ہوتا۔

صحیفہ اور چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے[2]

بہر حال نقلِ کفر، کفر نہ باشد کی آڑ میں، مشتے از نمونہ خروارے،

(1) ''خاکسار ایڈیٹر کے گھر میں کچھ ایسی علیل ہوئیں کہ مدتوں اچھے ہونے کا نام نہ لیا۔'' اس سلسلہ میں ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں صاحب، کوہستانی اضلاع کثرت اخراجات،

---

1. غالب
2. مکمل شعر اس طرح ہے:

سخن تمام ہوا اور مدح باقی ہے + سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے   غالب۔

دماغی توازن دوادوش اور ''خاکسار ایڈیٹر'' کے بچوں یا بیوی کے بچوں کا مچلنا، دانت نکلنا، دائیوں کا نہ ملنا اور بالآخر محلّہ کی کسی بڑی بی کا اتفاق سے مل جانا، سب کچھ شامل ہے۔ اگر کہیں اشتہاری بیوی ہوئیں تو پھر نور علیٰ نور ہے۔

(2) ''خاکسار ایڈیٹر'' زکام، پیچش، قبض، کھانسی، بخار، انفلوئنزا (غرض کہ ہر وہ مرض جس میں ''اصلی آبِ حیات'' تیر بہ ہدف ثابت ہوا ہے) میں مبتلا رہا یا جلسہ، تقریر، سفر، پریس ایکٹ، تعزیراتِ ہند، ضابطہ فوجداری وغیرہ کا شکار ہوا۔

(3) ''خاکسار ایڈیٹر'' نے پریس کے لیے نئی مشین منگائی تھی جس کی بلٹی گم ہوگئی۔ مشین اسٹیشن پر پڑی ہوئی ہے، پرانا پریس یک بہ یک ''نصف اخبار کے بعد'' بگڑ گیا۔ پریس مین اور کاتب بیمار ہوگئے یا ہڑتال کردی گو ''خاکسار ایڈیٹر'' نے اس کا ہمیشہ سے التزام رکھا تھا کہ اس کے یہاں کے پریس مین اور کاتب دُگنی اور چوگنی اُجرت پاتے رہیں۔

(4) کاغذ کچھ ایسا نایاب ہوا کہ تمام ہندوستان کے کارخانوں اور اُن کی کارکنوں کی خانہ یا جامہ تلاشی لے ڈالی۔ صاحب بہادر، یا نیٹو صاحبان کے غسل خانہ وغیرہ کی خاک چھان ڈالی، لیکن آنکھوں سے لگانے کے لیے بھی کاغذ نہ ملا۔ ''خاکسار ایڈیٹر'' اسی کاغذی ناؤ پر اب بھی منزلِ مقصود کی تلاش میں ہچکولے کھا رہا ہے۔

(5) ''خاکسار ایڈیٹر'' کی مالی حالت (میں بھی کھانسی آتے آتے رُکی) ناگفتہ بہ ہے، مجبوراً بادامی کاغذ لگایا جارہا ہے۔ اب وہ بھی نہ رہا ''سات کروڑ مسلمانوں'' کا سوال پیش کرتے ہوئے یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا اگر ہر خریدار کم سے کم دو دو درجن خریدار اور فراہم کردے تو۔ للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطری خواست، ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند، جزاک اللہ فی الدارین خیرا، شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا، رواقِ منظرِ چشمم کہ آشیانہ تست۔

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

بخطِ جلی، رسالہ یا روزنامہ کے کسی نمایاں مقام پر ضرور نظر آئے گا ورنہ پھر اسمائے معاونین کی ایک طویل فہرست سرورق پر دیکھ لیجیے، جو اکثر عالی جناب سے شروع ''بالقابہ'' یا ''سلمہ اللہ تعالیٰ'' پر ختم ہوتی ہے۔

(6) یادش بخیر، نان کوآپریشن، عدم تعاون، ترک موالات، ترک معاملات، ہڑتال، سوشل بائیکاٹ فتاوی، مہاتما، مولانا، مولوی، سنیاسی، سوامی، برہم چاری، حکیم یا ڈاکٹر غرض کہ ان میں سے ہر ایک ''خاکسار ایڈیٹر'' کے متاعِ ہوش وخرد کو خاکستر بنا سکتا ہے، لیکن یہ حالت انھیں مظلوموں کی ہے جو بقولِ تارکینِ موالات ''جماعتِ طاغوتیان'' سے تعلق رکھتے ہیں ورنہ بہ صورت دیگر یہی ''خاکسار ایڈیٹر'' وہ برق جہندہ ہے جس کی چشمک زنی قصر بالمورل کے فلک رفعت کنگروں اور شملہ کی برف آلود چوٹیوں کی فضا میں وہ تموج اور ارتعاش پیدا کر دیتی ہے جس کے تخیل سے کتنوں کی عافیت معدوم ہو جاتی ہے۔

....

لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ ''خاکسار ایڈیٹر'' (علی گڑھ میگزین) ہیچ مداں، ہیچ میرز، نیاز مند، حقیر، فقیر، پرتقصیر، ناچیز، عفی عنہ فدوی (بشمول ''غریب پرور'') غرض کہ بالکل ازکار رفتہ ہستی جسے کلرک، ایڈیٹر، چپراسی ایک ساتھ ایک ہی وقت میں کہا جا سکتا ہے مندرجہ بالا عذرات میں سے کس کی آڑ پکڑتا ہے۔

(1) اس کے متعلق تو یہ کہنا ہے کہ یہ ''سنت'' ابھی گلوگیر نہیں ہے، لیکن اگر کسی ایڈیٹر کو جمع متکلم حاضر کی حیثیت محض اُس وقت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ اُس کی ہر جنبش قلم کسی جنسِ لطیف (جسے شعریت سے یکسر معریٰ، طبیعتوں نے 'بیوی' کا سا کاروباری نام دے رکھا ہے) کے کاوش مژہ کی رہینِ منت ہو تو پھر ہمارے ناظرین مایوس ہونے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اپنی حالت

جامہ ندارم دامن از کجا آرم

کی مصداق ہے، لیکن اگر اس کی کبھی توفیق ہوئی تو پھر ارباب کالج سے استدعا کی جائے گی کہ میگزین کا جب بجٹ تیار ہو (انشاءاللہ ایسی غلطی کبھی نہ ہوگی) تو ایڈیٹر کے اس جز ولاینفک یا تابع مہمل (بیوی) کا لحاظ رکھا جائے اور اس کا ''الاؤنس'' علاحدہ مقرر کیا جائے۔

(2) میکائیلان ڈائننگ ہال نے ہزار سر مارا کہ یہ 'ادھوڑی استر' تندرستی کہیں سے حرلزل ہو جائے، لیکن اُنھیں آخر میں یہ معلوم ہوا کہ جس کی زندگی 'علی گڑھ میگزین' ایسی سخت جان چیز سے وابستہ ہو، ایسے پرانے گناہ گار سے تعرض کرنا ہی تضیع اوقات ہے۔ خود میگزین کے ناظرین کی کرم گستری ہی کیا کم ہے؟ رہا تعزیراتِ ہند کا سوال اس کے لیے یہ عرض کر دینا کافی ہے کہ اس وقت گورنمنٹ نے یہ اختیار خود رسالہ ہٰذا کے ناظرین کو ودیعت کر دیا ہے۔

(3-4) ان شقوں کے متعلق ہمارا یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ اس مسئلہ میں مولوی محمد مقتدیٰ خاں شروانی [1] منیجر مطبع کی رائے زیادہ صائب ہوگی۔ کاغذ کے متعلق تو مخبروں نے خبر پہنچائی ہے کہ مغرب والی سب سے تاریک کوٹھری میں کافی سے زیادہ اسٹاک موجود ہے۔ گو مولانا نے بہ طیب خاطر کبھی اسے تسلیم نہیں کیا، ہڑتال ضرور ہوئی تھی۔ ممکن ہے 'چونے' کی کمی سے 'صفاچٹ' کا کوئی اچھا مصالحہ تیار نہ ہوسکا ہو۔

ایک زمانہ میں مشین کی داغ بیل ڈالی گئی تھی، لیکن 'نقشِ فریادی' اور کاغذی پیرہن، کا اوّلین خاکہ کچھ دُھندلا ہی نظر آتا رہا۔ فی الحال

ہے، مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی [2]

کا سلسلہ علی گڑھ گزٹ تک محدود ہے۔

اب رہا مالی حالت کا سوال، سو، (اس لفظ کی موسیقیت اور عذبیت سے کچھ وہی لوگ کیف اندوز ہو سکتے ہیں جنھوں نے زمانۂ کلکتہ کے جوابِ تلخ، سن سن کر ''عفاک اللہ نکو گفتی'' کا وظیفہ پڑھا ہے) یہ ہمارے بس کا نہیں ہے۔

4/ ماہ وارو ے کر تمام کالج، خاکم بہ دہن، یونیورسٹی نے اور چند دیگر بزرگوں نے اس سے کچھ زائد دے کر 'غریب بیستم بیمار ستم' ایڈیٹر کے خلاف دشنام دہی کی مشین گن کا لائسنس لے لیا ہے۔ ذرا نمونہ ملاحظہ فرمایئے گا۔

---

1 محمد مقتدیٰ خاں شروانی منیجر انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ متوفی 1998

2 ہے، مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی + کیا طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی حسرت موہانی

''کیوں حضرت میرے روپے کچھ چوری کے تھے جو یوں ہضم کیے بیٹھے ہیں۔''

''واہ جناب واہ! آپ کو روپیوں کی ضرورت تھی تو میگزین کا ڈھکوسلہ کیوں نکالا۔''

''واقعی یہ کالج اسی قابل تھا کہ مہاتما گاندھی اس کو برباد کر دیتے، نہ کسی بات کی پابندی ہے نہ میگزین ہی ٹھیک وقت سے نکلتا ہے، تو پھر اس کالج کو کیوں قائم رکھا جائے۔''

''صاحب میں بار بار لکھ چکا ہوں میرے روپے واپس کر دیجیے، میں آپ کی مجبوریوں اور میگزین دونوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔''

(اے کاش آپ یہ فیصلہ تارکینِ موالات ہی کو صادر کرنے دیتے۔)

کچھ ان سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کے الفاظ مذاق سلیم پر بار ہوں اس لیے ہم اس وقت صرف اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

لیکن یہ سب کیوں؟

اس لیے کہ ہمارے خدایانِ مجازی ہماری ہر التجا پر صرف ایک فیصلہ صادر کر سکتے ہیں جو کسی اجنبی اور معصوم شخص کے سامنے ایسی جنت نظر پیش کر سکتا ہے کہ وہ بے چارہ عالم خود فراموشی میں رقص کرنے سے باز ہی نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ جب میگزین کے حصے کی نعمتیں ازل میں تقسیم ہو رہی تھیں، اُس وقت ہم اُن بزرگوں کے سامنے دست التجا پھیلائے ہوئے تھے جن کا کمیشن ان مراعات کے خلاف نوٹ آف ڈسنٹ لکھ رہا تھا۔

اس کوہِ طور سے تو ہمیں ہمیشہ یکساں جواب ملا، اور وہ بھی اس لیے کہ لن ترانی کا فیصلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا تھا ورنہ ترکی صلح نامہ کی طرح سے اس میں بھی ترمیم وغیرہ کی گنجائش ہوتی۔ ہاں وہ جنت نظر تو بھولا ہی جاتا تھا، ارشاد ہوگا۔

''ایک کمیٹی بنا ڈالیے، بجٹ بھی تیار کر دیجیے، بجائے ماہوار اگر پندرہ روزہ کر دیا جائے تو اور اچھا ہوگا۔ کالج کی عمارتوں کی تصویر بھی ہونی چاہیے، مضمون نگاروں کو ایک روپیہ فی صفحہ اُجرت بھی ملنی چاہیے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے جو مضامین عمدہ ہوں اُن کے اقتباسات بھی درج ہوں قابل قابل لڑکوں.....ہم عاجز آن کر پکار اُٹھیں گے:

''غریب پرور، ستار و عیوب و قاضی الحاجاتی، کا سوال کیسے حل ہوگا۔''

"سخن در ین ست' اچھا پھر ملیے گا، لیکن اسی سلسلہ میں ذری.... صاحب سے تو مل لیجیے، وہاں پہنچے تو کیا کہنا۔ بہر حال ہماری حالت تو بس یہ ہے کہ دو مرغوں میں ملا حرام یاد و ملاؤں میں مرغ حرام ہیں۔

نظارہ کا گیا نہ گیا کچھ خیال کا

مارا گیا یہ دل اور یہی بے قصور تھا

(6) بس اسے یادش بخیر ہی تک محدود رکھیے۔

....

اکثر خیال میں آیا کہ "دین و دنیا" دونوں کو بغل میں دبا، فقیر ہو جایئے، لیکن یہاں باز و مفلوج مرید عنقا پرند اور یر اند کا سلسلہ ہی جاتا رہا۔ پھر خیال آیا کہ کاش سات چھوارے، پشت پناہ، فقیر کی چٹکی، مراد آباد میں مردہ زندہ ہو گیا، دعائے عقد المحبت کے لیے قسم اُٹھادی ہے۔ حکیم صاحب کی گولیاں دان، ہوشن صاحب کا کوکو، 84 تصویروں والا اصلی کوک شاستر، ڈاکٹر برمن کا عرق پودینہ، رائل ماقوتی، آبِ حیات، علاماتِ قیامت، ائر کٹرس وغیرہ کا اشتہار ہی مل جاتا کہ کچھ اشک شوئی ہو جاتی۔ لیکن معلوم ہوا کہ اس کے لیے صرف پنجاب کی سرزمین زرخیز ہے اور پانچ ندیوں کا پانی اس اشک شوئی کے لیے درکار ہوگا۔ یہاں سے بھی مایوس پھرے۔

پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں

پھر وہی زندگی ہماری ہے [1]

اس سال یہ اُمید تھی کہ یونیورسٹی مل ہی گئی ہے، دیرینہ توقعات کسی نہ کسی حد تک پوری ہو جائیں گی کچھ نہ کچھ میگزین کے لیے ہو رہے گا۔ لیکن یہ اُمیدیں نقش برآب ثابت ہوئیں۔ اس وقت باضابطہ طور پر نہ تو میگزین کا کوئی آفس ہے، نہ فرنیچر، نہ کوئی منشی ہے نہ کوئی چپراسی، ایڈیٹر بھی ایک طرح سے عالم برزخ میں معلق ہے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن، وہ اس عہدۂ جلیلہ پر اسی وقت تک فائض المرام ہے جب تک دانے گھاس کا مطالبہ نہ کرے اور یہی نہیں بلکہ کلرک اور چپراسی کے فرائض بھی بطیب خاطر انجام دیتا رہے کیوں کہ بہ صورت دیگر، حکم نافذ ہوگا۔

میاں مٹھو پڑھو ورنہ پنجرا خالی کرو

---

1 غالب

یہ سلوک احساسِ خودداری کو ٹھیس نہیں ٹھوکریں لگاتا ہے لیکن اس کمزوری کا کیا علاج جو کنعاں کی گدائی مصر کی شاہی سے زیادہ کرتی ہے۔

....

غرض کہ ایڈیٹر صاحب اس وقت محشر خیال بنے ہوئے اپنی کرسی پر بیٹھے ہیں جسے آپ بورڈنگ ہاؤس، میگزین آفس، ٹینس کلب یا خود مابدولت کی مجموعی یا ان میں سے کسی ایک کی ملک سمجھ سکتے ہیں۔ سامنے ایک صاحب کی بائیسکل رکھی ہوئی جس پر انسٹی ٹیوٹ پریس تک جانے کا ارادہ ہے 'یونیورسٹی نوٹ' لکھ کر دوسرے مضامین کے پروف صحیح کر رہے ہیں، میز پر کاغذات کا انبار لگ رہا ہے۔ ایک طرف سائنڈ کا بیرا کھڑا کہہ رہا ہے، ''حضور مٹی کے تیل کا پرچہ لکھ دیجیے۔'' دوسری طرف ٹینس کلب کا نوکر کہتا ہے، ''اتنے مشک پانی، اتنا چونا جال کی مرمت، اسکرین کی نواڑ منہ۔ تیسری طرف پروفیسر محمد حیدر خاں صاحب کا آدمی رقعہ لے کر پہنچتا ہے ''شام کو مسٹر بام ٹینس کھیلنے آئیں گے انتظام رہے۔''

پانچویں طرف پروفیسر محمد انعام اللہ خاں صاحب کا مشکیں نسب محبوبۂ روزگار ملازم کھڑا ہوا ہے کہ ابھی ابھی سن کر چلے آئے۔ چھٹے طرف جواہر منزل کے ہیرو جھاڑو لیے کھڑے ہیں۔ گویا باسفورس میں اتحادیوں کا جنگی بیڑہ ترکی عہد نامہ کی تعمیل کرانے کے لیے کھڑا تھا۔ ''سرکار نوکروں کو منع ہو جائے بیچانے میں نہ جائیں'' ایک طرف سے ڈیوٹی سوسائٹی کا ملازم نوٹس لیے پہنچتا ہے کہ ''آج میٹنگ میں شرکت لازمی ہے'' ممبروں کی کافی تعداد نہ آنے سے جلسہ برابر ملتوی ہوتا رہا۔ اسی کے ساتھ پرووائس چانسلر صاحب بہادر کے آفس کا چپراسی پہنچتا ہے کہ ''ٹھیک ساڑھے 10/ بجے دن میٹنگ ہونے والی ہے۔'' ایڈیٹر صاحب ہیں کہ ''جل تو جلال تو'' کا وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔

بجلی کا انجن پھک پھک کر رہا ہے۔ غسل خانہ میں گلہری برتنوں کو کھڑ کھڑاتی ہے۔ ایک صاحب (جن کے اسمائے صفات شمار نہیں کیے جاسکتے) لحہ بہ لحہ کھانستے چلے جاتے ہیں۔ دوسرے صاحب پر ٹینس کا ہذیان مسلط ہے اور لطف یہ کہ اُن میں سے ہر ایک کا تال و سُر ایک دوسرے سے ملتا جلتا ہے۔

اتنے میں ہوا کا ایک تند جھونکا سَن سے نکل جاتا ہے۔ کاغذات منتشر ہو جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ایڈیٹر صاحب کا دماغی توازن!

یونیورسٹی کا سالِ رواں اب ختم ہونے کو آتا ہے۔ اوائلِ سال میں ہم نے کن کن توقعات کے ساتھ اس وادی میں قدم رکھے تھے، لیکن ناظرین انصاف کریں کوشش کے ساتھ ساتھ نتائج تو ہمارے بس کے نہیں! ہمیں خود قلق ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں۔

اب کے بھی دن گزر گئے یوں ہی بہار کے

(مطبوعہ: علی گڑھ میگزین۔ فروری 1921)

●●●

خودکشی

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے [1]

مُتمرّد، وضع دار اور موحد ہونے کے اعتبار سے شیطان کا پایہ مسلّمہ طور پر قابلِ رشک ہے۔ وہ انسان کا اس لیے دشمن ہے کہ خدا نے ایک نامکمل اور ناقص مخلوق کو معرضِ وجود میں لا کر صرف اپنی صنعت گری کو بحث طلب نہیں بنا دیا، بلکہ اس کا والہ وشیفتہ بن کر اُس نے اپنی کمزوری کا بھی ثبوت دیا اور یہی نہیں بلکہ اپنی شیفتگی میں اُس ہستی کو بھی شریک کرنے کا ارادہ کیا جو شاید خدا کی خدائیت کا خود خدا سے زیادہ قائل نہ تھا۔ ظاہر میں نظریں ان حقائق کو عریاں کرنے پر مجھے شیطان سے بھی زیادہ قابلِ تعذیر سمجھیں گی، لیکن انھیں نہیں معلوم، محبوب کی کمزوریاں اُسی وقت تک دلکش ہوتی ہیں جب تک وہ اغیار کے طمانیتِ خاطر کا باعث نہ ہوں۔ شیطان بھلا یہ کب گوارا کر سکتا تھا کہ جس ہستی کے ساتھ اُس کے وجود کا دامن اتنی مدت سے وابستہ رہا ہو اُس کا قلب وجگر کسی دوسرے کی جنبشِ ابرو کا متمنی ہو، لیکن شیطان سے اگر اصولی نہیں تو نفسیات کی ایک غلطی ضرور سرزد ہوئی وہ انسان کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے میں حق بجانب تھا، لیکن خدا سے سرکشی کرنے میں اس نے ایک اجتہادی غلطی کی اگر محبوب کی بے التفاتی اس کے نزدیک ایک حد تک قابلِ شکایت

---

1 ذوق

تھی اور ضرورتھی، تو اُسے اشد ادکا پہلو اختیار کرنا مناسب نہ تھا۔ مجبور لیکن سچے عاشق کا ایمان اُس کا حزن ہے نہ کہ اشد اداس لیے میں یہاں شیطان کو غلطی کا مرتکب سمجھتا ہوں۔ لیکن انسان اور خدا کا جیسا کچھ رویہ شیطان کی طرف ہے وہ بھی میرے نزدیک کچھ زیادہ منطقیانہ نہیں ہے۔ انسان شیطان سے اس لیے متنفر نہیں ہے کہ اُس کے تعلقات خدا سے کشیدہ ہیں بلکہ وہ اپنی حماقت اور بےاصولی کے خمیازہ کو ناقابل برداشت پاکر کسی غیر ذمہ دار ہستی کا متلاشی ہوتا ہے اور اس ابلہانہ تگ ودَو میں اُسے صرف دو وجود ایسے نظر آتے ہیں جن کا شانہ اُس کے نزدیک اُس بارگراں کا متحمل ہوسکتا ہے یعنی خدا یا ابلیس دوسری طرف خدا ابلیس کو ایک ایسے خیال کا ذمہ دار بنانا چاہتا تھا جو اصول نفسیات کے سراسر منافی ہے۔

خدا کی حکومت کے اس مختصر دائرہ میں جسے عرف عام میں دنیا کہتے ہیں۔ محبوب کا محبوب کبھی پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ خدا اور ابلیس میں جو کشاکش اس وقت رونما ہے وہ ظاہر ہے، لیکن مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اس جنگ کی بنیاد مساوات پر نہیں رکھی گئی ہے، کچھ انسان تو خدا کی جماعت میں داخل ہیں اور کچھ شیطان کی پارٹی میں، کچھ ایسے بھی ہیں جو خیرالامور باوسطھا کے پابند ہیں۔ موخرالذکر کے نزدیک اوسط کے معنی ابن الوقت کے ہیں۔ لیکن خدا کو یہ سہولت حاصل ہے کہ اس کے ذرائع اور وسائل Resources میں جناب عزرائیل بھی شامل ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی بےلوث حیثیت کے اعتبار سے یہ بزرگ اپنی نظیر نہیں رکھتے، لیکن خیریت بھی اسی میں ہے ورنہ کہیں دوچار بھی ان کے سے ہمدرد اور شریک نکل آتے تو یہ مختصر دنیا کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔ اس طور پر گویا یہ لڑائی ایک غیر مساویانہ حیثیت رکھتی ہے۔ جناب عزرائیل اس اصول کے کبھی پابند نہیں رہے کہ جنگ میں کامیابی حاصل کرنے سے بہتر جنگ سے احتراز کرنا ہے، لیکن ابلیس کا وجود ایسا تھا جہاں جناب ممدوح کو بھی اپنی نیازمندی تسلیم کرنی پڑی۔ اس طور پر گویا خدا اور شیطان کی جنگ میں شیطان مظلوم کی حیثیت رکھتا ہے اگر کسی دوسرے ملک الموت کی خدمات ابلیس کو حاصل ہو جائیں تو پھر یہ جنگ برابر کی ہوگی۔

شیطان کی عظمت اور سطوت یوں تو مسلّم ہے، لیکن ایک حیثیت سے انسان کو اس پر تفوّق حاصل ہے۔ انسان خودکشی پر قادر ہے شیطان کو یہ سعادت نہ تو ''خدائے بخشندہ'' کی طرف

سے حاصل ہے اور نہ اُس کو وہ قوت بازو سے مل سکتی ہے۔ اس طور پر گویا شیطان اور ملک الموت ایک سطح پر ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس طویل مدت حیات میں نسلِ انسانی کو اپنی جس اختراع فائقہ پر بجا طور پر ناز ہوسکتا ہے وہ فن خودکشی ہے۔ معلوم نہیں کون پہلی زبردست ہستی تھی جس نے اس ایجاد سے فنونِ لطیفہ میں ایک گراں بہا اضافہ کیا ہے۔ فطرت کی ستم ظریفیوں پر انسان کی آخری فتح خودکشی ہے۔ اگر قدرت کے ہاتھ میں انسان کو مغلوب کرنے کا سب سے زیادہ مہلک آلہ موت ہے تو انسان کی آخری استقامت خودکشی ہے۔ معمولی موت جو اطبا اور ملک الموت دونوں کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے اور خودکشی کی موت میں فرق ہے جسے ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ وادیِ فنا میں دونوں پہنچتے ہیں ایک بطیب خاطر اور دوسرا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر۔ ایک کی فاتحانہ حیثیت ہے دوسری کی مغلوبانہ یا یوں فرض کر لیجیے کہ صحرائے نیستی کو عبور کرنے کے لیے ایک سے جبری خدمت لی جاتی ہے دوسرا اپنی خدمت ایک جاں فروش رضا کار کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ان دونوں میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔

موت زندگی کا آخری حادثہ ہے۔ ناگہانی موت بزدل کے لیے ایک نعمت ہوسکتی ہے، لیکن ایک بہادر کے لیے اتنی ہی حسرت ناک بھی ہے۔ اس لیے خودکشی کے متعلق یہ کہنا کہ بزدلوں کا شیوہ ہے۔ میرے نزدیک کچھ زیادہ وقیع نہیں ہے۔ ہاں اگر انسان مصائب رُسوائی سے مغلوب ہوکر خودکشی کرتا ہے تو اس میں شک نہیں کہ وہ نہایت بزدل ہے کیوں کہ وہ موت کو موت کے خیال سے نہیں حاصل کرتا بلکہ مصائب سے نجات پانے کے لیے اُس کا وسیلہ ڈھونڈھتا ہے اور ایسی حالت میں فنِ خودکشی کی اہانت ہوتی ہے۔ عنوانِ مضمون کے تحت میں جو شعر لکھا گیا ہے وہ ایسے لوگوں کی بدحواسی کا بہترین آئینہ ہے جو گھبرا کر مرنے کی ٹھان لیتے ہیں۔ جب یہاں اُن کی وحشت کا یہ عالم ہے تو پھر کسی دوسری جگہ جہاں وہ بالکل نووارد ہوں گے اُن کی مضحکہ انگیز حالت کا کیا کہنا۔ اس لیے خودکشی "بے چینی" میں کبھی نہیں کرنی چاہیے۔ موت محض موت کے خیال سے اختیار کرنی چاہیے۔ اپنی جان جانِ آفریں کو سپرد کرنے کے لیے امراضِ مصائب یا رُسوائی کا رہینِ منت کیوں ہو۔ ان آفتوں کے مقابلہ میں تو اُسے اپنی جان کی پوری حفاظت کرنی چاہیے۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ جس چیز کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے وہ زیادہ محفوظ رکھی جاتی ہے، اس لیے

جوں جوں یہ اندیشہ کم ہوتا جاتا ہے انسان کو اُس کی حفاظت سے بے نیاز ہو جانا چاہیے۔ میں غالب کے اس شعر کو خودکشی پر کسی حد تک آخری الفاظ سمجھتا ہوں۔

سادگی پر اُس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے [1]

انسان کی پیدائش تو اس کے بس کی نہیں ہے اُس کا تعلق تو اُن لوگوں سے ہے جو حق العباد کو محض افزائش نسل تک محدود سمجھتے ہیں۔ البتہ اُس کی موت اس کی قابو کی چیز ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ اجتہادِ فکر سے کام لے، دنیا کے جتنے معاملات ہیں اُن میں انسان ہمیشہ کچھ نہ کچھ ترمیم تنسیخ کرتا رہتا ہے، لیکن موت کے معاملہ میں وہی لکیر کا فقیر، انسانی فطرت کی یہ قدامت پسندی فنِ موت کے لیے سم قاتل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آج کل کے اطبا و ڈاکٹر موت کی شان نزول میں ندرت پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ راز ہمیشہ صرف فریقین تک محدود رہا اور آج تک کسی پر ظاہر نہ ہو سکا کیوں کہ اطبا کے وہ مورثِ اعلیٰ جنھوں نے سب سے پہلے مرض کا علاج موت سے کیا۔ انھوں نے اپنے جانشینوں کو محض علم سینہ کے چند راز بتائے جن میں سب سے زیادہ اہم یہ تھا کہ ہر مریض کا علاج "مردہ بدست زندہ" کے اصول پر کیا جائے۔ اس لیے اُن بزرگوں کی چابک دستیوں سے محفوظ رہنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے یعنی ہر انسان کو اپنی موت کے انتخاب کرنے میں کامل آزادی دی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ خودکشی کرنے کی آرزو خود فطرت کی جانب سے ہر متنفس میں ودیعت کی گئی ہے اور میرا خیال ہے کہ ہر ایمان دار آدمی بشرطیکہ وہ شاعر نہ ہو خودکشی کا خواہش مند ہوتا ہے، اس لیے سوسائٹی کو چاہیے، کہ اگر شاعروں کا طبقہ کبھی خودکشی کی آرزو بھی کرے تو اُسے سختی سے روکا جائے۔ شاعروں کے لیے انتہائی سزا یہ ہو سکتی ہے کہ انھیں عمر طبعی سے بھی زیادہ زندہ رکھا جائے۔

خودکشی کے لیے سب سے باعثِ ننگ گروہ عاشقوں کا ہے۔ یہ غیر ذمہ دار طبقہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک نرالی حیثیت رکھتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سوسائٹی اس گروہ کے وجود کو کیسے قابل برداشت سمجھتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ دنیا میں ہر شخص کسی نہ کسی وقت سنجیدگی کے

---

1 غالب

ساتھ خودکشی کے مسئلہ پر غور کر سکتا ہے، لیکن ایک عاشق (اگر خود اس کا بیان صحیح سمجھ لیا جائے) گو خودکشی کی تبلیغ میں سب سے زیادہ بلند آہنگی سے کام لے گا۔ لیکن موقع پر آن کر ایسا کترا جائے گا گویا اس خیال سے وہ کبھی آشنا نہ تھا۔ ہاں اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اگر ہر عاشق اپنے قول کا صادق ہو اور اس کے قول و فعل میں کوئی مناسبت بھی ہو تو پھر معشوقوں کا وجود سوسائٹی کے لیے Nuisance (نوای سنس) بھی ہو جائے یا یوں فرض کر لیجیے کہ جس طرح ہر آلودگی اور کثافت کے دفعیہ کے لیے قدرت کی جانب سے انتظام کر دیا گیا ہے اور مختلف چرند اور پرند اس خدمت پر مامور کیے گئے ہیں اسی طور پر اس نوای سنس کے تدارک کے لیے سوسائٹی نے جس میں میونسپلٹی بھی شامل ہے خاک بیز عاشقوں کی جماعت پیدا کی ہے اس لیے حفظانِ صحت کے نقطۂ نظر سے عاشقوں کا وجود بے بہا ہے۔ کیا ایسی حالت میں یہ تجویز برمحل نہ ہوگی کہ ہر گورنمنٹ کو عاشقوں کی جماعت کا کفیل بننا چاہیے۔ اس تجویز میں سب سے بڑا فائدہ یہ مضمر ہے کہ یہ گروہ محض ایک تھوڑی سی ترغیب سے کسی شریف شخص کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جائے گا اور جب تک اُس کی زندگی کو ایک عذابِ جان نہ بنا دے گا چین نہ لے گا۔ موجودہ دور کشاکش میں حکومت کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ کبھی کبھی کسی متنازعہ فیہ مسئلہ کو بحث و استدلال سے طے کرنا چاہتی ہے۔ میرا قیاس ہے کہ اگر وہ اپنے وکلا کا انتخاب عاشقوں کے گروہ میں سے کرے تو پھر بہت سی غیر ضروری اور غیر متعلق باتیں جن کو وہ اپنی سادگی یا سادہ لوحی سے بے حد اہم سمجھتی ہے اُن کی محض ایک ٹھنڈی سانس ایک نا گہانی، لیکن غیر اضطراری غشی اور سامعہ شکن چیخ سے اتمام کو پہنچ سکتی ہے۔ اُن کے یہاں روز و شب کا تخیل اُس نابینا لڑکے سے مستعار لیا گیا ہے جو سی بسر[1] کی مشہور نظم میں کہتا ہے:

"My days and nights myself I make."

دن اور رات (کا تخیل) میں خود وضع کر لیتا ہوں۔

لیکن اس میں خرابی یہ ہے کہ اگر دوسری جماعت نے جس کے خلاف گورنمنٹ صف آرا ہے، اپنی شانِ محبوبیت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اپنے اس خیال پر کہ وہ اس وادی کی امام ہے قائم رہی تو پھر اُلٹی آفتیں گلے پڑیں گی۔ اس کا تدارک صرف ایک صورت میں

---

1. The Blind Boy by C. Cibber

ہوسکتا ہے یعنی فن خودکشی کو قانون کی گرفت سے آزاد کرا دے۔ ممکن ہے اس کے مخالفین اس رعایت سے مستفید ہوں، گو اس مسئلہ میں مہاتما گاندھی کا ایک بیان جو مسٹر میکنزی کے خط کے جواب میں شائع ہو چکا ہے کسی قدر مایوسی افزا ہے۔ مسٹر میکنزی نے سوال کیا تھا "آپ میں کچھ سنس آف ہیومر [1] بھی ہے؟" جس کے جواب میں مہاتما ممدوح نے فرمایا تھا کہ "اگر یہ نہ ہوتا تو اب سے کہیں قبل میں خودکشی کر چکا ہوتا۔" حالاں کہ میرا خیال ہے کہ فن خودکشی کا اصلی ماہر (اگر کوئی ہوسکتا ہے) وہی ہے جس میں مذکورہ بالا صفت بدرجہ اتم موجود ہو، لیکن مہاتما کے اس نکتہ کی بلاغت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اگر انسان اپنے اس حربہ (خودکشی) کو محض اس خیال سے کام میں نہ لائے کہ اس میں بھی ایک طرح کا سنس آف ہیومر ہے تو پھر خودکشی کا فن منتہا کمال پر پہنچ جاتا ہے، لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اس لطیف نکتہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ خودکشی اگر محض خودکشی کے خیال سے کی جائے تو پھر سنس ہیومر کا کیا کہنا، لیکن اگر کوئی شخص زندگی کو ایک وبالِ دوش سمجھ کر خودکشی کا مرتکب ہو تو پھر اُس کی دہقانیت مسلّم ہے جس کا شمار نہ تو حق العباد میں ہوسکتا ہے اور نہ حق اللہ میں یا پھر جیسا ہمارے عزیز دوست نبی احمد صاحب (جو غیر ذمہ دار جملوں کے کہنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں) کا قول ہے ایسا شخص "نہ گدھے میں ہے نہ برہم چاری میں۔"

انسان کی ناگہانی موت، فطرت کا سب سے زیادہ بزدلانہ انتقام ہے۔ غیر متوقع موت میں سب سے بڑی آفت یہ ہے کہ انسان کو اپنے اصلی جوہر کو برسرکار لانے کی نہ مہلت ملتی ہے اور نہ موقع اور محض یہی ایک وجہ ہے کہ دنیا کو اپنی منزل کمال پر پہنچنے میں اتنی دیر لگ رہی ہے اگر انسان اسی طور پر بے تکی اموات کا شکار ہوتا رہا تو پھر کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ دنیا یا حیات انسانی کی تکمیل میں زمانہ لیل و نہار کی کتنی اور کروٹیں لے گا اور جیسی کچھ نامعقول باتیں آج کل روا رکھی جاتی ہیں، اُن پر نظر کرتے ہوئے یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ ابھی دنیا کی رسّی کافی دراز ہے۔ کیا یہ عین ستم ظریفی نہیں ہے کہ جو لوگ مقاصد حیات کی تکمیل کے باعث ہوسکتے ہیں وہ دنیا سے قبل از وقت اُٹھا لیے جاتے ہیں اور اُن کو اتنی بھی مہلت نہیں دی جاتی جتنی ایک ہندستانی ریاست

---

1. ہیومر کا کوئی عام فہم، لیکن جامع و مانع مترادف اردو میں بمشکل مل سکتا ہے کچھ ٹوٹا پھوٹا ترجمہ ہم ذکاوت، جودت یا ذکاہت کر سکتے ہیں۔

اپنے حدودِ حکومت سے نکل جانے کے لیے اپنے متوبین کو دیتی ہے۔ برخلاف اس کے جن لوگوں کا وجود سرے سے بے معنی ہے (مثلاً پچپن سالہ گورنمنٹ ملازم، جمائی لے لے کر وعظ کہنے والا مولوی یا فلسفی معشوق) اُن کو برابر ڈھیل دی جائے۔ اس نقص کا ازالہ محض اس طور پر ہوسکتا ہے کہ نصابِ فنا میں موت اختیاری مضمون کردیا جائے اور دینیات یا اردو کی طرح اسے لازمی نہ قرار دیا جائے۔

میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ زندگی جن شرائط پر تفویض کی گئی ہے وہ کبھی اس قابل نہیں ہیں کہ کوئی سنجیدہ شخص (میں حشرات الارض شعرا کو ایک دفعہ پھر استثنیات میں داخل کرنا چاہتا ہوں) اُن کا پابند رہ کر دنیائے آب وگل میں رہنا گوارا کرے۔ زندگی ایک معاہدہ ہے جس میں خدا اور انسان فریقین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شرائط کے برے یا بھلے ہونے سے بحث نہیں ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ انسان نے ''بہ ثباتِ عقل وحواس' بطیب خاطر ان شرائط کو منظور کیا تھا یا نہیں اور اگر یہاں ''الست بربکم' اور ''قالو بلیٰ'' کا سوال اُٹھایا گیا تو پھر میں مسئلہ جبر و اختیار کو معرضِ بحث میں لاؤں گا۔ جس کا نتیجہ سوائے تشفی بخش ہونے کے سب کچھ ہوسکتا ہے۔ زندگی ایک امانت سہی، لیکن ہر انسان کچھ ٹینس کا بھوت تو ہے نہیں جو مئی کی چلچلاتی ہوئی دھوپ اور شعلہ بیز سموم میں پختہ کورٹ پر روزہ رکھے ہوئے تین بجے دن کو کھیلتا ہوا پایا جائے پھر بھی انسان ہی ہیں۔ اس ودیعت کو واپسی کے لیے اُسے پہلے سے مطلع کرنا چاہیے تو لوگ فوراً بول اُٹھیں گے کہ امراض و کہولت اور اس قسم کے دیگر مکروہات نوٹس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ جب ہم اس مایہ گراں کو پھینک دینے پر راضی ہیں تو پھر اذیت رسانی اور تعجیل طلبی سے فائدہ؟ زندگی کا خاتمہ جاں گسل امراض یا روح فرسا تفکرات سے کیوں ہو؟ فرض کرلیجیے کوئی شخص ریل پر سے کود کر جان دینا چاہتا ہے تو پھر اُس کے اوپر سے ریل کیوں گزرے؟ کوئی شخص تختہ سے مرنا چاہتا ہے اس کی زندگی ضیق گرسنگی سے کیوں فنا کی جائے؟ ایک شخص محض کسی کے جنبشِ ابرو پر نقد جان حوالہ کرنے کے لیے تیار ہے پھر کیا ضرورت ہے کہ کسی فوج داری کے دوران میں اس کی تلی پھٹ جانے کی وجہ سے اس کی موت وقوع میں آئے؟ یہ سب باتیں تو بجائے خود ایک مستقل حیثیت رکھتی ہیں جن کا جواب بہ مشکل دیا جاسکتا ہے۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ناگہانی موت سے انسان کی شرافت نفس مجروح ہوتی ہے ابھی اچھے خاصے تھے تھوڑی دیر میں معلوم ہوا کہ

جاں بحق تسلیم ہوئے اور وہ بھی اس طرح کہ بات چیت نامہ و پیام اشارہ و کنایہ خورد ونوش سب بند حالت کیا ہے؟

نقش کچھ دُھندلے سے ہیں بگڑی ہوئی تصویر کے

اس داروگیر میں مرحوم کو اتنی بھی مہلت نہ ملی کہ وہ اس یک طرفہ فیصلہ کے خلاف اپنی آواز بلند کر سکے یا کم سے کم اس معاملہ کو تعلیم یافتوں کے کسی ایسے کلب میں فیصلہ کے لیے پیش کر سکتے جہاں تعلیمی مباحث کے علاوہ ہر قسم کے دیگر مسائل پر نہایت آزادی سے تبادلۂ خیالات ہوتا ہے۔ مثلاً آپ نے پائجامہ کا یہ کپڑا کس بھاؤ میں خریدا؟ دُھلنے پر یہ کیسا نکلتا ہے؟ یہی نہیں بلکہ قوتِ باصرہ کے ساتھ ساتھ قوتِ لامسہ کو بھی برسرِ کار لایا جائے گا اور وہ بھی اس طور پر کہ جس غریب کے سر پر پرسشِ اعمال کی یہ آفت نازل ہوئی ہے اس خدائی فوجدار کے ہر موقعہ یا بے موقع چابکدستی یا درازدستی پر چونک چونک کر رہ جائے گا۔ ''اسٹاک ایکس چینج کا نرخ تبادلہ کیا ہے''، ''فلاں شخص بدمعاش ہے یا فرشتہ خصلت یا دونوں'' غرض کہ اردو، انگریزی، فارسی، عربی، تاریخ، طب، سائنس، اقتصادیات، ریاضیات، لغویات ہر مبحث پر تبادلۂ خیالات یا تو تو میں میں ہوگا اور اس میں بالعموم ایسے لوگ سب سے زیادہ بلند آہنگی سے حصہ لیں گے جن کو مضمون زیرِ بحث سے اتنا ہی بُعد ہوگا جتنا علی گڑھ میگزین کو پابندی اشاعت سے یا ہمارے چند فاضل قلمی معاونین کو (کاش میں سجاد علی صاحب انصاری علیگ کا نام نہ لے سکتا) ایفائے وعدہ سے!

....

میں خیال کرتا ہوں کہ جدتِ فکر اور ندرتِ خیال کے اعتبار سے خدا کا پایہ ہمارے فہم وادراک سے اتنا ہی بلند ہے جتنا جناب عزرائیل کا پست ہے۔ مجھے خدا کی مصلحتوں اور اس کے پُراسرار احکام سے بحث نہیں ہے۔ ہر وہ ہستی جو اپنے قول و فعل کی جواب دہی سے مستغنی ہے ایسا کرنے کے لیے آزاد ہے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو یا تو وہ اُس منصب کی اہل نہیں ہے یا پھر اُسے اپنی عظمت کا احساس نہیں ہے۔ مجھے شکایت جناب ملک الموت کے وجود سے ہے لیکن اس خیال سے نہیں کہ اُن کے بعض عافیت سوز التفات کو میں کامیابی کے ساتھ گول کر گیا ہوں۔ اب تک تو یہ

رسمی تکلفات برتتے ہیں، لیکن آخر کب تک بے تکلفی نہ پیدا ہوگی ایک دن۔

ع دوستی نادان کی جی کا زیاں ہو جائے گی

میں تو جناب عزرائیل کے افلاس دماغی کا ماتم گسار ہوں کہ لے دے کر صرف ایک ہی کام ان کے سپرد کیا گیا ہے اور وہ بھی جان دینے کا نہیں، بلکہ لینے کا اور بدحواسی کا یہ عالم ہے کہ تمام عالم کا شیرازہ درہم برہم ہوا جاتا ہے۔ میں نہیں خیال کر سکتا اگر ان حضرت کو کہیں جان دینے کی سعادت حاصل ہوتی تو پھر دنیا کا نقشہ کیا ہوتا۔ لیکن یہ خیال کچھ زیادہ اُمید افزا نہیں ہے یہ جس پر جان دیتے ہیں اس کی ناوک افگنی سے دونوں عالم لرز جاتے ہیں۔ ملک الموت کی بدحواسی اتنی رنج افزا نہیں ہے، جتنی مضحکہ انگیز ہے۔ کوئی ان سے پوچھے آپ کسی رسالہ کے آنریری ایڈیٹر نہیں، کسی جگہ کے اُمیدوار نہیں کہ ہر اہل اور نااہل کی تالیفِ قلوب کے لیے بعض اوقات روح فروشی کے لیے بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ وحشت کیا معنی رکھتی ہے؟ اس معاملہ میں اگر میری رائے لی جائے تو میں چند تجاویز پیش کروں گا۔ اوّل تو یہ کہ ان کے مرض کا ازالہ علاج بالمثل کے اصول پر کیا جائے یعنی اُن کی شادی کر دی جائے اور دین مہر میں ایسے خودکشی کا اقرار کیا جائے۔ دوئم ان کے فرائض ایک کمیٹی کے سپرد کر دیے جائیں۔ چوں کہ خودکشی کا لفظ اپنا مفہوم ظاہر کر دیتا ہے۔ اس لیے میں یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ اُس کے اراکین سرے سے نااہل ہوں اس صفت کا اقتضا ہے کہ اراکین ایک دوسرے سے دست گریباں ہوں گے اور چوں کہ اُن کے اختیارات بھی کسی حد تک ''جان لیوا'' ہوں گے۔ اس لیے اس کمیٹی کی رُکنیت کے لیے یہ شرط لازمی کر دی جائے کہ ہر شخص اپنی جان بیمہ کمپنی کے حوالہ کر کے اُس میں داخل ہو اور اگر وہ اس سے اغماض کرے تو پھر اس قدر زجر و توبیخ سے کام لیا جائے کہ وہ جمعہ کے دن مئی جون کے مہینہ میں روزہ رکھے ہوئے کسی پختہ مسجد میں جس کے در و دیوار سے لپٹ نکل رہی ہو، نماز ہی پڑھنے کے لیے تیار نہ ہو جائے بلکہ دونوں خطبوں کے درمیان طول طویل وعظ بھی سنے بشرطیکہ واعظ پر غنودگی طاری ہو جمائیاں لیتا جاتا ہو، اور تقریر کی رفتار دس لفظ فی منٹ ہو۔ سن و سال بھی انہی صفات کے اعتبار سے ہو۔ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر اس دوران میں پیچ و تاب سے کوئی بے ہوش ہو جائے تو اسے نماز جمعہ کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ یا پھر اطمینان سے فریضۂ ظہری ادا کرنا چاہیے؟

مضمون میرے قصہ کے خلاف زیادہ طویل ہوگیا۔ کیا کروں؟ لطیف بود حکایت درازتر گفتم۔

لیکن بعض حضرات جن کے دل نہیں ہے صرف دماغ ہے یا جن کا کاسۂ سر چھوٹا اور عقل زیادہ ہے مجھ پر یہ اعتراض کریں گے کہ خودکشی کی تعریف نہیں کی گئی، یہ مسئلہ اب بھی تشنۂ وضاحت ہے۔ اُن کے لیے میرے پاس صرف ایک جواب ہے یعنی خودکشی۔ سمجھنے کی چیز نہیں ہے بلکہ کرنے کی ہے اگر بعض حضرات کے مذاق سلیم پر بار نہ ہو تو میں عرض کروں گا کہ خودکشی کی مثال ''پہلے کامیاب بوسہ'' کی ہے جو بجائے خود ایک وضاحت ہے اگر کوئی شخص اس کی بھی تشریح چاہتا ہے تو وہ یا تو تشبیہ کی لطافت نہیں سمجھتا یا صرف مکار ہے اور اگر یہ دونوں باتیں اُس میں نہیں پائی جاتیں تو پھر اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس کی عمر چالیس سال سے زیادہ ہے۔

(مطبوعہ علی گڑھ میگزین، علی گڑھ۔ مارچ/اپریل۔1922)

●●●

کاہلی

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو [1]

خودستائی کا بہترین اور مفید ترین طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی اُن حماقتوں کا تذکرہ کرے جو دوسروں کی حماقتوں کی محرک ہوں۔ یعنی لوگ اُس سے بے اختیار ہمدردی ہی نہ ظاہر کرنے لگیں بلکہ اس کے ستائش گزار بھی ہوں۔ اس کے لیے چند صفات لازمی ہیں۔ یعنی تذکرہ کرنے والا خود احمق نہ ہو، لیکن دوسروں کو اس کا اہل سمجھتا ہو اور چوں کہ میں اس کلیہ کو خود پیش کرتا ہوں، اس لیے کم سے کم جہاں تک اس مضمون کا تعلق ہے، ظاہر ہے اس کا اطلاق مجھ پر نہیں ہوسکتا۔

ایام سرما کی وہ راتیں جن کی حرم عنبریں کی پردہ دار صرف سیماب اندام دوشیزۂ قمر ہوتی ہے اور جس کی نزہت آفریں اور پُر سکوت برودت کسی شاعر کے حسیات لطیف کو بیدار کر کے صرف یہ سنانا چاہتی ہے۔

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں! [2]

1، 2 غالب۔

اس لیے نہیں بنائی گئی ہیں کہ انسان فلسفہ اور منطق کی خشک اور افسردہ فضا میں بھٹکتا پھرے، لیکن اس کا کیا علاج، یہاں یہ مسئلہ پیش تھا کہ انسان کی جامع اور مانع تعریف کیا ہو سکتی ہے کیوں کہ اس کے بغیر مضمون زیر بحث کی ابتدا نہیں ہو سکتی تھی۔ کچھ عرصہ تک غور و فکر کے بعد چند خیالات ذہن میں آئے۔ لیکن بدقسمتی سے اُن کا اطلاق یا تو خود مجھ پر ہوتا تھا یا اُن لوگوں پر جو کسی مضمون کو خالی الذہن ہو کر مطالعہ کرنا اپنے جودتِ فکر کی اہانت تصوّر کرتے ہیں۔ دونوں حالتیں خطرناک تھیں اس لیے مجبوراً ان سے دست بردار ہونا پڑا۔ اب دوسری دقت یہ تھی کہ مضمون کی ابتدا کس طرح کی جائے، یہ مسئلہ بھی کافی مشکل ثابت ہوا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ کسی پیچیدہ مسئلہ کا حل صرف اس طور پر ممکن ہے کہ اُسے اور پیچیدہ بنا دیا جائے۔ یہاں تک کہ انسان کو اپنی فکر نارسا کا احساس ہو جائے اور وہ متنازعہ فیہ مسئلہ کے صرف سطحی حل پر اکتفا کر لے۔ مسئلہ کی صورت یہ تھی، انسان کی تعریف مشکل ہے مضمون کا دلچسپ آغاز مشکلات کے اعتبار سے یہ پہلو یک نہ شد دو شد کا مصداق تھا۔ اس کاوشِ ذہنی میں قریب تھا کہ صورت مسخ ہونے لگتی (سنجیدگی کی ایک صفت یہ بھی ہے) اور پھر مجھے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آتا کہ کوئی ستم ظریف مجھی کو دیکھ کر ''انسان حیوانِ متفکر ہے'' کا آوازہ کستا اور میں کچھ اس طرح پیچ و تاب کھاتا کہ اُسے اس کلیہ کی صداقت کا ہمیشہ کے لیے یقین آ جاتا، لیکن شکر ہے ''عقلِ سلیم'' پر نیند غالب آئی اور اب میں باوجود کوشش کے یہ نہیں بتا سکتا کہ پہلے نیند آئی یا کام ختم کیا گیا۔

....

صبح ہوئی اور وہ بھی

''اس تکلف سے کہ گویا بت کدہ کا در کھلا''

پچھلی رات کے تمام افکارِ ذہنی ایک ایک کر کے دماغ آشیاں ہونے لگے، لیکن میرے تعجب کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے صبح کے اس نقرئی فضا میں جو کوئل کی پہلی کوک سے متموج ہو رہی تھی، یک بہ یک یہ محسوس کیا کہ انسان کی صفت نوعی کاہلی ہے اور یہی صفت اس میں اور دیگر مخلوقات میں مابہ الامتیاز ہے۔ لیکن اگر یہ تعریف بعض حضرات کے نزدیک قابلِ اعتراض ہے تو میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس حقیقت سے ناآشنائے محض ہیں اور خدا کرے اُن کا

حشر اُن لوگوں کے ساتھ ہو جو دنیا میں 29 روز کی فروری سے بھی زیادہ تکلیف دہ دن تصور میں لا سکتے ہیں۔

دنیا کے جتنے معرکتہ الآرا مسائل ہیں اُن سب کا آسان ترین حل یہ ہے کہ انسان کاہل بن جائے میں نے غور کیا تو متذکرہ صدر دونوں سوالات صرف اسی مہتم بالشان انکشاف سے حل ہو گئے۔ظاہر ہے کہ آج پھر صبح سے شام تک دنیا اپنی دیرینہ حماقتوں میں منہمک رہ کر بقدر یک یوم اپنی کہولت میں اضافہ کر لے گی۔ اس کی محرومیوں کا اصلی سبب یہ ہے کہ وہ اور اس کی تمام موجودات متحرک ہیں۔ ہر شخص جو آج کشاکش حیات میں مبتلا ہے، اگر ایمان داری سے اپنی زندگی کا جائزہ لے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی ناکامیوں اور ناسازگاریوں کا اصلی راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ سکون کا متلاشی ہے لیکن اپنی حرکت سے باز نہیں آتا۔میرا خیال ہے کہ ہر شخص صحیح منزل مقصود کو غلط راستہ پر چل کر حاصل کرنا چاہتا ہے،اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ہر گم کردہ راہ انسان ایک دفعہ بالکل ساکت ہو جائے ورنہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے کہ فطرت خود اسے ہمیشہ کے لیے ساکت کر دے، ہر وہ فعل جو اختیاری ہو اس فعل سے مستحسن ہے جس کی بنا مجبوری ہو، موت خود زندگی کا ایک وقفۂ سکوت ہے۔

یعنی آگے چلیں گے ستا کر[1]

غلط راستہ پر چلنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ انسان چلنا ہی موقوف کر دے۔اگر مجھے اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ ہر معقول بات فلسفیت پر محمول کی جائے گی گو ان دونوں الفاظ کے مفہوم میں اتنا ہی فرق ہے جتنا معقولیت،اور فلسفیت میں ہو سکتا ہے تو میں یہ کہتا کہ کاہلی انسان کی وراثت فطری ہے انسان بالطبع کاہل بنایا گیا ہے، مقاصد حیات کی ناکامی کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ انسان نے اپنے کو تفحص و تلاش کا خوگر بنا لیا ہے۔شجر ممنوعہ سے برومند ہونا ایک ایسی اجتہادی غلطی تھی (جس میں شیطان کی صفت ملکوتی بھی شامل ہے) جس نے نظام حیات کو ہمیشہ کے لیے درہم برہم کر دیا۔ لیکن اس میں شک نہیں اگر یہ واقعہ رونما نہ ہوتا تو اس دنیا کا تمام حزن و ابتلا خود جنت ہی میں میسّر

1 پورا صحیح شعر اس طرح ہے:

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے + یعنی آگے چلیں گے دم لے کر (مہر)

آ جاتا اور فطرت کو ایک نئی دنیا تخلیق کرنے کی زحمت نہ گوارا کرنی پڑتی۔ جنت کا سب سے زیادہ دلکش پہلو، بشرطیکہ وہاں تک رسائی بھی ہو، یہ ہے کہ وہاں کی دلچسپیاں باستثنا حورانِ بہشتی (اگر وہ قبیلہ حوا سے تعلق رکھتی ہیں) ہماری زحمت و کدوکاوش کی رہینِ منت نہ ہوں گی۔ میری طمانیت خاطر کی انتہا نہیں رہتی جب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ بہشت میں داخل ہونے کے لیے صرف ایک وقت مقرر ہے، ورنہ ممکن تھا کچھ لوگ پہلے ہی پہنچ جانے کی ناکام کوشش کرتے اور وہاں کی فراوانیوں کو تخفیف میں لانے کے لیے سلسلۂ جنبانی شروع کر دیتے، اور جس وقت ہم پہنچتے (اس توقع کی بنیاد عقیدت اور حسنِ ظن دونوں پر ہے) تو معلوم ہوتا کہ خلاف قرارداد صرف ایک ہی حور کا حصہ رسدی قائم رکھا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں ہم میں بہت سے بزرگ ایسے بھی ہیں جو اس انتظام کو مجبوراً دنیاوی نقطۂ نظر سے پسندیدہ نہ خیال فرمائیں گے لیکن ان کو شاید یہ نہیں معلوم ہے کہ وہاں کوئی "بزرگ" پہنچ بھی نہیں سکتے کیوں کہ بہشت کے داخلہ کا معیار صرف شباب ہے۔ یہ ظاہر ہے بغیر شباب کے جنت کا تخیل نہایت پریشان کن ہے۔ معلوم نہیں، اربابِ حل وعقد اُن حوروں کا کیا انتظام کریں گے جو تخفیف میں آ کر اپنے عروسانہ مدت انتظار کو جو اذہبو لعبدی سے شروع ہو کر کربِ لِمن الملک[1] الخ پر ختم ہوتا ہے، صرف ناکامی کرنے پر مجبور ہو جائیں گی۔ بایں ہمہ فردوس کی دلکش فراوانیاں ایک ایسی جنت نظر پیش کرتی ہیں جو نہایت آسانی سے کاہلوں کے لیے سند جواز بن سکتی ہیں۔

ع کسی را با کسی کاری نہ باشد

کاہلی ایک مستقل فن (آرٹ) ہے جس کو سمجھنے کے لیے غور و فکر پر کاربند ہونا ایک اصولی غلطی ہے، آرٹ کی مثال ایک عورت کی ہے جسے سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے اس سے صرف محبت کرنی چاہیے۔ کاہلی کی ماہیئت پر غور کرنے کے بجائے ہم کو اس کی شعریت سے لطف اندوز ہونے کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ کاہلی کا نام جمود نہیں ہے۔ یہ تو صرف سفیہانہ اضطراب اور تگ و دَو کے خلاف ایک خاموش جہاد ہے۔ کش مکش حیات کا پورا نظام صرف ہیئت اجتماعی کی آبادی یا بربادی ملحوظ رکھتا ہے۔ افراد کی ایسی کوئی پرواہ نہیں ہے اس لیے کاہلی افراد کی وہ

1۔ کربِ لمن الملک۔ بڑائی کا ڈنکا لمن ترانی

مقاومت مجہول ہے جسے اجتماع کے خلاف اسے برسرِ کار لانا چاہیے۔ سوسائٹی افراد سے بنتی ہے لیکن اس کے قیام و بقا کا انحصار افراد کی پامالی پر ہے۔ اب اگر ہم اس کلیہ کے ماتحت کاہلی پر غور کریں تو یہ بات نہایت آسانی سے ذہن نشین ہو جائے گی کہ کاہلی فی الحقیقت ایسی مذموم شے نہیں ہے جتنا ہم اپنی سادہ لوحی سے اسے سمجھنے کے عادی ہیں۔

آج تمام دنیا اس پر متفق ہے کہ وقت ایک گراں بہا سرمایہ ہے اسے ضائع نہ کرنا چاہیے۔ لیکن محض اسی بنا پر کہ تمام دنیا اس کلیہ کی قائل ہے، میں اس کی صحت اور جامعیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا بے محل خیال کرتا ہوں۔ بفرضِ محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ وقت ایک بے بہا شے ہے تو پھر اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ اسے ضائع بھی نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں یہ بحث کسی حد تک بے محل ہوگی کہ ضائع کرنے یا نہ کرنے کا معیار کیا ہے۔ بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کے ساتھ اس لفظ کو وابستہ ہی کرنا غلطی ہے۔ بدصورتی، فلسفیت، بدمذاقی، کہولت ایسی چیزیں ہیں جن کا ضائع کرنا یا نہ کرنا بالکل بے معنی ہے۔ یہ ضائع ہونے کے لیے بنائی نہیں گئی ہیں، ضائع کرنا ایک ایسا رفیع خیال ہے کہ اس کے ساتھ ان اوصاف حمیدہ کو متحد کرنا صریح ظلم نہیں تو بدمذاقی ضرور ہے!

دوسری چیزیں ایسی ہیں جو صرف ضائع ہونے کے لیے بنائی گئی ہیں۔ مثلاً شباب، دولت اور وقت۔ شباب کے پرکیف ولولوں اور جذبات کو محض اس لیے مقید رکھنا کہ عہدِ پیری پُر عافیت ہوگا، ایک ایسا خیال ہے جس کے ثبوت میں صرف ایسی بدنصیب ہستیاں پیش کی جا سکتی ہیں جو ریحانِ بہار کی رعنائیوں اور شگفتگیوں سے محض اس لیے لطف اندوز نہیں ہونا چاہتیں کہ ایامِ خزاں کی محرومیاں جاں گسل نہ ہوں۔ شباب رنگینیِ حیات کا وہ لطفِ عمیم ہے جس کی بے دریغ بخشی کے لیے کائنات کا ہر ذرّہ مضمحل اور منتظر رہتا ہے اور جس کا ہر ذرّہ اور ہر جز میں نفوذ اور سرایت کرنا عین فطرت ہے۔

بخیل دنیا کی سب سے زیادہ محروم ہستی ہے۔ بخالت ایک ایسا خسرانِ مبین ہے جس کی تلافی صرف اسراف ہے۔ ممکن ہے کہ بہت سے اصحاب اسراف اور بخالت دونوں کو مذموم خیال کرتے ہوں، لیکن شاید اُن کو نہیں معلوم ہے معصیتِ لطیف اور گناہ بے لذت میں فوق مراتب

بھی ہے۔ دولت کا اصلی مصرف اسراف ہے اور بہترین ذریعہ حصول قرض یہ بحث اقتصادیات کی نہیں ہے بلکہ اخلاقیات کی جسے میں کسی اگلی صحبت کے لیے فی الحال ملتوی کرتا ہوں۔

قرض کا تعلق فنونِ لطیفہ سے ہے۔ اس میں شک نہیں جس طرح آج کل لوگوں نے فنونِ لطیفہ کو کھانے کمانے کا ذریعہ بنا رکھا ہے اور ہر لطیف چیز کو اِس وجنس میں تبدیل کر لینا پسند کرتے ہیں اسی طرح قرض کو بھی ایک بلائے جان تصور کر لیا ہے اور بعض ناعاقبت اندیشوں نے تو اسے مقراض المحبت قرار دے دیا ہے۔ حالاں کہ اصلی معنوں میں اسے عقد المحبت کہنا چاہیے۔

اب رہا وقت اس کے متعلق یہ خیال کتنا صحیح ہے کہ عالمِ حیات کا سب سے بڑا آشوب وقت ہے۔ ہر وہ شخص جس نے وقت کی پابندیوں کو اپنا نظامِ حیات قرار دیا ہے ''آخر وقت میں''. اس کا ماتم گسار نظر آتا ہے۔ معلوم نہیں کب لوگ اس حقیقت پر ایمان لائیں گے کہ انسان وقت کے لیے نہیں بنایا گیا ہے بلکہ وقت انسان کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ وقت انسان کا مرض الموت ہے اور اس کی پابندی، سکرات کی جلد ختم ہو جانے والی گلوگیر ہچکیاں!

....

بالعموم کاہلی کو ہم جمود کا مرادف خیال کرتے ہیں۔ اس رائے کے صحیح تسلیم کرنے سے پہلے ہم کو اس حقیقت پر غور کرنا چاہیے کہ مشغولیت اور انہماک میں فرق بھی ہے۔ انسان مشغول رہ سکتا ہے اور اس کا تعلق اس کی عضوی حرکات سے ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ منہمک بھی ہے۔ انہماک ایک ایسی سعادت ہے جو صرف ایک کاہل کو میسّر آ سکتی ہے۔ آج دنیا میں ہر شخص لکیر کا فقیر بنا ہوا ہے۔ اگر اُس کے افکار ذہنی کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اس کے ہر فعل کی سند جواز صرف اس بے بنیاد اصول میں مضمر ہے کہ چوں کہ لوگ ایسا کرتے آئے ہیں اس لیے اُسے بھی ایسا کرنا لازمی ہے!

آلامِ حیات کی تمام تلخیاں اسی بے راہ روی کی رہینِ منت ہیں، کوئی شخص اس امر پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا عادی نہیں ہے کہ دنیا مختلف طبائع انسانی پر مشتمل ہے۔ اس لیے جو باتیں جماعت سے متعلق ہیں وہ افراد پر لازم نہیں آتیں۔ کاہل اس غلط نظریہ کے خلاف علم جہاد بلند کرتا ہے وہ اپنی تعلیم وتلقین کے لیے پریس یا پلیٹ فارم کا متلاشی نہیں ہوتا۔ اس کے ملہمات خود

اس کے لیے ہیں اور وہ اپنی آپ دنیا ہے۔ وقت کا تخیل اس کے یہاں مفقود ہے وہ وقت کی تقسیم کو محض بے بنیاد ہی نہیں، بلکہ خطرناک بھی خیال کرتا ہے۔ وہ اس حقیقت کا منکر ہے کہ چوں کہ رات زیادہ آچکی ہے اس لیے سورہنا لازمی ہے اور چوں کہ آفتاب لب بام ہے اس لیے تمام مشاغل سے دست بردار ہو کر کسی سن رسیدہ پنشنر کی طرح سنسان باغوں یا میدانوں میں ایک مرنجاں مرنج آسیب کی طرح بھٹکنا چاہیے!

ایک کاہل کی دنیا وقت یا پابندیوں سے مقید نہیں کی جاسکتی۔ دنیا کا ہر شخص اس بات کا ماتم گسار ہے کہ وقت قلیل ہے اور کام زیادہ، لیکن مجھے اُن کی سادہ لوحی پر حیرت ہے کہ آخر اس شکایت کا وہ خود اپنے کو ذمہ دار کیوں نہیں قرار دیتے۔ یہ لوگ معلوم نہیں کب سمجھیں گے کہ وقت کی قلت اور کام کی زیادتی دونوں ایک ہی شکایت ہے۔ وقت کی قلت یوں محسوس ہوتی ہے کہ آپ نے وقت کی تقسیم کر رکھی ہے یا اُسے ایک مدت معینہ خیال کر رکھا ہے اور کام کی زیادتی اس لیے ہے کہ آپ نے اپنی غلطی کے باوجود وقت کو مفلس کا قرضہ سمجھ لیا ہے جو کبھی کم ہو ہی نہیں سکتا۔

وقت کی قلت محض اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ ہر شخص جو غلطی سے اپنے آپ کو مرد معقول خیال کرتا ہے، وقت کو اوقات میں تقسیم کر چکا ہے۔ یہاں پر یہ سوال بالکل بے معنی ہے کہ آیا وہ تقسیم مساوی ہے یا غیر مساوی۔ وقت کا تقسیم ہونا ہی اُس کے غیر مساوی ہونے کی دلیل صریح ہے۔ ایک کاہل کے نزدیک وقت اس کی دلچسپیاں ہیں، وہ وقت کو کبھی ایک بجٹ کی حیثیت نہ دے گا جو ایک سال پہلے ترتیب دیا جاتا ہے اور اُس کے ماتحت تمام اخراجات عمل میں آتے ہیں۔

وقت کی قلت اور کام کی زیادتی، اس لیے بھی محسوس کی جاتی ہے کہ انسان نے اپنے اوپر فرائض اور وہ بھی ضرورت سے زیادہ عائد کر لیے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ فرض کو اتنی اہمیت بھی دینی چاہیے یا نہیں کہ اس کی پابندیوں کو ہمارے طوق گلو ہونے کی سعادت نصیب ہو۔ میرے نزدیک فرائض کی مثال عُرِ دجّال کی ہے جس کی تعریف لوگ آنکھوں میں آنسو بھر کر کرتے ہیں۔ غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ فرض بجائے خود کوئی مستقل شے نہیں ہے فرض نام ہے پابندی کا، لیکن بہت کم لوگ اس حقیقت کا اعتراف کریں گے کہ پابندی کا مفہوم وابستہ ہے، صرف اُن لوگوں کی ذات کے ساتھ جو عدم پابندی کی جرأت پر قادر نہیں ہیں۔ اس لیے یہ تسلیم کر لینا بے جا

نہ ہوگا کہ دراصل فرض، مجبوری کا ایک پُرتمکین مفہوم ہے۔ اس لیے جہاں تک فرائض کا تعلق ہے مجھے یہ کہنے میں پس و پیش نہیں ہے کہ یہ "شے" کمزور کو کمزورتر اور قوی کو قوی تر بنا دینے کا ایک کارآمد آلہ ہے۔ کمزوروں کے لیے فرض ایک فردِ جرم ہے اور طاقتوروں کے لیے محض ایک لائسنس! اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ فطرت، مذہب، حکومت یا معاشرت نے جتنے فرائض مقرر کر دیے ہیں اُن سے کمزور پامال ہوتے ہیں۔ طاقت ور آزاد ہیں اور کاہل مامون!

ایک حکیم کا قول ہے: "کاہلی میں کلفت اور کام میں راحت ہے۔" بذاتہٖ مجھے حکیم صاحب کے خیال سے انتہائی ہمدردی، لیکن صریحی اختلاف ہے۔ اس مقولہ کے الفاظ و فقرے فصیح ہیں، بندش بھی چست ہے جملہ بھی صاف اور شستہ ہے۔ صرف مفہوم غلط اور کس قدر غلط! اس کی اصلاح محض تھوڑی سی اجتہادِ فکر سے ہو سکتی تھی۔ اگر سرسری نگاہ سے بھی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ پورے جملہ میں صرف دو الفاظ کلفت اور راحت میں مقدم و موخر کی غلطی رہ گئی ہے۔ ممکن ہے اصلی نسخہ (مصحح) سے ہمارے خیال کی تصدیق ہوتی ہو۔ بہرحال کام میں جو راحت ہے اس کا ضمنی تذکرہ اوپر کہیں ہو چکا ہے جس کا اعادہ بے سود ہوگا۔ اب رہا کاہلی میں کلفت ہے یا راحت، اس کا اندازہ ایک کاہل کے نقطۂ نظر سے بآسانی ہو سکتا ہے۔ دنیا کا ہر واقعہ خواہ وہ کوئی خارجی حیثیت رکھتا ہو یا ذہنی مستقل بالذات نہیں ہے۔ ہر چیز کی ایک دوسری چیز سے نسبت ہے اور اس نسبت کو ہم ذہن میں رکھ کر تمام چیزوں کی نوعیت کے متعلق حکم لگاتے ہیں۔ لیکن معاملات یہیں ختم نہیں ہو جاتے اور گو بحث نہایت تکلیف دہ طریقہ سے علمی ہوتی جاتی ہے، لیکن دقت یہ ہے کہ اس کے بغیر یہ مسئلہ ایک حد تک تشنۂ وضاحت بھی رہا جاتا ہے۔ ہر واقعہ کے متعلق رائے قائم کرنے والا ایک مورخ کی حیثیت رکھتا ہے اور جہاں تک تاریخ اور تاریخ نویسی کا تعلق ہے مجھے یہ کہنے میں بالکل تامل نہیں ہے کہ تاریخ سائنس نہیں بلکہ آرٹ ہے۔ واقعات کی دو نوعیت ہوتی ہیں ایک تو واقعہ خود اور دوسرا نفسِ واقعہ۔ موخر الذکر کے متعلق ہماری تمام تر معلومات حقدمین کے دلائل و براہین پر منحصر ہیں۔ مورخ کی حیثیت ایک کیمرہ کی نہیں ہو سکتی کہ اس کے صفحۂ قلب پر جن مظاہر کا عکس پڑا وہ متشکل ہو کر بے کم و کاست ہماری نظروں کے سامنے آ گیا۔ دراصل وہ اُن واقعات کا اپنے بضاعت ذہنی کے مطابق مختلف زاویۂ نظر سے مطالعہ کرتا ہے اور ایک زبردست

کسر وانکسار ذہنی کے بعد ان کو الفاظ و بیان کا لباس پہناتا ہے۔ یہاں پر مورخ کا وہی کام ہوتا ہے جو آرٹسٹ کے فرائض میں داخل ہے۔ اس کلیہ کو نظر میں رکھتے ہوئے اب آپ ایک کاہل کی نفسیات پر غور کریں۔ ایک کاہل کے نزدیک رنج و راحت کوئی چیز نہیں ہے، وہ اس بات کا معتقد ہے کہ یہ صرف انسان کا تخیل ہے جس نے حسن و قبح، رنج و راحت، نیکی و بدی کا ایک معیار قرار دے رکھا ہے۔ ورنہ فی نفسہٖ دنیا میں رنج و راحت کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ بہت سی باتیں جواب سے پہلے مستحسن خیال کی جاتی تھیں اب وہ مذموم تصور کی جاتی ہیں۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ آج اخلاق و شرافت کا معیار جیسا کچھ قائم ہو چکا ہے کل تک اپنے بلند پائیگی قائم رکھ سکے گا۔

لیکن اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ رنج و راحت کا واقعی دنیا میں وجود ہے اور انسانی زندگی کی کامیابی کا معیار رنج و راحت کے ایک تناسب معیّنہ پر ہے تو اس سے یہ کیسے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کلفتِ دوام صرف کاہل کے نصیب میں آ چکی ہے یا اس کی زندگی خود اس کے نزدیک نا قابلِ برداشت ہے۔ ایک کاہل کی دنیا موجودہ دنیا اور اُس کے طریقۂ کار سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا حشرِ خیال زمان و مکاں سے مستغنی اور سمتوں سے پاک ہے۔ وہ اس بات کا قائل ہے کہ خدا نے صرف ایک چیز بنائی ہے یعنی فطرت! اور جسے ہم دنیا کہنے کے عادی ہیں وہ صرف انسانی محرومیوں کی ایک شامت زار ہے۔

دنیا اور اس کی آخری حماقت سوسائٹی نے حیاتِ انسانی کو ایسے ایسے اصول و قوانین موضوعہ سے پابند کر دیا ہے کہ ہر انسان بجائے خود اقلیدس کی ایک مشکل (حماری) بن گیا ہے۔ گویا اس کی تمام انسانیت زاویہ اور خطوط میں تقسیم ہو چکی ہے اور اس کے متعلق ایک طفلِ مکتب کی رائے خود اس کی ذاتی رائے سے نسبتاً زیادہ وقیع ہے۔

....

کاہل کو نہایت آسانی کے ساتھ فوق الہستی کہا جا سکتا ہے۔ اسے دنیا باوجود اپنی تمام خرابیوں کے مایوس الحال نہیں بنا سکتی ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ وہ لوگ بھی جو اپنی ذہانت اور جودت کی وجہ سے خستہ اور مجہول ہو رہے ہیں، کاہل کے نقشِ قدم پر چل کر پر عافیت زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال جسے تجربہ نے اور قوی کر دیا ہے یہ ہے کہ فطرت خود انسان کو مسرور

رکھنا چاہتی ہے اور اگر ہم خوش رہنا چاہیں تو ہمیشہ خوش رہ سکتے ہیں۔ مناظر اور مظاہر فطرت ہماری دل بستگی کے بہترین اسباب ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم فطرت کے ساتھ ہمدردی پیدا کر لیں اور یہ محسوس کریں کہ خدا نے کائنات اور اس کی تمام موجودات محض اس لیے پیدا کیے ہیں کہ وہ ہم سے ہم آہنگ رہیں۔ میں اس تمام بحث کو زیادہ ذہن نشین بنانے کے لیے مثال سے کام لیتا ہوں، لیکن ناظرین سے یہ درخواست کروں گا کہ تھوڑی دیر کے لیے وہ اس خیال کو امتحاناً ترک کر دیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے مایوس ہو چکے ہیں اور ایک کامل کی قابلِ رشک زندگی اور اُن کی خوبیِ قسمت میں ہمیشہ ایک بوسیدہ کمند اور ''دو چار ہاتھ'' کا فاصلہ رہ جائے گا۔

فرض کیجیے ایک شخص اپنے کسی عزیز کی دائمی مفارقت کا سوگوار ہے یا امتحان گاہ حیات میں اُسے ناکامی سے دوچار ہونا پڑا ہے یا اسی قسم کی کسی دوسری مصیبت میں مبتلا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ فطرت نے ان تمام مصائب کی تلافی کا کیا سامان کر رکھا ہے اور وہ کس کس طریقہ سے اس کی تالیف قلب کی کوشش کر رہی ہے۔ اس میں شک نہیں فطرت کی نظر کرم کسی مخصوص فرد کی طرف کبھی نہیں اُٹھتی، لیکن اس کی بساطِ نگاہ ایک ایسی عافیت زار ہے جس میں ہر محرومی تحلیل ہو کر کامرانی کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔ مثلاً دن کی تمام ہنگامہ آرائیاں آفتاب کی آخری زعفرانی کرنوں کے ساتھ لحدِ مغرب میں اُتر چکی ہیں کچھ لکہ ہائے ابر طفلانہ لااُبالی کے ساتھ حاشیۂ فلک سے اُٹھتے ہیں اور بساطِ نیلی کے بکھرے ہوئے متاعِ الماس کو جھولیوں میں ڈالتے ڈالتے نوخیز بلکہ شب کی آستین و دامن سے ہم آویز ہونا چاہتے ہیں۔ ہوا رُک رُک کر چلتی ہے اور پھریریاں لے لے کر تھمتی ہے۔ فضائے اثیر خنک آلود سکوت اور ان مسرتوں سے لبریز معلوم ہوتی ہے جو ایک غیر محسوس طریقہ سے روح میں نفوذ کرتی جاتی ہیں۔ قمر پنبہ شکار ابر سے بے اختیار ہو ہو کر برآمد ہوتا ہے اور لطیف ہوا کی آخری دامن افشانی کے ساتھ ہمارے محزوں اور محروم قلب کو تبسم زار بناتا ہوا ہلکے سے پرواز کر جاتا ہے، اور ہم ایک لمحہ کے لیے محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہماری روح بالیدہ ہو کر ماہ تاب کی آخری کرنوں کا تعاقب کرتے ہوئے فضائے علیین کے زاویۂ عافیت میں اس سے ہم آغوش ہو جائے گی۔ اس انتہائے وارفتگی میں ہم اکثر بھول جاتے ہیں کہ ہماری ذات جسم اور جسمانیت کی گراں باریوں سے محدود اور محصور بھی ہے۔ فطرت کی رعنائیوں کا یہ ادنیٰ اعجاز

ہے کہ اس کی لطافت اس کی پذیرائی اور اس کی آویزش ہم کو ہمارے دنیاوی رنج و آلام سے بہت بلند کر دیتی ہے۔ ہم محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہماری مسرت اور طمانیت کا سرمایہ بالکل ختم نہیں ہو چکا ہے اور ہماری روح فطرت کی ان غیر محدود اور پاکیزہ خوش گواریوں سے اب بھی راحت گیر ہوسکتی ہے۔ دنیا باوجود اپنی تمام آلودگیوں کی فطرت کے دامن کو ملوث نہیں کر سکتی، لیکن فطرت کا ہر جلوہ اور اس کی نیرنگیوں کا ہر پہلو حیاتِ انسانی کی جملہ کلفتوں کو چشم زدن میں فنا کر دیتا ہے۔ فطرت کا سنجیدہ سکوت اور اس کا دلکش تبسم انسانی مصائب کا مضحکہ کبھی نہیں اُڑاتا۔ اس کی خاموش ہمدردی تصنعات سے پاک ہوتی ہے۔ وہ صبر یا شکر کی تلقین نہیں کرتی وہ اپنی تعلیم کی گراں باریوں سے ہماری اذیتوں کو زیادہ ناقابلِ برداشت نہیں بناتی۔ فطرت صرف اپنی دلکش رعنائیوں کا حسن آباد ہماری نظروں کے سامنے پیش کر دیتی ہے اور ہم بغیر کسی ارادہ یا کوشش کے اپنے حسن نظر کو پورے طور پر کارفرما بن جانے دیتے ہیں۔ ہم صرف اپنی تکالیف کو نہیں فراموش کر دیتے بلکہ خود فطرت کی تماشا زائیوں کے ایک جزو بن جاتے ہیں۔

لیکن اگر ہم کسی وجہ سے دبستانِ فطرت کے اس پیغام راحت و آشتی سے لطف اندوز نہ بھی ہونا چاہیں پھر بھی انسان کے لیے بہت سی ایسی (داخلی) چیزیں ہیں جو اُسے مایوس اور افسردہ ہونے سے باز رکھ سکتی ہیں۔ حقیقی طمانیت وہ ہے جو انسان خود محسوس کرے۔ شہرت اور نام وری کی بنا ایک عام غلط فہمی پر ہو سکتی ہے۔ دنیا کسی کو نہایت قابل، نہایت سخی، اور نہایت مجمع سمجھ سکتی ہے لیکن وہ شخص جس کی ذات کے ساتھ یہ صفات وابستہ کی جاتی ہیں اُس وقت تک مسرور اور مطمئن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ وہ خود نہ محسوس کرے کہ واقعی اس کے افعال اور کردار بھی سچے اور مخلصانہ ہیں۔ میں اب تک یہ نہیں سمجھ سکا ہوں ایسی مدح و ستائش سے انسان کس طرح مسرور ہوسکتا ہے جس کی بنیاد غلط فہمی پر ہو، اور ایسی لعن طعن سے وہ کیسے محزوں اور دل گیر ہوسکتا ہے جو فی الحقیقت بے بنیاد ہو۔ مجھے یہاں بے اختیار ایک واقعہ یاد آتا ہے، کسی شخص کے متعلق عام بدظنی پھیلائی جارہی تھی، کہا جاتا تھا اُس کا بھائی مردود ترین ہستی ہے، خائن ہے، سنگ دل ہے، بدکردار ہے اور آبرو ریز ہے۔ مجلس عامہ نے اس شخص کو طلب کیا۔ تمام مجمع فرطِ غضب سے تلملا رہا تھا۔ پوچھا گیا ''تم اور تمھارے بھائی سوسائٹی کے لیے نہایت خطرناک ثابت ہو رہے ہو کیا تمھارا بھائی ایسا ہی

زشت کردار ہے جیسا کہ اُس کے متعلق کہا جاتا ہے؟'' مجمع اُس شخص کے سکوت اور اطمینان سے اور برافروختہ ہو گیا۔ مکرر سوال پر اُس نے اپنی اشک آلود نگاہیں صدر کی طرف پھیر کر کہا:

''میرے آقا! کاش میرا کوئی واقعی بھائی ہوتا۔''

مجمع سے ایک نعرۂ تحسین اُٹھا اور وہی شخص جسے کچل ڈالنے کے لیے ہر فرد نعل در آتش تھا لوگوں کے شانوں پر نظر آیا!

ابھی یہ کہا جا چکا ہے کہ خود انسان کی طبیعت اس قسم کی بنائی گئی ہے کہ وہ اگر محسوسات خارجی سے لطف اندوز نہ ہو سکے اور اس کی دل گرفتگی اور دل تنگی کا ازالہ نہ ہو سکے، پھر بھی بہت سے ایسے واقعات ہیں جو خود اُس کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ اس کے رنج و محن کو راحت اور انبساط سے بدل سکتے ہیں۔ حیاتِ انسانی کا کیسا ہی روح فرسا واقعہ کیوں نہ ہو جس سے قلب و جگر کی دھجیاں اُڑنے لگی ہوں ایک نیک انسان کی قلبی راحتوں کو فنا کرنے میں ہمیشہ ناکامیاب رہے گا۔ دنیا میں کون انسان ہے جس نے کبھی نیکی نہ کی ہو جس کا دل محبت سے مغلوب نہ ہوا ہو۔ ہر شخص نے کبھی نہ کبھی (نادانستہ طور پر بھی) کوئی ایسا کام کیا ہوگا جس سے کسی دوسرے شخص کو اطمینان یا راحت نصیب ہوئی ہوگی۔ کچھ ایسی ہستیاں ضرور ہوں گی جو اس کے رنج و راحت سے ملول یا مسرور ہوتی ہوں گی۔ اس سے بھی قطع نظر کر لیجیے خود اس میں محبت کی صلاحیت ہوگی وہ اپنے گرد و پیش کی موجودات سے ہمدردی رکھتا ہوگا۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جو انسان کو اپنی زندگی سے مطمئن کر سکتی ہیں۔ کیا انسان اس حقیقت کو نہیں محسوس کر سکتا کہ اگر وہ خود محزون اور ملول ہے اور کوئی اس کا شریک حال نہیں ہے تو پھر وہ خود اپنے وجود کو دوسروں کی راحت اور عافیت کا ذریعہ بنا سکتا ہے۔ کیا یہ خیال اور اس پر عمل پیرا ہونا، دنیا کی تمام عارضی مسرتوں سے گراں نہیں ہے؟ ع

شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد[1]

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ناظرین خیال کرتے ہوں گے کہ یادہ گوئی کی یہ آخری سنجیدہ بلا ناقابلِ برداشت ہے، لیکن آخر ایک کاہل کی جرأت رندانہ سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے!

● (مطبوعہ: علی گڑھ میگزین۔ جنوری/فروری 1922)

---

1. رات ختم ہونے کو ہے اور ایک فسانہ سے دوسرا افسانہ پیدا ہو رہا ہے یعنی داستان بہت طویل ہوتی جاتی ہے۔

فلسفۂ فریب

آموں کا ایک گنجان باغ طوطوں کی جولاں گاہ اور ایک فلسفی کی تفریح گاہ تھا۔ باغبان اس اجتماع ضدّین کو ہمیشہ مشتبہ نظر سے دیکھتا تھا، لیکن اپنی نفسیات کے اعتبار سے سیاحتیمین کے اُس زمرہ میں تھا جو دنیائے حیات میں صرف آتشیں شعلے دیکھ سکتے ہیں، دبی ہوئی چنگاریوں کے قائل نہیں، یا جو گرمیِ محفل کو "لطفِ خرامِ ساقی" و "ذوقِ صدائے چنگ" کا رہینِ منت خیال کرتے ہیں اور شمع کے خاموش گداز کو خاطر میں نہیں لاتے۔

باغبان کو طوطوں کے فاتحانہ یلغار کا سدِ باب کرنا تھا فلسفی کی سول نافرمانی اس کے نزدیک اس وقت تک بے حقیقت تھی جب تک ان بزرگ کی نظر آم کے درختوں سے ایک بالشت بلند یا سطح زمین سے ایک بالشت نیچے ہو یا وہ طوطوں کی فطرت سے واقف تھا۔ اس نے ایک دن باغ کی چاروں طرف لمبے لمبے ستون نصب کر دیے اور ایک طویل رسّی میں جس میں نرکل کی چھوٹی چھوٹی نلکیاں (تیلیاں) پروئی ہوئی تھیں، ان ستونوں سے اس طور پر منسلک کر دیں کہ تمام باغ حصار میں آ گیا۔ طوطوں کا خاصہ ہے کہ وہ جائے نزول پر پہنچنے سے قبل پاس ہی کی بلند جگہ پر تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جاتے ہیں اور پھر باغ میں ان کی شانِ نزول ان براتیوں کے مانند ہوتی ہے جو تمام دن پیدل سفر کر کے جب دیارِ عروس میں پہنچتے ہیں تو سب سے پہلے ان کو ایک ایسے مقام کی تلاش ہوتی ہے جہاں مسئلۂ ہضمیات پر غور کرنے کے لیے خالی الذہن ہونا اتنا ضروری نہیں ہے جتنا "تہی معدہ" ہونا۔

ایک روز حسب معمول فلسفی محشرستانِ خیال بنا ہوا، باغ میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ کئی طوطے نلکیوں کو پنجے میں لیے ہوئے اُلٹے لٹکے ہوئے ہیں اور نہایت شد و مد کے ساتھ ''ٹیں ٹیں'' کی ضرب لگا رہے ہیں اور رسّی میں جھول رہے ہیں، لیکن نلکیوں کو 'محکم گیر' کے اصول پر چھوڑنے کا نام نہیں لیتے۔ باغبان تو اس موقع کا منتظر تھا ہی، پہلے تو اس نے ان کا خیر مقدم ایسی سخت اور پر جوش گالیوں سے کیا کہ اگر کوئی ''داروغہ جی'' سن پاتے تو تعزیرات ہند کی ایک ہی دفعہ سے باغبان صاحب کی ساری عریاں شاعری خاک میں ملا دیتے، لیکن خیر ہوئی کوئی موجود نہ تھا۔ اس نے ایک ایک کو چرخ دے کر زمین پر اس زور سے دے دے مارا کہ ہر منچلا ''ٹیں'' ہو گیا۔ فلسفی کے ذہن میں آیا کہ یہ سب کچھ طوطوں کی جہالت کا نتیجہ تھا اگر ان میں تعلیم کا صحیح ذوق پیدا کر دیا جائے تو وہ اس آفت سے محفوظ رہیں گے۔ اس خیال کا آنا ہی تھا کہ ہمارے دوست نے طوطے کے بچے خریدنے شروع کیے، اور انھیں حسب ذیل فقرے رٹا دیے۔

''ہم پردار جانور ہیں، شکاری کے نرکل پر کبھی نہ بیٹھیں گے اور اگر بیٹھیں گے تو پر پھڑ پھڑا کر اُڑ جائیں گے۔''

طوطے بقدر استعداد اپنا تعلیمی زمانہ وقتاً فوقتاً ختم کر کے قفس سے آزاد ہوتے رہے۔ فلسفی کو ان دنوں اس کار خیر میں ایسا انہماک رہا کہ وہ ایک عرصہ سے باغ میں نہ جا سکا تھا۔ ایک دن گھومتے پھرتے اس کا گزر پھر اُسی باغ میں ہوا اور اس کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کے تمام شاگرد اسی طرح رسّی میں آویزاں ہیں اور زبان پر

''ہم پردار جانور ہیں، شکاری کے نرکل پر کبھی نہ بیٹھیں گے اور اگر بیٹھیں گے تو پر پھڑ پھڑا کر اُڑ جائیں گے۔'' ہے!

....

کیا یہ لطیفہ انسان کے قول و فعل کا آئینہ نہیں ہے وہ کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ، وہ اپنی اصل حقیقت کو ہمیشہ چھپانا چاہتا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ حقیقت مستحسن ہے یا غیر مستحسن۔ وہ اپنے مطلب برآری کے لیے ہر ایسے قول یا فعل کا دعویٰ کرے گا جس سے شاید اسے کوئی نسبت بھی نہ ہو، ہر شخص اگر اپنے قلب و دماغ کا جائزہ لے اور ایمان داری سے اعتراف نہ کرے تو اسے

معلوم ہوگا کہ اس کا ہر قول و فعل اور اس کے تمام حرکات و سکنات کسی نہ کسی حد تک مکارانہ ہیں۔ دنیا ایک مہتم بالشان مکر ہے، کیوں کہ اس میں انسان بستے ہیں۔ میں دنیا کی اس صفت کو پسند کرتا ہوں کیوں کہ میں خود انسان ہوں اور اپنی کمزوریوں کو ایک ایسی بڑی ہستی میں جلوہ فرما دیکھ کر مطمئن اور مسرور ہو جاتا ہوں۔ ریاکاری، مکاری کا صرف ایک لطیف پہلو ہے جسے تہذیب انسانی نے ایک آرٹ بنا دیا ہے۔ یہ سوسائٹی کی جنت نگاہ ہے۔ ایسے لوگ کم ہیں جو اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ دنیا کی ہر بھلائی یا برائی فی نفسہٖ کوئی حقیقت نہیں رکھتی اس کا وجود صرف سوسائٹی کے فیصلہ پر ہے۔ اخلاقیات کے نام نہاد و پاکیزہ اصول جن کی آڑ میں انسان اپنی درندگی کو چھپاتا ہے، مکاروں اور ریاکاروں کا وہ تکیہ کلام ہے جو صرف اس کے خبثِ نفس اور فاسد کلامی میں روانی پیدا کرتا ہے۔ دنیائے تمدن کے جس پہلو پر نظر ڈالی جائے یہ حقیقت نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ حکومت کے قصر استبداد میں آپ نے مدبرانِ سلطنت کی معرکتہ الآرا تقریریں سنی ہوں گی۔ جادو بیاں خطیبوں کی فصاحت و بلاغت سے آپ مسحور ہوئے ہوں گے، لیکن کیا آپ نے کبھی ان بزرگ ہستیوں کے ''کار دیگر'' کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ بین الاقوامی صلح و عافیت کا نظام مرتب کرنے لگیں گے تو دنیا محسوس کرے گی کہ آلام حیات سے نجات دلانے والے صرف یہی چند نفوس قدسیہ ہیں جن کا وجود ہمارے لیے پیام رحمت ہے۔ محکوم اقوام کو آزاد کرانے کے لیے اپنے آہنیں دلائل پیش کریں گے تو معلوم ہوگا کہ انصاف و مساوات کے علم بردار ابھی دنیا سے ناپید نہیں ہوئے ہیں۔ کسی ملک کی پیداوار کو ترقی اور وسعت دینے کا بیڑا اُٹھائیں گے تو ظاہر ہوگا کہ عاقبت اور مرفہ الحالی کا دیوتا ابھی ابھی عرش سے نازل ہوا ہے۔ تہذیب اور شائستگی پھیلانے کے لیے کمربستہ ہوں گے تو معلوم ہوگا کہ جہالت اور کوتاہ نظری کے لیے اب شاید نئے زمین و آسمان پیدا کیے جائیں گے۔ لیکن کون نہیں جانتا عالم گیر صلح نام ہے طاقت ور سلطنتوں کے اس باہمی معاہدہ کا جس کے الفاظ اور فقرے کمزور اور بے بس اقوام کے خون سے لکھے جاتے ہیں ان کی لغت میں محکوم اقوام کو آزاد کرانا ان کو فنا کر دینے کا مرادف ہے، ان کا انصاف ان کی بے پناہ تلواروں کی برش ہے۔ کسی ملک کی پیداوار کو ترقی اور وسعت دینا ان کے نزدیک وہ ضیقِ گرسنگی ہے جو صرف ان بدنصیب ہستیوں کے لیے خدا نے مخصوص کر دی ہے جنھوں نے اس ملک کے فضائے بسیط میں آنکھ کھول کر اپنی

زندگی کا ثبوت دیا۔ تہذیب اور شائستگی پھیلانے کا سب سے زیادہ موثر آلہ وہ ہے جو انسان کو جلد سے جلد فنا کے تاریک اور انتہائی گہرائیوں میں پہنچا دے۔ خلوص اور نیک نیتی کسی شخص کے سن وسال، وضع قطع، اطوار وگفتار سے نہیں آزمائی جاتی۔ اس کے لیے کسی معبد گاہ کا متبرک گوشہ یا زیارت گاہ کا مقدس آستانہ نہیں ہوتا، شرافتِ نفس کے لیے شخصیتوں کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ صفت قلوب میں ہوتی ہے۔ عالی شان قصر ومحلات کے لیے ضروری نہیں ہے کہ اس کی طاق و در کی تزئین اس کے مکینوں کی عالی منشی اور صفائی قلب کی ترجمان ہو۔ دنیا میں کوئی شخص اتنا عالی منش، نیک طینت اور فرشتہ خصلت نہیں ہے جتنا لوگ اسے سمجھتے ہیں یا وہ خدا اپنے آپ کو تصور کرتا ہے۔ ہر انسان جو دوسروں کے متعلق بھلی یا بری رائے قائم کرتا ہے اپنے معیار کو صحیح نہیں رکھ سکتا۔ غلو انسان کی فطرت ہے!

....

اب تک ریاکاری کے کرشموں پر جو کچھ اظہار خیال کیا گیا ہے اس کا تعلق جمہور سے تھا، یہ ایک اصولی بحث تھی۔ اس سے یہ فرض نہیں کر لینا چاہیے کہ افراد اس فریب فطری سے بالکل آزاد ہیں۔ دنیا کے کسی فرد کی مثال آپ ذہن میں رکھ کر اس اصول پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کم وبیش یہ سعادت ہر ایک میں پائی جاتی ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ فی نفسہٖ دنیا کی ہر چیز یا واقعہ جو انسان کے افعال و کردار سے تعلق رکھتا ہے ناقص ہے۔ یہ صرف انسان کی ذہانت اور اس کا سلیقہ ہے کہ ہر قبیح چیز حسین معلوم ہونے لگتی ہے۔ کسی چیز کے ناقص کہنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ انسان کے ہر فعل ذہنی یا غیر ذہنی کی ذمہ دار اس کی فطری کمزوری ہے۔ اگر انسان فطرتاً کمزور نہ بنایا گیا ہوتا تو آج مذہب، سلطنت، سوسائٹی اور اس کے تمام اصول ناپید ہوتے۔ اس کلیہ کو مدنظر رکھ کر آپ غور کریں تو آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ سکیں گے کہ دنیا کی ہر چیز نامکمل اور ناقص ہے۔ اگر انسان اس حقیقت کا قائل نہ ہوتا تو کبھی ریاکاری ومکاری کی طرف مائل نہ ہوتا۔ اس طور پر میں ان دونوں چیزوں کو فطری سمجھتا ہوں۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ ہر بھدی اور قبیح چیز کو حسین اور دلکش بنانے کے لیے سلیقہ کی ضرورت ہے۔ میں اس نظریہ کی دلیل میں وضاحت سے نہیں بلکہ صرف ایک مثال سے کام لینا چاہتا ہوں۔

ہمارے بے شمار کرم فرماؤں میں سے شاید ہی دو ایک بزرگ ایسے ہوں (میں اپنے ایک عزیز محترم کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے اس کلیہ سے چالیس سال کی قید اُٹھادوں گا) جو کسی نہ کسی وقت اُس لطیف معصیت سے کیف اندوز نہ ہوئے ہوں جسے عرف عام میں عشق یا محبت کہتے ہیں۔

محبوب کا ہر ناز و انداز جس پر ایک عاشق اقدامِ خودکشی کے لیے تیار رہتا ہے کسی ''شریف آدمی'' کے نزدیک ناپسندیدہ اور نافرجام خیال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن عاشق کے جنون، کسرِ نفسی یا حسنِ اخلاق کو کیا کہا جائے وہ انھیں پر مقدارِ معینہ سے زیادہ ''افیون'' کھانے کے لیے تیار رہتا ہے۔ حالاں کہ یہی ''شے'' اگر قاعدہ سے استعمال کی جائے تو ہر انسان بلا منت غیرے فلسفی بن سکتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہی نامعقول ادائیں کچھ ایسے انداز سے ظاہر کی جاتی ہیں کہ عاشق کے فضائے سینہ سے گرم و سرد آہوں کا مان سُون (موسمی برساتی ہوائیں) اُٹھنے لگتا ہے۔ اگر عشق و محبت کی اُن اضافی حیثیات سے جو مرورِ ایام سے سُنَنِ عاشقی میں داخل ہوگئی ہیں، قطع نظر کرلیا جائے تو میرے نزدیک ہر فلسفی عاشق ایک حادثۂ منطقی ہے ایک معمولی دل و دماغ رکھنے والا عاشق کسی نہ کسی حیثیت سے ریاکار ہوسکتا ہے، لیکن ایک فلسفی کا عشق کبھی ریاکارانہ نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ وہ ان انسانی کمزوریوں سے بالاتر ہوتا ہے جس پر خلقت انسانی کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اس کی یہ حالت اس بات کی مقتضی ہے کہ اس کے لیے ایک منطقی معشوق تلاش کیا جائے۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ اجتماع ہر حیثیت سے دلچسپ ہوگا۔

لیکن یہاں امر بحث طلب یہ ہے کہ ریاکاری کس حد تک جائز ہے اور مغالطہ کو ریاکاری سے کیا تعلق ہے۔ ریاکاری جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں ایک فطری کمزوری ہے جس سے گلوخلاصی ناممکن ہے۔ لیکن ریاکاری اور مغالطہ میں کچھ ایسی مناسبت ہے کہ ان کا ایک دوسرے سے علاحدہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ مغالطہ ایک قسم کی بھدی سی ریاکاری ہے اور اسی بنا پر میں اسے سب سے زیادہ نفرت انگیز چیز خیال کرتا ہوں کیوں کہ ریاکاری اس وقت تک برداشت کی جاسکتی ہے جب تک وہ جارحانہ رویہ نہ اختیار کرے۔ لیکن ایک ریاکار یہ دیکھ کر کہ دنیا دیگر اہم مشاغل میں منہمک ہے اور اس کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ اشتداد کی طرف مائل ہونے لگتا ہے اور

جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، ریا کاری کا اشد ادی یا جارحانہ پہلو مغالطہ ہے۔ ایک ریاکار، ریاکاری سے دوسروں کو دھوکا دینا چاہتا ہے اور کبھی کبھی کامیاب بھی ہوتا ہے لیکن ایک ایسا شخص جس پر مغالطہ کا جن سوار ہے، اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اور وہ بھی اس طور پر کہ تمام دنیا اس حقیقت سے واقف ہو جاتی ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ اپنی اس عریاں حماقت کو دوسروں کی عقلِ سلیم اور قوتِ برداشت سے بالاتر سمجھتا ہے!!

ایک شخص جس کا بازاری لب و لہجہ اور عامیانہ مذاق دہقانیوں کے حلقہ میں بھی باعث ننگ خیال کیا جا سکتا ہے۔ جب کبھی ادبی قلابازیوں پر اُتر آتا ہے تو سمجھنے لگتا ہے کہ رقاصہ فلک و فنشی فلک بھی اس کے آگے طفلِ مکتب ہے، لیکن وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہیں خیال کرتا کہ دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس کے مغالطہ کو عین دہقانیت پر محمول نہ کرنے سے اگر کبھی معذور رہے تو سب سے پہلے زہر کھالیں گے۔ وہ شاید یہ کبھی نہیں محسوس کرتا کہ اس سے لوگوں کا تعرض نہ کرنا محض اس باعث سے ہے کہ وہ ایک حادثۂ حماقت ہے، جس پر انسان کو ہنسنا چاہیے اس کا ماتم کرنا بے معنی ہے۔ یہ بزرگ مغالطہ کی صف اولین میں ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا میں مغالطہ کی بنیاد اس حقیقت پر رکھی گئی ہے کہ ہر انسان حسین اور دلکش بننے کی آرزو رکھتا ہے اور جس شخص کو جتنا ہی حسن سے بُعد ہوتا ہے اتنا ہی وہ حسین بننے کی کوشش کرتا ہے اور شاید سب سے زیادہ مضحکہ انگیز وہ منظر ہوتا ہے۔ جب ایک شخص تنہائی میں کسی آئینہ کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ ایک دن کا واقعہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا، ایک بزرگ جن کو حسن سے وہی مناسبت تھی جو سائنس کو شعر و شاعری سے یا عشق کو بیوی سے ہے۔ آئینہ کے سامنے ''کنگھی چوٹی'' میں مصروف تھے۔ میں اتفاق سے ایسی جگہ بیٹھا ہوا تھا جہاں سے میں ان کو بخوبی دیکھ سکتا تھا، لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ آرائش کے تمام لوازم ختم ہوئے تو اُنھوں نے اپنے چہرہ کا بغور مطالعہ کرنا شروع کیا۔ میں نہیں کہہ سکتا اُنھوں نے اپنے چہرہ کو کس کس طور سے حرکت دی۔ کبھی مسکراتے، کبھی آنکھیں کھولتے بند کرنے لگتے، کبھی چہرہ پر یاس و حسرت طاری کر لیتے، کبھی آنکھوں سے اشارہ و کنایہ کی ادا ظاہر کرتے، کبھی عتاب کا رنگ غالب نظر آتا تھا تو کبھی انتہائے بے کسی طاری ہو جاتی، کبھی بقول آغا حیدر صاحب لبوں کو سکوڑ کر بٹوے کی صورت

بناتے۔غرض کہ پانچ منٹ تک وہ اسی طور پر عضلات کی ورزش کرتے رہے۔آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بے اختیار ہنس پڑا۔اب جو دیکھتا ہوں تو مولانا کے چہرہ پر وہ کیفیت طاری تھی جواب تک آئینہ میں نظر نہیں آئی تھی۔شاید یہ ان کا اصلی رنگ تھا۔

....

ریا کاری کے اسباب وعلل پر بحث ہو چکی، اب اس کا علاج بھی سن لیجیے۔اس سلسلہ میں میرا یہ کہنا بے موقع نہ ہوگا کہ ہر ریا کار کو لال بجھکو ہونے سے احتراز کرنا چاہیے۔ ہر ریا کار کے لیے سب سے بڑی آفت یہ ہے کہ وہ ہر بات کو یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ صرف اس کی حیثیت کو مدنظر رکھ کر کہی گئی ہے۔ یہ انتہائی زیادتی ہے خیر کسی نامعقول بات کے متعلق اگر وہ یہ رائے قائم کر لے کہ یہ اُس کا حق تھا اور وہ انا البغلول کہہ کر چک پھیریاں کرنے لگے تو مضائقہ نہیں، لیکن ایک اچھی معقول بات کو اپنے اوپر محمول کر لینا اس کی ایک ایسی زیادتی ہے جو کبھی معاف نہیں کی جا سکتی۔ مجھے بے اختیار یہاں ایک لال بجھکو کا قصہ یاد آتا ہے جسے میں بعض حضرات کی عبرت اور دوسروں کی تفنن طبع کے لیے عرض کروں گا۔

کسی گاؤں میں ایک پرانی روشنی کے لال بجھکو رہتے تھے (جس زمانہ کا میں تذکرہ کر رہا ہوں اس میں ہر گاؤں صرف ایک ہی لال بجھکو کا متحمل ہو سکتا تھا، اب تو وکلا کے درمیان صرف حاکموں کا وجود ان کی باقیاتِ صالحات میں شمار کیا جا سکتا ہے) جناب لال بجھکو نے ایک دن بھر بھری لے کر، ہجرت کا ارادہ کر لیا، تمام گاؤں میں کہرام مچ گیا۔سب لوگ جمع ہوئے اور جناب کی خدمت میں حاضر ہو کر ایک دوسرے کے دیرینہ تعلقات پر ایک نہایت ''پُرمغز'' خطبہ پڑھا۔اس کے بعد منتخب لوگوں کا ایک وفد باریاب ہوا۔لوگوں نے کہا، ''آخر آپ ہم کو کس پر چھوڑ کر جاتے ہیں آڑے وقت پر ہمارے کون کام آئے گا۔غور کیجیے آج کل کیسے کیسے مشکل مسائل پیش آئے اور سب آپ ہی کے تصرف سے تکمیل کو پہنچے۔ وہ دیکھیے اس روز بدھوا کے گائے خریدنے پر مٹھوا نے کیسا ''فیل'' (فعل) مچایا کہ گائے تو میں خریدنا چاہتا تھا، تو نے کیوں خرید لی۔ اچھا اگر گائے تیری ہے تو دودھ میرا! ہم سب کے سب سر مار کر رہ گئے۔کوئی تصفیہ نہیں ہوتا تھا آخر آپ کے پاس آئے تو آپ نے چٹکی بجاتے اس طرح جھگڑا چکا دیا کہ گاؤں بھر میں آج تک

دھوم ہے۔'' لال بجھکّڑ ہر روز کوئی نہ کوئی جدت پیدا کرتے رہتے تھے۔ انھیں اس وقت یاد نہیں رہا تھا کہ معاملہ کی نوعیت کیا تھی اور پھر ہر شخص ایسے موقع پر تجاہل عارفانہ سے بھی کام لیا کرتا ہے تا کہ اس کے کارنامے اس کے سامنے نئے سرے سے دُہرائے جائیں۔ لال بجھکّڑ نے کچھ بے تعلق سا ہو کر دریافت کیا۔ ''کون سا فیصلہ؟'' لوگوں نے یک زبان ہو کر 'ارے وہی'، لال بجھکّڑ کا۔ ذہن اب بھی منتقل نہ ہوا، ذہین آدمی تھے سمجھ بوجھ کے کہنے لگے ارے وہی نہ؟'' لوگوں نے کہا ''ہاں ہاں وہی!'' معاملہ اتنے ہی پر ختم ہوا جاتا تھا کہ ایک شخص جو بالکل نووارد تھا پاس والے شخص سے پوچھنے لگا۔ ''بھئی آخر کیا فیصلہ ہوا تھا؟'' اب لوگ کہاں تاب لا سکتے تھے، غریب کو برا بھلا کہتے کہتے قریب تھا کہ اس مسئلہ کو ''بزورمشت'' سمجھانے لگتے۔ ادھر لال بجھکّڑ کا توسنِ خیال بھی ''اسٹیپل چیز'' میں مصروف تھا، لیکن کالم بائی کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ آخر میں نہایت استغنا اور سنجیدگی سے چمکار کر فرمایا، ''ارے میاں اُس فیصلہ کو بتا بھی دو۔'' حاضرین نے کہا ''ہرگز نہیں بتائیں گے یہ شخص جان کر انجان بنتا ہے۔'' بارے لال بجھکّڑ کی سفارش کے بعد لوگوں نے فیصلہ دُہرایا، تصفیہ یہ ہوا تھا کہ گائے بدھوا کی اور دودھ مٹھوا کا بشرطیکہ مٹھوا بھی گائے کی پوری قیمت فروخت کرنے والے کے حوالہ کردے!!!

بہرحال لوگوں کی عرض معروض سنتے سنتے لال بجھکّڑ یک دم غضب ناک ہوئے اور فرمانے لگے۔ ''تم سب بڑے نالائق ہو'' آخر میں کب تک تمہارے ساتھ رہوں گا، کبھی نہ کبھی تو میں بھی مروں گا اس وقت تم کیا کرو گے۔ آخر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا کب سیکھو گے؟'' اتنا کہا اور بوریا بستر دبا گاؤں سے چل دیے۔ لال بجھکّڑ کے جانے کے تھوڑے ہی دن بعد گاؤں میں کوئی ایسا واقعہ پیش آیا کہ سب لوگ لال بجھکّڑ کی عدم موجودگی بُری طرح محسوس کرنے لگے۔ آخر کار کچھ لوگ یوسفِ گم گشتہ کی تلاش میں چل کھڑے ہوئے اور بہ ہزار دقت لال بجھکّڑ کو ڈھونڈ ھ نکالا۔ معمولی علیک سلیک کے بعد لال بجھکّڑ نے تکلیف فرمائی کی وجہ دریافت کی۔ رئیس الوفد نے پہلے کچھ بے معنی فقرے تمہید میں کہے، اس کے بعد من وعن تمام واقعہ سنایا۔ لال بجھکّڑ تھوڑی دیر تک غور کرتے رہے، کبھی سوچتے سوچتے داڑھی مونچھ کے بال منہ میں دبا لیتے کبھی آنکھوں کی پتلیوں کو اس طور پر حرکت دیتے کہ صرف سپیدی ہی سپیدی نظر آنے لگتی تھی، کبھی آسمان کی طرف دیکھتے کبھی

زمین کی طرف متوجہ ہوتے ،لوگ دم بخود بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں لال بجھکڑ نے سر کو اس طور پر جنبش دی کہ لوگوں کو اطمینان ہو گیا کہ پیرومرشد نے گتھی سلجھائی، اور اب صرف فیصلہ صادر ہونا باقی رہ گیا ہے۔ لیکن چشم زدن میں لال بجھکڑ نے ایک نعرہ مارا اور بغیر کسی رسمی یا ابتدائی تکلف کے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ حاضرین بھی تو آخر انھیں کے وابستگانِ دامن میں سے تھے، لال بجھکڑ کی ابھی پہلی ہی گنگری ختم نہیں ہوئی کہ انھوں نے بھی فوراً تال وسُر ملا لیا اور ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد لال بجھکڑ نے دوسری کروٹ لی اور ایک فرمائشی قہقہہ لگا کر فرطِ خوشی سے لوٹنے لگے۔ لوگوں نے یہ دیکھا تو ٹھٹھے مارنے میں مشغول ہو گئے۔ یہ مرحلہ بھی ختم ہو گیا تو لال بجھکڑ یک بہ یک ''سیریس'' (سنجیدہ) ہو گئے۔ لوگ آنسو پونچھنے اور ناک صاف کرنے سے فارغ ہوئے تو آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے کہ آخر اس نالہ وقہقہہ سے پیرومرشد کا کیا اشارہ ہے۔ لال بجھکڑ نے خود ہی اس معاملہ پر روشنی ڈالنی شروع کر دی، فرمانے لگے۔ ''بھائی میرے، میں رویا تو اس لیے کہ جانتا تھا کہ تم میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو میری عدم موجودگی میں ایک دن کے لیے بھی میرا کام سنبھال لے گا اور یہ بھی جانتا تھا کہ تم لوگ مجھے کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈھ نکالو گے اور ہنسا اس پر کہ جو بات تم دریافت کرنے آئے ہو وہ سچ پوچھو تو مجھے بھی نہیں معلوم!''

....

میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کتنے لوگ ایسے ہیں جن پر لال بجھکڑ کی ٹوپی ٹھیک اُترتی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ آج کل کا موسم اُن جراثیم کی نشوونما کے لیے خصوصیت کے ساتھ موزوں ہے جو اکثر وبیشتر کسی لال بجھکڑ یا حاجی بغلول میں پائے جاتے ہیں۔ میرے تعجب کی انتہا نہیں رہتی، جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ لوگوں میں ''انا البغلول'' کا وظیفہ نہایت مقبول ہو رہا ہے۔ میں ایک شاعر یا مصنف کی سب سے زیادہ بدنصیبی یہ خیال کرتا ہوں کہ اس کے نام کے اُچھالنے والے نااہل ہوں اور میں ہر مصنف کو اس امر کا مستحق خیال کرتا ہوں کہ اس کے الفاظ کو یا ان الفاظ کے مفہوم کو غلط معنی پہنانے والے کے خلاف وہ عدالتی چارہ جوئی کرے۔

میں نے مضمون کے ابتدا میں جو لطیفہ لکھا ہے اسے نظر میں رکھ کر آج آپ اپنا اور ان بزرگوں کے کیریکٹر کا جائزہ لیں جو ''ملک اور قوم''، ''قوم کے بچے اور ان کی تعلیم''، ''ہمارا تعلیمی

مسلک اور مطمح نظر" اور اس قسم کے دیگر بے معنی لفاظیوں کے شیدائی بنے پھرتے ہیں، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کی حالت بجنسہٖ ان طوطوں کی سی ہے جن کی زبان پر نہایت معقول اور پاکیزہ الفاظ ہیں، لیکن ان کی حرکات اور انجام کو ان الفاظ سے کیا نسبت ہے۔ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب دیتے وقت ہر شخص ایک طرف اپنی آمدنی وخرچ، اور دوسری طرف اپنی ذاتی قابلیت کا خیال کر کے لرزہ براندام ہو جائے گا۔ لیکن اس کا اثر کیا ہوگا؟ تمام طاقت صرف اس پر صَرف کی جائے گی کہ ہم میں کتنے لال بجھکو پیدا ہوئے اور ان کے فیصلہ سے کس کو گائے ملی اور کس کو دودھ اور فروخت کرنے والا کون ہے!!!

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
اسے یوسف کے بوئے پیرہن کی آزمائش ہے [1]

(مطبوعہ: علی گڑھ میگزین۔ مئی/ جون 1922)

●●●

---

1 غالب

پاگل خانہ

''دلا دیوانہ شو، دیوانگی ہم عالمی دارد''[1]

سُنا ہے مصیبت میں انسان فلسفیت پر اُتر آتا ہے۔ کچھ ''اللہ ہی بہتر جانتا ہے'' اس حالت میں خود فلسفی کیا کر گزرتا ہوگا۔ علی گڑھ کی عافیت سوز گرمیاں ایسی نہیں ہوتیں کہ کالج بند ہونے پر انسان کبھی ''نشیب'' پر غور کر سکتا ہو۔ سوائے اس حالت کے جب گھر تک پہنچ جانے کے لیے جیبوں کی آبادی محض اپنے دونوں ہاتھوں پر مشتمل ہو یا پھر ایسے دوست نہ موجود ہوں جو قرض دیں اور تین ماہ تک خط نہ لکھیں۔ یہ الفاظ دیگر نیکی کریں اور بھول جائیں!

حرارت پاکر ''شئے لطیف'' اور سیال بن جاتی ہے ایسی حالت میں ''فرار'' پر غور کرنا عین فطرت ہے۔ نینی تال، کشمیر، مصوری اور دارجلنگ وغیرہ اُن خوش قسمت ہستیوں کی جولاں گاہ ہے (باستثنا اُن بزرگوں کے جن کو میرے اس خیال سے اختلاف ہے!) جن کو فطرت کی جانب سے جو چیز سب سے زیادہ بے بہا حاصل ہوئی ہے وہ صرف اُن کی ''خوش قسمتی'' ہے!!

16 رجولائی کو کالج بند ہوا اور اُسی روز ہم اپنی سطح تلاش کرنے کے لیے نشیب کی طرف مائل ہوئے۔ راستہ میں دو مقامات پر گاڑیوں نے ہماری رفاقت گوارا نہیں کی تاہم بغیر کسی ''ماجرا''

1۔ اے میرے دل تو دیوانہ ہو جا کہ دیوانگی کی ایک الگ دنیا ہے۔

یا ''حادثہ'' کے 17 کو مکان پہنچ گیا۔ ہمارے ایک دوست عزیز کے نزدیک لفظ ''ماجرا'' تمام داستانِ حسن و عشق کا ایک ''لطیف مُلخّص'' ہے۔ مرشد (یادش بخیر) ''حادثہ'' کو صرف مرگِ ناگہانی یا تعزیراتِ ہند کی اُن دفعات سے متعلق سمجھتے تھے جو قابلِ دست اندازیِ پولیس ہیں۔ کچھ دنوں تک مکان پر رہا۔ اس سال بادو باراں کی جیسی کچھ یورش رہی ہے وہ ظاہر ہے، لیکن بایں ہمہ دماغ اب بھی علی گڑھ کی تابستانی فضا کا ایک نمونہ تھا، پھر در و دیوار کی قید کب گوارا کی جاسکتی تھی۔ یہاں عمل کو ارادہ کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ جنوں ہی کیا جس میں عمل کو ارادہ پر تقدم نہ حاصل ہو۔ سب سے پہلے اعظم گڑھ کی طرف رُخ کیا جس جگہ کا میں ذکر کر رہا ہوں وہاں چھوٹی لائن پر ''کم خرچ بالانشیں'' کا فلسفہ اس دلیری سے برتا جاتا ہے کہ تاجِ برطانیہ کی ہر وفادار رعایا کا ''قبلہ نما'' دل، بقول آغا حیدر صاحب بتاشے کی طرح بیٹھنے لگتا ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ہر اسٹیشن پر ماکولات کے بجائے بے ٹکٹ مسافروں کی یلغار سے عہدہ برآ ہونا پڑے۔ اعظم گڑھ میں مولانا سہیل صاحب[1] کا مہمان بنا بے فصل کے آم اور فصلی شاعری سے لطف اندوز ہوا۔ دارالمصنفین کی زیارت کی آرزو ساتھ لے گیا تھا، لیکن علی گڑھ کی دیرینہ صحبتیں کچھ اس طور پر یاد آئیں کہ پورے چوبیس گھنٹہ تک ذہن کسی اور طرف منتقل ہی نہ ہوا۔ بالآخر مولانا کے ساتھ ساتھ یہ آرزو بھی ہمراہ ہی واپس لایا۔ دوسرے دن ہم لوگ اس ارضِ پاک پر پہنچے جہاں حزیں کا ''سرشوریدہ''[2] بالینِ آسائش تک پہنچا تھا۔[3]

کعبۂ ہندوستان بنارس کا تذکرہ اُن لوگوں کے سامنے کیسے کیا جائے جو
خوش باش دمے کہ زندگانی ایں است

---

1. اقبال احمد خاں سہیل 11 ربیع الاوّل 1303 ہجری کو بر ہرہ ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ 8/ نومبر 1955 کو اعظم گڑھ میں انتقال ہوا۔

2. زبان دانِ محبت بودہ ام دیگر نمی دانم — ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغامی رسید ایں جا
حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم — سرشوریدہ بر بالینِ آسائش رسید ایں جا (کتبہ لوحِ مزار)

3. ملاحظہ کیجیے ''مولانا سہیل'' مشمولہ گنج ہائے گراں مایہ، حصہ دوم، م۔ ندیم (علیگ) لطیف الزماں خاں، صفحہ 45، مطبوعہ: دانیال کراچی، دسمبر 1991 (مرتبین)

کے منکر ہیں۔ ایک دن حسنِ اتفاق سے ایک ایسے مقام پر گزر ہوا جس کا نام سن کر ہمارے بہت سے کرم فرما اُچھل پڑیں گے۔ یعنی

''بیت المجانین!''

پاگل خانہ کا دروازہ کھلا اور ہم لوگوں نے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک عجیب نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ چند بزرگ وارد دروازہ پر پذیرائی کے لیے موجود تھے۔ ایک صاحب نے نہایت تپاک سے فرشی سلام کیا، لیکن معاً دو قدم پیچھے ہٹ کر اس طور پر دیکھنے لگے گویا بجائے سلام کے ہم کسی دوسرے سلوک کے مستحق تھے۔ چہرہ پر پرخشونت کے آثار تھے، زیرلب کچھ فرماتے بھی جاتے تھے کہ اتنے میں ایک زقند بھری اور کیاریوں پر سے پھلانگیں مارتے ہوئے دور نکل گئے۔ ایک دوسرے حضرت نے جو ہمیں عرصہ سے ملاحظہ فرما رہے تھے یکا یک قہقہہ لگایا اور چور! چور! کہتے ہوئے اس طور پر بھاگے گویا پاگل خانہ پہنچ کر بھی ہم اپنی حرکت سے باز آنے والے نہ تھے۔ جدھر نظر اُٹھ جاتی تھی یہ معلوم ہوتا تھا گویا ہم لوگ اُس زمانہ میں پہنچ گئے ہیں جب نوعِ انسان نے دنیائے آب وگل میں پہلے پہل آنکھیں کھولی تھیں۔ کسی کے جسم پر لباس کا ایک تار بھی نہ تھا۔ ایک صاحب ایسے بھی ملے جو وہاں کے بادشاہ مشہور تھے۔ ہاتھ میں پپیتے کا ایک خشک ڈنٹھل تھا۔ لباس ایسا صاف اور ستھرا تھا کہ اگر اُن سے دوسری حرکات نہ بھی سرزد ہوتیں تو محض ان کی پاکیزگی دیکھ کر ''جنوں'' کا حکم لگایا جا سکتا تھا۔ اوّل تو یہ خود ہر وقت متحرک رہتے تھے ورنہ پھر اس کی کو ان کی زبان پوری کرتی رہتی تھی۔ ایک لحہ بھی ایسا خالی نہ گیا جس میں یہ کچھ نہ کچھ نہ فرماتے رہے ہوں اور ایک لفظ بھی ایسا نہ تھا جو ہماری سمجھ میں آیا ہو۔ اُن کی رعایا اُن سے اتنی ہی مستغنی تھی جتنی کسی پاگل حکمراں کی ہو سکتی ہے۔

وہ پاگل جن کے متعلق ذی ہوش لوگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ خطرناک ہیں، چھوٹے چھوٹے کمروں میں مقید تھے۔ اس میں ایک صاحب ایسے نظر آئے جن کا خیال ہے کہ دورِ حیات کی کشاکش انسان کی محض ایک اجتہادی غلطی سے رونما ہوئی ہے یعنی بجائے اس کے کہ اُس نے پاؤں کے بل کھڑا ہونا سیکھا اسے سر کے بل کھڑا ہونا چاہیے تھا اور چوں کہ بعض لوگوں نے اس ترکیب کے غلط معنی پہنائے اور بجائے اس کے کہ وہ اپنے جسم کا بار اپنے سر پر رکھتے دوسروں کے

سر کو اپنے پاؤں سے گراں بار کیا اس لیے اُس کا نمونہ وہ بنفسِ نفیس پیش کر رہے تھے۔ دروازہ کی آہنی سلاخوں سے لگے ہوئے اُلٹے کھڑے تھے میرے ساتھی اُن کی اس ہیئت کذائی کو دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑے، لیکن میرا خیال ہے اور ممکن ہے کہ یہ وہاں کی آب و ہوا کا اثر ہو۔ عالمِ حیات کی متعدد ناکامیوں کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم جس راستہ کو صحیح اور جس معیار کو کامل سمجھتے ہیں وہ دراصل ایسے نہیں ہوتے۔ حقیقت اُن کے عکس میں مُضمر ہوتی ہے اگر انسان ہمارے مجنوں دوست کے فلسفہ پر خالی الذہن ہو کر غور کرے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ بعض اوقات وہ جن تدابیر اور وسائل کو تکمیلِ مقصد کے لیے اختیار کرتا ہے بعد میں اُنھیں کو اپنی مایوسیوں کا سبب پاتا ہے۔

ابھی میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ہم لوگوں کا گزر ایک ایسے کمرے کے پاس سے ہوا جس میں ایک کہن سال بزرگ محبوس تھے۔ بشرہ سے ذہانت کے آثار ہویدا تھے۔ دل میں خیال آیا کہ ان سے گفت وشنید کا موقع مل جائے تو خوب ہو، ہماری صورت سوال دیکھ کر اُنھوں نے فارسی کا ایک شعر اور اُس کے بعد اُسی مضمون کا ایک سنسکرت اشلوک پڑھا۔ اُس کے بعد فلسفۂ مذہب واخلاق پر اس خوش اسلوبی اور شدومد کے ساتھ بحث کی کہ ہم سب دنگ رہ گئے۔ ہم لوگوں نے سوال کیا کہ آخر وہ کس بنا پر اور کب سے زندان کی کڑیاں جھیل رہے ہیں۔ فرمایا ''چھ سال سے یہاں ہوں اور میرا قصور صرف یہ ہے کہ لوگ مجھے اور میں دوسروں کو مجنوں سمجھتا ہوں۔'' تھوڑی ہی دیر میں پھر اُنھوں نے کچھ اشعار اور دوہے پڑھنے شروع کیے اور نصائح اور پند کا آغاز کیا۔ ہم لوگ اس کے کہاں متحمل ہو سکتے تھے۔ شاید اُسے انھوں نے محسوس کیا فرمانے لگے ''اچھا کچھ اشعار ہی اور سن لیجیے۔'' غرض کہ دس منٹ میں انھوں نے سینکڑوں اشعار سنا دیے۔ اک طوفان تکلم تھا کہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ بالآخر ہم لوگ چل کھڑے ہوئے، لیکن جوں جوں ہم بڑھتے گئے اُن کی آواز بھی بلند ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ جب انھوں نے یہ دیکھ لیا کہ ہم لوگ بالکل مخاطب نہیں ہوتے تو پھر صلواتیں سنانے پر آ گئے اور فرداً فرداً ہماری اس بری طرح خبر لی کہ ہم لوگوں نے محض اس خیال سے آپس ہی میں ایک دوسرے سے شرمندہ نہ ہوں، خواہ مخواہ کے دور از کار اور بالکل غیر متعلق مبحث پر اس طور پر گفتگو کرنے لگے تو گویا ہم سب کو اس موضوع سے مساوی دلچسپی تھی۔ یہ بات اکثر دیکھی گئی ہے کہ غلطی یا نادانستگی سے جب کوئی ایسا فعل سرزد ہو جاتا ہے

جس سے ناظرین میں سے کسی کو ندامت ہوتی ہے یا رنج پہنچتا ہے تو جلد سے جلد ہم کسی ایسے مضمون پر اظہار خیالات کرتے ہیں جو سرتاپا مہمل ہوتا ہے۔ لیکن مجبوراً اس میں انتہائی انہماک یا بقول شخصے ''سنجیدگی'' ظاہر کرنی پڑتی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ حضرت شاعر تھے!

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس قسم کا مجنوں صرف اُسی طبقہ کی پیداوار ہوسکتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ہر شخص اُس کے شعر کی داد دینے کے لیے اتنا ہی پابند ہے جتنا کہ ایک مسکین ایڈیٹر کسی مہمل اور لغو مضمون کو شائع کرنے کے لیے مجبور۔ ایک عاشق اپنے محبوب کو دنیا میں سب سے زیادہ حسین اور جاذب نظر پاتا ہے، لیکن اگر دنیا کے سب لوگ اُس کے منظورِ نظر کو ایسا ہی سمجھنے لگیں تو کوئی مجھے بتائے ان دونوں کا کیا اور کیسا حشر ہو! موخر الذکر کا انجام تو کچھ نہ کچھ ہو ہی رہے گا۔ اوّل الذکر البتہ قبل از وقت واصل بحق ہو جائیں گے۔ ان حضرات کو کون سمجھائے کہ آپ کا مضمون خود آپ کو جتنا عزیز ہے، کوئی ضروری بات نہیں ہے کہ دوسرے بھی اُسے اتنا ہی پسند کریں۔

باغ اور کھیتوں میں بھی پاگل ہی مصروفِ کار پائے گئے۔ کام کرنے والے اور کام لینے والے دونوں مجنوں تھے، لیکن یہ عجیب بات تھی کہ جو پاگل موخر الذکر طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کی اطاعت سے کسی کو انکار نہ تھا۔ ان کا ہر لفظ قانون تھا اور محض قانون ہی نہیں بلکہ اس کا نفاذ بھی۔ پھل اور ترکاری سے کسی کو تعرض نہ تھا، ہر کام کو سلیقہ اور ترتیب سے کرتے تھے۔ ایک کوئیں سے پانی کھینچا جاتا تھا۔ کچھ دور پر ایک نہایت زبردست پہیا لگا ہوا تھا جس کو پندرہ بیس پاگل گھمار ہے تھے۔ رسّی پہیا میں لپٹتی جاتی تھی اور بڑا آہنی ڈول اوپر نیچے آتا جاتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک ننگا مادر زاد تھا۔ ان پر ایک دفع دار مامور تھا جس نے ہماری اس طور پر پذیرائی کی کہ گویا ہم سب بھی اسی چکّر کے اسیر تھے! اس میں شک نہیں کہ ایک حد تک اُس کا خیال صحیح تھا۔ وہ سب اگر مجنوں تھے تو ہم مکار! اُن کا ظاہر باطن یکساں تھا۔ ہم ایسا کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے تھے کسی وقت ایک من چلا جنونِ وحشت میں دنیا کا میدان تنگ پا کر کوئیں کی گہرائیوں میں صحرائے عدم کا جائزہ لینے کے لیے اُترا اور پھر نہ اُبھرا۔ اس لیے کوئیں کے منہ پر آہنی سلاخیں لگا دی گئی تھیں۔

مجھے ایک پاگل کی صورت عرصہ تک نہ بھولے گی، جو کھیت میں ایک طرف چھپا بیٹھا تھا اور ہم لوگوں سے اُسی طرح خائف اور متوحش تھا۔ جیسے کسی صحرائی ہرن نے پہلے پہل کسی خون خوار

شکاری کو دیکھا ہو۔لرزہ براندام ہو اور بھاگ نہ سکتا ہو۔ پھر ایک بائیس سالہ نوجوان تھا، نازک اندام معصوم صورت اور نہایت نیک فطرت۔ جس وقت لوگ اُسے ہمارے پاس لائے ہیں اُس کے تمام جسم میں تھرتھری تھی وہ کچھ نہیں بولتا تھا، صرف نیم وا دہن اور ڈبڈبائی آنکھیں اُس کے پورے جذبات کی ترجمانی کرتی تھیں۔ ہم نے بیٹھ جانے کے لیے اشارہ کیا تو فرطِ تشکر سے مبہوت ہو کر یک لخت بیٹھ گیا۔ اُس کے بعد اُٹھ کر جانے لگا اور ہر چار پانچ قدم چلنے کے بعد ہم سب کو مڑ مڑ کر دیکھتا جاتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاگل خانہ کی زندگی میں شاید اُسے یہ پہلا موقع نصیب ہوا تھا کہ لوگ اُس سے مہربانی سے پیش آئے تھے۔ جذبۂ تشکر ہر انسان کے بشرہ کو نورانی بنا دیتا ہے، لیکن ایک ایسا شخص جو رسمیت یا عقل و فہم سے بالکل نا آشنا ہو اُس پر جب کبھی یہ حالت طاری ہوتی ہے تو یہ منظر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

آخرکار ہم لوگ وہاں سے رخصت ہوئے، یہاں جو بات مجھے سب سے زیادہ عجیب نظر آئی وہ یہ تھی کہ کوئی شخص یہاں ایسا نظر نہ آیا جو آزاد ہونے کے لیے بے قرار نہ ہو۔ نوجوان بھی دیکھے اور کہن سال ایسے بھی دیکھے جو خطرناک ہونے کی وجہ سے کوٹھریوں میں مقید تھے اور ایسے بھی نظر آئے جو احاطہ میں آزاد گھوم رہے تھے۔ لیکن ان میں کوئی ایسا نہ ملا جس نے آزاد کر دیے جانے کے لیے ہم سے الحاح و زاری نہ کی ہو۔ مجھے بعض اوقات یہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ ان کو صرف آزادی کا جنون ہے ورنہ ہر طرح سے اُن کا دماغ صحیح ہے۔ میرا خیال ہے کہ آزادی کی تمنا انسان میں فطری نہیں بلکہ ساری ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ آزادی کے لیے بقید ہوش و حواس کسی ممکن قربانی سے دریغ نہ کرنا جنوں کی علامت ہے تو پھر یہ کیا بوالعجبی ہے کہ انتہائے جنوں میں بھی انسان اسی آزادی کے لیے پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے!

بہشت کے متعلق کسی شاعر کا مشہور شعر ہے۔

بہشت آں جاست کاں زاری نہ باشد
کسے را بہ کسے کارے نہ باشد!! [1]

---

[1] ترجمہ: جنت وہ جگہ ہے جہاں کسی سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچے گی اس لیے کہ کسی کو کسی دوسرے سے کوئی کام ہی نہ ہوگا۔

پاگل خانہ اس خیال کی جیتی جاگتی تصویر ہے، یہاں کسی کو کسی سے تعلق نہیں۔ ہر شخص بجائے خود ایک انسٹی ٹیوشن ہے۔ نہ اپنی فکر نہ دوسرے کا غم۔ دولت و نکبت، حلم و تمرد، عزت و ذلت، حسن و عشق، سن و سال تمام چیزیں ایک ہی سطح پر نظر آئیں گی۔ ہر شخص بے باک، عریاں اور کشاکش حیات سے بالکل مستغنی۔ کامیابی، ناکامیابی اُن کے یہاں ایک بے معنی فقرہ تھا۔ مناصب پرستی عنقا، دنیا کی بے بنیاد تمنائیں مفقود، سوسائٹی کے قیود کالعدم، سزا و جزا، جبر و اختیار، یزداں واہرمن کا تخیل ناپید! زندگی کا یہ نصب العین کیا قابلِ رشک نہیں ہے؟

مجھے اپنے پاگل دوست کا، ہم کو دیکھ کر چور! چور! کہہ کر بھاگنا کبھی نہ بھولے گا۔ ہم میں سے کون اس حقیقت کا منکر ہوسکتا ہے کہ وہ چور ہے۔ کیا ہر شخص دوسروں کے مال و مناصب، علم و کمال، عشق و محبت، ایثار و قربانی پر طامعانہ نظریں نہیں ڈالتا، کیا وہ اپنے قلب کی انتہائی گہرائیوں میں یہ محسوس نہیں کرتا کہ وہ دوسروں کو ان نعمتوں سے محروم کر دینا چاہتا ہے اور محض یہی نہیں بلکہ ان سے خود مستفید بھی ہونا پسند کرتا ہے۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ہم اکثر قلبی دوستوں کی طرف سے مشتبہ ہو جایا کرتے ہیں اور بعض دفعہ اُن کے خلاف ایسے وسوسوں کو دل میں جگہ دیتے ہیں جن کا ہم اشارتاً کنایتہً بھی کبھی تذکرہ نہیں کرتے، خود انسان کی فطرت اسی کمزور بنیاد پر رکھی گئی ہے۔ انسان کو دیگر جان دار مخلوق پر اس وجہ سے ترجیح دی گئی ہے کہ اس میں عقل و شعور کی صلاحیت ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ صلاحیت بجائے خود محض ایک اضافی حیثیت رکھتی ہے۔ شاہدِ مقصود کریہہ منظر ہو یا بہشت شمائل نقاب، اس کی حیثیت یا فطرت کو بدل سکتا۔ عقل و تمیز فی الحقیقت ایک نقاب ہے جسے فطرت نے اپنے ناکمل یا ناقص مصنوعات کی پردہ پوشی کے لیے وضع کیا ہے۔

میرے نزدیک اور یہ میری ذاتی اور انفرادی رائے ہے۔ فطرت کی تکمیل کا اصلی راز اس کی عریانی میں مضمر ہے۔ انسان کی کمزوری اور اس میں اس کی عقل و تمیز بھی شامل ہے، اس کی گمراہی کا اصلی سبب ہے۔ فطرت فی الحقیقت تکمیلِ کائنات کی متمنی نہیں ہے، لیکن اگر واقعی اس کا یہی منشا ہے تو میں خیال کرتا ہوں کہ جملہ موجودات عالم خواہ ذی روح ہوں یا غیر ذی روح، جان دار ہوں یا بے جان، اعلیٰ یا اسفل۔ جن حوادث کا شکار رہ چکے ہیں اُن کا تقاضا یہ ہے کہ فطرت

اب اس طریق عمل کو مسترد کردے جس پر وہ اب تک کاربند رہ چکی ہے۔ ہاں مجھے اس سے انکار نہیں ہوسکتا، فطرت بجائے خود ستم ظریف ہے یا پھر میں نے خود قبل از وقت پاگل خانہ کو خیر باد کہا۔

....

ایک خاص ضرورت سے مجھے ایک ہندستانی ریاست میں بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ انگریزی حکومت اور اس ریاست کی حدِ فاصل ایک چھوٹی سی ندی ہے جو برسات کے علاوہ ہر موسم میں عموماً خشک رہتی ہے ورنہ پایاب۔ جس وقت کا میں تذکرہ کررہا ہوں برسات کا عین شباب تھا اور ندی لبریز ہوکر دور دور تک پھیل چکی تھی۔ ایک مختصر سی بوسیدہ کشتی اور ایک دیوہیکل ملاح عبور کرنے والے اور ان کے لحد آبی کے درمیان حدّ فاصل تھے۔ یہ تمام نظارہ یونانیوں کے اُس مقبرہ کی یاد تازہ کررہا تھا جہاں رود بار اسٹکس سے عبور کر کے فضائے جحیم [1] تک پہنچنے کے لیے گزری ہوئی روحیں ''شیرن'' کی منتظر رہتی تھیں۔ ضابطہ کی رو سے تو ایک پیسہ فی کس محصول تھا، لیکن شیرن اپنی قوت بازو سے فی کس دو پیسے وصول کرتا تھا۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا، لیکن وسط دریا تک پہنچ کر اُس کے مطالبات اور بڑھ جاتے تھے۔ اُس وقت ایک طرف دریا کا تموج کشتی کا دوتہائی حصہ پانی سے بھرا ہونا، شیرن کے آہنی بازو، شعلہ بار آنکھیں اور غرانے کی آواز ہوتی تھی۔ دوسری طرف مفلوک الحال بوڑھے مرد، عورت اور بچوں کی خون منجمد کردینے والی آہ وزاری ہوتی، نتیجہ ظاہر ہے۔ دنیائے رنگ و بو اور لحد آبی میں انتخاب کرنا ہو تو غور وفکر کی خطرناک زحمت کون گوارا کرسکتا ہے اور وہ بھی ایسی حالت میں جب کہ حیات و ممات کا مدار محض تانبے کے چند منقش ٹکڑوں پر ہو۔ ایک وقت کی ضیق گرسنگی فنا کی تاریک گھاٹیوں کے مقابلہ میں کسی نہ کسی طرح گوارا کی جاسکتی ہے۔ میں نے دریافت کیا ''کیا ایسے شقی القلب سے گلوخلاصی نہیں ہوسکتی؟'' لوگوں نے کہا، ٹھیکہ دوسروں کو دیا جاتا ہے، لیکن شیرن کا رکھنا اس لیے ناگزیر تھا کہ ٹھیکہ دار خود اپنی زندگی بہت عزیز رکھتا ہے۔ ابھی آفت ختم نہیں ہوتی۔ ہر شخص جسے اپنی زندگی وبال نہ تھی اور مفلوک الحال (اجتماع ضدین ملاحظہ ہو!) نظر آتا۔ کشتی سے پانی اچھلنے پر مجبور تھا یہ تو کشتی کا نقشہ تھا۔ سڑک اور یکّوں کی حالت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مختصر سے مختصر یکّہ کیوں نہ ہو چھ چھ اور سات سات

---

1. جحیم: دوزخ

سواریوں کا لے جانا ایک عام بات تھی۔ پختہ سڑک کی حالت یہ تھی جیسے کسی نے قلبہ رانی کی ہو اور پانی تمام کنکر اور مٹی بہا لے گیا ہو! میں نے خیال کیا کہ ریاست کا انجینئر فنِ انجینئری میں کوئی انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے اور اس سال کی غیر معمولی برسات دیکھ کر اس نے سڑک کو چھوٹی چھوٹی آڑی ترچھی نالیوں میں تقسیم کر دیا ہے تا کہ مینہ کا پانی جلد سے جلد نکل جائے۔ لیکن کچھ دور چلنے کے بعد معلوم ہوا کہ جدت فکر کے اعتبار سے میونسپلٹی اس سے ایک قدم آگے بڑھ چکی ہے۔ یہاں کے محکمۂ حفظانِ صحت نے ایک کیمیا گر (کیمسٹ) کے بھی فرائض اپنے ذمہ لے لیے ہیں اور اس کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جس کا ممبر قصبہ کا ہر فرد بشر، خواہ وہ وہاں کا قدیم باشندہ ہو یا محض نو وارد ہوا ہے۔ قصبہ کی تمام سڑکیں اور گلیاں لیبورٹری (معمل) کا کام دیتی ہیں۔ ہر قسم کی غلاظت اور نجاست پھیلی ہوئی ہے، جراثیم کو دیکھنے بھالنے یا محسوس کرنے کے لیے صرف وہی آلات تفویض کیے گئے ہیں جنھیں انسان عدم سے اپنے ہمراہ لایا ہے۔ یعنی ناک، کان، آنکھ، پھیپھڑا یا جگر! میں صرف یہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں کہ یکہ بانوں کو ہدایت کی جائے کہ نصف درجن سے زیادہ سواریوں کو بٹھانے کے بعد انھیں کسی کپڑے یا رسّی کے حلقہ میں لے کر باندھ دیا کریں۔ میں جانتا ہوں یہ ترکیب محض اس خیال سے عمل میں لائی جاتی ہے کہ کوئی سواری منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پہلے غائب نہ ہو جائے اور کرایہ کا نقصان ہو۔ اس کا علاج اس قدر بھی ممکن ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ کسی کپڑے یا رسّی کے حلقہ میں رکھے جائیں سواریوں سے کہہ دیا جائے وہ ایک دوسرے کا کان پکڑے رہیں۔ یہ گرفت چوں کہ زیادہ سخت نہیں ہو سکتی، اس لیے ممکن ہے کہ کوئی بزرگ لیبورٹری کے ''مقویات'' میں گل حکمت ہو جائیں۔ ممبرانِ میونسپلٹی میں ممکن ہے کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جن کو دنیا میں محض ''حق بخشوانا'' رہ گیا ہو اور اعضائے رئیسہ میں فرق آ جانے کی وجہ سے ''جراثیم'' نظر نہ آتے ہوں۔ مجھے یقین ہے وہ جراثیم کے اس جدید قسم کا انکشاف کر کے اپنی گذشتہ خدمات بیکاری کی تلافی کر سکیں گے۔ یہ حالت تو نجاست اور غلاظت کی تھی۔ یہاں اگر روشنی تلاش کی جائے تو شاید کوئی بھٹکتا ہوا جگنو بھی میسر نہ آئے۔ ''خودکشی'' والے مضمون کو دیکھ کر جناب ''رپورٹر'' نے میرے لیے جو سزائیں تجویز کی تھیں ان میں ''ظلمات میں عمر جاوداں'' بھی تھی۔ کاش جناب ممدوح کا ادھر کبھی گزر ہوتا جہاں لوگ اس مضمون کی بنا پر بے دینی اور کفر کا فتویٰ

لگانے پر تیار ہیں لیکن ارباب قضاوقدر (بمعنی میونسپلٹی) کے ہاتھوں "ظلمات میں عمر جاوداں" کی سختیاں جھیل رہے ہیں اور خودکشی کا مضحکہ بھی اُڑاتے ہیں!

چند پولیس والے بھی نظر آئے، جن کی حالتِ زار کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ دن میں اُن کی صورت اور ہیئت دیکھ کر اگر کسی کو ارتکاب جرم کا حوصلہ نہ پیدا ہو تو اُسے خودکشی کر لینی چاہیے۔ ہاں رات میں البتہ اگر کسی توہّم پرست چور یا نقب زن کو یہ نظر آ جائیں تو وہ فرطِ خوف سے یقینی بے ہوش ہو جائے گا۔

راستہ میں مجھے ایک پل نظر آیا جس میں انجینئر نے ایک عجیب وغریب صنعت رکھی تھی، یعنی نیچے نالا تھا اوپر حوض! بالفاظ دیگر پل کی چھت بجائے کونکس (محدب) ہونے کے کنکیو (مقعر) تھی۔ لوگوں کو چوں کہ پل کے اوپر پانی میں سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا اس لیے سنا ہے، تجویز ہے کہ اس پر ایک پل اور بنا دیا جائے۔ میری رائے میں تو پل سے زیادہ یہاں پاگل خانہ کی ضرورت ہے!

....

تعطیلیں ختم ہو چکی ہیں۔ اب ہم ہیں اور گیسٹ ہاؤس اور وہی لیل ونہار جن کی آغوش میں قدرت کی نیرنگیاں، عالم حیات کے رنج ومسرت پر مسکرایا کرتی ہیں۔ زائرین علی گڑھ جوق جوق آ رہے ہیں۔ خدا جانے کن کن تمناؤں کے ساتھ وہ اپنے اپنے وطن سے چلے ہوں گے اور کیا کیا اثرات یہاں سے لے جائیں گے۔ یہاں کی روایات سے وہ واقف ہوں گے اور یہاں کے سچے فرزندوں کے کارنامے بھی اُن کے دلوں پر نقش ہو چکے ہوں گے۔ کون نہیں جانتا کالج اپنی عمارات، پروفیسروں یا لڑکوں کی وجہ سے مشہور نہیں ہے بلکہ یہ خود کالج کی وجہ سے مشہور ہیں۔

عزیزانِ محترم! یہاں تم بہت سے سبق سیکھو گے، ایک سبق پاگل خانہ کا بھی یاد رہے۔

منکرِ مے بودن وہم رنگِ مستاں زیستن!

(مطبوعہ: علی گڑھ میگزین۔ جولائی/ اکتوبر 1922)

●●●

دنیا

کسی گاؤں میں ایک اُونٹ آیا لوگوں نے کہا، "بھگوان آئے!"

ندرتِ خیال کے اعتبار سے یہ انکشاف ہر طرح سے قابلِ ستائش ہے، صرف یہ سوال البتہ رہ جاتا ہے کہ اس کا دریافت کرنے والا الٰہیات کا عالم تھا یا علم الحیوانات کا ماہر، یا پھر ان دونوں کا مجموعہ فلسفی!

بھگوان اور اونٹ کو ہم سطح کر دینا کوئی معمولی کام نہیں ہے اور ایک ایسے بیان کا ذمہ دار ہونا جو دنیا کے تمام مفروضات کو باطل کر دیتا ہو، آسان نہیں ہے۔ لیکن بایں ہمہ اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ شانِ نزول کے اعتبار سے دنیا کا یہ واقعہ اتنا اہم اور وقیع ہے جتنا سیب کا گرنا اور نیوٹن کا ایک عالم کو کشاکشِ ثقل میں مبتلا کر دینا۔

دنیا کی جامع اور مانع تعریف یا تو وہ شخص کر سکتا ہے جو اپنی پیدائش کے لیے خدا سے زیادہ اپنے اور اپنے والدین کا رہینِ منت ہو یا یہ مسئلہ اُس ہستی سے حل ہو سکتا ہے جو اپنا اور اپنے خدا دونوں کا باوا آدم خود ہی ہو۔ ایسے لوگوں کی دنیا میں کمی نہیں ہے ورنہ اس مسئلہ کو بے نقاب کرتا کنشتِ مشرق میں نمودار ہونے کے لیے آمادہ ہی ہو رہی تھیں کہ پنبہ زارِ سحر، زراندوز ہونے لگی اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ فطرت کی بے دریغ بخشی پر سربہ سجود ہو گیا۔

عروسِ بہار بند نقاب کھولتی ہے، فطرت رونمائی میں دنیائے رنگ و بو نثار کرتی ہے۔ لوحِ وجود پر خطِ گلزار نمایاں ہوتا ہے، چپہ چپہ "دامانِ باغبان و کفِ گل فروش" بن جاتا ہے۔

رندانِ خودفراموش ساغر کی گردش اور ساقی مہوش کی ہر جنبش ابرو اور خرامِ ناز پر پا کوبی و دست افشانی کرتے جاتے ہیں اور ہیجانِ کیف وکم سے مغلوب ہوکر پکار اُٹھتے ہیں۔ ع

فردوس ایک پھول ہے دست بہار میں!

نگارستانِ وجود کا نقشہ بدلتا ہے، عالمِ حیات پر تابستان کا تسلط ہوتا ہے، مشاطۂ فطرت۔ ع

اک نگار آتشیں رُخ، سر کھلا

کا جلوہ پیش کرتی ہے۔ دنیائے آب و گل شعلہ زار بن جاتی ہے اور قدرت کا سارا سرمایۂ برگ و بار نذرِ التہاب!

فطرت کی یہ دعوت تلون ظاہر بیں نظروں کے نزدیک محض اک دفتر بے معنی ہے، لیکن ایک شاعر کے نزدیک یہی نیرنگیاں سرمایۂ صد حیات ہیں۔ وہ اپنی زندگی کو عین مظہر فطرت تصور کرتا ہے۔ وہ اس کا معتقد نہیں ہے کہ عالمِ حوادث کے مختلف فطری اور تمدنی تغیرات خود حیاتِ انسانی سے مختلف نہیں۔ ذاتِ انسانی خود جزوِ کائنات ہے اور چوں کہ کائنات خود ایک مسلسل اور ابدی بیداری ہے، اس لیے اس کا ہر جز بھی بیدار ہے۔ مجھے اس کلیہ سے اختلاف ہے کہ دنیا میں کوئی وجود ایسا بھی ہے جس پر بیداری کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ ہر ذی حیات ایک غیر ذی حیات وجود کا محتاج ہے جس کے بغیر اس کی تکمیل اور سالمیت ناقص ہے۔ مٹی یا پتھر کا ایک تودہ جسے ہم ساکت و جامد محض سمجھتے ہیں، فی الحقیقت ثقل و جاذبیت کا ہی نہیں بلکہ ایک مخصوص اہلیت تامّہ کا حامل ہے۔ وسیع معنوں میں حیات صرف حرکت و شعور ہی کا نام نہیں ہے۔ حیات نام ہے صرف تغیرات کا اور تغیر صرف ایک مسلسل حرکت ہے جو میرے نزدیک بیداری کا مرادف ہے نہایت آسان ہو جاتا۔ بہر حال اس وقت کو مدّ نظر رکھتے ہوئے میں اس نتیجہ پر پہنچ سکا ہوں کہ دنیا کی حقیقت اور اس کے اسباب و علل پر دیدہ و دانستہ غور کرنا کچھ زیادہ ثمر آفریں ثابت نہ ہوگا۔ یہ ممکن ہے کہ اس ہنگامۂ ہزیان میں کوئی بات ایسی نکل آئے جو خوش اعتقادی سے ''معقولیت'' پر محمول کی جائے یا دوسرے اسے فلسفۂ طرازی تصور کریں تو میرے ایک ''موپلا'' دوست اسے ''مہمل'' ثابت کرنے کے لیے حقہ کی کشیں جلد جلد لینے لگیں۔

اونٹ بھگوان کے فلسفہ میں فطرت انسانی کا ایک زبردست لیکن عریاں راز مضمر ہے۔
اس ''حلیم وخوش خصال'' ہستی کا بھگوان سے جیسا کچھ رشتہ ہے وہ اپنی مختلف نوعیتوں کے اعتبار سے اتنا ہی معنی خیز ہے جتنا حضرت موسیٰؑ اور اُس گلّہ بان کا واقعہ جو انتہائے محبت اور گرویدگی سے مغلوب ہوکر خدا کو اپنے سے زیادہ قابلِ ہمدردی خیال کرتا تھا۔ دنیا کی ہر ہستی جسے فطرت نے پیراہنِ حیات سے گراں بار کیا ہے ایک مخصوص دنیا کی حامل ہے۔ اس لیے دنیا کو صرف ایک ہی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا ایک ایسی غلطی ہے جس کا تصور کر کے مصنف لغات الجاہلین نے ''شخصیت'' کے معنی ''کسی شخص کی بیوی'' لکھے ہیں۔

....

اُفقِ مشرق کے ایک گوشہ اور درختوں کے زمرّدیں حجابات میں برشگال کا وہ مظہر برنائی جسے دیکھ کر قاآنی بے اختیار پکار اُٹھا تھا۔ ع

جواہر خیز و گوہر بیز و گوہر ریز و گوہر زا

بے نقاب ہو رہا ہے۔ آفتاب نے بساطِ آتشیں تہ کی۔ پہنائے کبود ابر پیراہن ہونے لگا جس کی متاعِ آب دار کو ہوا تاراج کر کے دامنِ ارض کو الماس گوں بنا رہی تھی اور دیکھتے دیکھتے ساری کائنات نکھر کر اُس پیکرِ حیا وحسن کا منظر پیش کرنے لگی جو عین عالمِ اشک ریزی میں دفعتاً متبسم نظر آنے لگے۔

زمستاں کی وہ فضائے زمہریر جس کے سکون وسکوت میں صرف ستاروں کی تنک تابی، اور قمر کی سبک سیری مخل ہوسکتی ہے! ہنگامِ صبح دوشیزہ کرنیں اپنی سبک ثبات ارغوانی نذریں لے کر لیکن یہ نظریہ اُن حضرات کا ہوسکتا ہے جو ع

شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

کے قائل ہیں۔ وہ زندگی کو مجبوری تصور کرتے ہیں، لیکن ایک شاعر کے نزدیک مجبوری بھی دلکشی اور دل آویزی کی محض ایک شانِ بے اختیاری ہے۔ شاعر بیداری کائنات کے ہر پہلو کو پیامِ سرور روحانیت تصور کرتا ہے۔ موسموں کا وہ انقلاب جس کا نقشہ اوپر کھینچا گیا ہے، تنوعاتِ شعری کا ایک مرقع ہے۔ شاعر کی دنیا خیالات کی دنیا ہے، وہ اسے مادیات کا عارضی اور کثیف جامہ نہیں پہناتا۔

وہ محض تصوّرات کو ابدی و غیر فانی قرار دیتا ہے۔ اُن کی کثیف اثر اندازیوں کو ہیچ قرار دیتا ہے اور جس وقت وہ کہتا ہے۔

شب اُمید بہتر از روز عیدی گزرد
کہ آشنا بہ تمنائے آشنا خفتست [1]

وہ اسی کلیہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ وہ تمنائیں جو صرف ناز پروردۂ تصوّرات ہیں۔ اُن کامرانیوں سے زیادہ بیش بہا ہیں جو وقوع پذیر ہو چکی ہیں۔ مسرّت اور عافیت نام ہے اُس تناسب تامّہ کا جو انسان کے داخلی اور خارجی ماحول میں پایا جائے۔ جس شے کا نام حقیقی عافیت رکھا گیا ہے اُس وقت تک صحیح اور مکمل نہیں ہو سکتی جب تک انسان یہ نہ محسوس کرے کہ اُس کی جسمانیت اور جذبات صرف ایک حسِ واحد میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ فطرت کی نیرنگی شاعر کے نزدیک ایک دعوت وصال و اتصال ہے۔ لیل و نہار کی کروٹیں، موسموں کا تغیر و تبدّل، مناظر کی بوقلمونی، حتیٰ کہ ہر جزو واقعہ اُس کے نزدیک سازِ حیات کی ہم آہنگی کے لیے بنایا گیا ہے۔ فطرت کی پرستاری اُس کی زندگی کا اصلی راز ہے۔ وہ محض اس لیے زندہ ہے کہ وہ مسرور رہ سکتا ہے اور وہ مسرور رہتا ہے اس لیے کہ فطرت اُسے اپنا معتمد علیہ سمجھتی ہے۔

یہ تھا نقشہ شاعر کی دنیا کا!

عالمِ فانی، اس کے نقوش باطل، حیاتِ انسانی ایک درسِ بصیرت اور عالمِ حیات ایک آزمائش سخت اور صبر آزما!

....

انسان کی محرومی و کامرانی خود اس کی ذات میں مضمر ہے اور اس کی ذات ایک ایسی ہستی کے تصرف میں ہے جس کے وجود کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ دنیا جب دنیا نہیں کہی جاتی تھی یا جب سب کچھ کہی جانے لگی، اُس وقت بھی لوگوں کا قلب و دماغ، باوجود انتہائی کوششوں کے اسے فراموش نہ کر سکا۔ تکمیل حیات نام ہے اس حقیقت کا جہاں پہنچ کر انسان عبد و معبود کی تفریق فنا

1۔ اُمید کی رات بہرحال عید کے دن سے بھی بہتر گزرتی ہے۔ اس لیے کہ ایک چاہنے والا دوسرے چاہنے والے کی آرزو میں سویا ہوا تو ہے۔

کر دیتا ہے اور حقائق اور معرفت کے رموز اُس پر منکشف ہو جاتے ہیں۔ زندگی ابدی اور اس کے مظاہر فانی ہر ذی حیات یا غیر ذی حیات وجود جس کا ہمیں علم ہے اپنی فطرت اور نوعیت کے اعتبار سے اُس ہستی کا ثبوت دیتے ہیں جو بظاہر ہر مستور اور مخفی ہے۔ لیکن عالم کی تمام کرشمہ کاریوں کی ذمہ دار بھی ہے۔ ہم جب اُن موجودات ارضی اور سماوی پر، جن کی ہم کو خبر ہے، ایک مغائر نظر ڈالتے ہیں اور ان کی اہلیت اور جبلت کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی تکمیل کسی نہ کسی اعتبار سے ناقص ہے۔ معاً ہمارا ذہن ایک ایسے واقعہ یا حقیقت کی طرف منتقل ہوتا ہے جو بظاہر موجود نہیں ہوتا، لیکن ہم اس کے وجود کے متلاشی اور متمنی ہوتے ہیں۔ فطرتِ انسان کی یہی خلش وجود باری کا ثبوت ہے۔

دنیا چندروزہ اور اس کے علائق نقش برآب! اس حقیقت کی بنیاد علاوہ اس قدیم اور وسیع تجربۂ نوعی کے جو انسان کو حاصل ہو چکا ہے، خود ذات باری کے تخیل پر ہے۔ اس امر کو تسلیم کرنے کے بعد انسان کے سامنے افکار اور کردار کی شاہراہیں کھل جاتی ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ یا تو ہر انسان فطرت کے انتقام یا معدلت کے سامنے محض ایک مورِ بے مایہ ہے یا اس کی فیاضیوں اور جزادائیوں میں برابر کا شریک ہے۔ اس لیے زندگی کو کسی ایسی نہج پر ڈالنا جس میں صرف ذاتی منفعت یا آسودگی ہو یا دوسروں کی پامالی ہوتی ہو، عصیان محض ہے۔ وہ عبودیت کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت اس بنا پر سمجھتا ہے کہ یہ انسان کی صفت خصوصی ہے۔ کبر و تمرّد اُس کے نزدیک ایک بیکار شے ہے، اس لیے کہ اساس انسانیت جس پر اُس کے ہر جارحانہ یا مدافعانہ اقدام کا مدار ہے، عجز و نیاز ہے اور انھیں خصوصیت انسانی کو وہ ہر ظلم و ناحق کوشی کے خلاف صف آرا کرتا ہے۔ وہ ہر انسان کو عافیت و راحت سے بسر کرنے کا حق دار سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر وہ استعداد یا قوت جو کسی فرد یا جماعت میں پائی جاتی ہو، محض اس لیے ودیعت کی گئی ہے کہ معاشرت کے ہر طغیان و عصیان کا ازالہ ہو سکے۔ اس کی تمام تر مساعی اس کلیہ کے نشر و تبلیغ پر صرف ہوتی ہے کہ حقیقی ترقی نام ہے اس ملکۂ ذہنی کا جس کے تصرف سے انسان دوسروں پر غلبہ پانے سے قبل اپنی بہیمیت یا جہالت پر غلبہ پاتا ہے۔ وہ اس غلطی کا بھی مرتکب نہیں ہوتا کہ روحانیت کے خلاف مادّی ذرائع اور وسائل کامیابی کے ساتھ برسرِ کار لائے جا سکتے ہیں۔ وہ صرف ظاہری اسباب و علل کو

کامیابی کا ذریعہ نہیں تصور کرتا۔ اس کا عقیدہ ہے کہ ہر انسانی کوشش کے ساتھ ایک پوشیدہ قوت بھی
جس پر اسے بالکل قدرت نہیں حاصل ہوتی۔ اس کی کامیابی نا کامیابی کے لیے برسر عمل رہتی
ہے۔ اس حقیقت کا احساس اس کی کمزوری کا نہیں بلکہ اس کی قوت کا ثبوت ہے۔ انسان کی انتہائی
طاقت یہ ہے کہ وہ اپنی خفیف ترین کمزوریوں پر بھی وقوف رکھتا ہو۔ زندگی ایک بیش بہا ودیعت
ہے اس لیے اس کا مصرف بھی اتنا ہی گراں قدر ہونا چاہیے۔ دولت محض ایک اضافی اور اکتسابی
شے ہے اور انتہائی ذلت اور شقاوت کے ساتھ بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس لیے ایسی چیز کے
لیے ان نعمتوں کو قربان کر دینا جو مروجہ اور مسلمہ قوانین انسانیت کی رو سے احسن و اشرف تسلیم کر لی
گئی ہیں، ایک خسران مبین ہے خدا ترسی اور خدا پرستی صرف اپنی بے بسی اور کمزوری (جس سے
چارہ نہیں) کا اعتراف ہے۔ ہر انفرادی یا اجتماعی زندگی ہر دوسری انفرادی یا اجتماعی زندگی کا سرمایۂ
زمانت ہے جس کا کسی وقت مبادلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کلیہ کے ماتحت بعض نفوس قدسی اپنا پورا
سرمایۂ حیات پہاڑوں کی برف زار فضاؤں میں، جنگلوں کے سنسان حصوں میں، ریگستان کے
آتش زاروں میں، معابد یا مقابر کے خلوت کدوں میں، متکبرین کے درباروں میں، زندان کے
تاریک اور نمناک آشوب کدوں میں، دار و رسن کی گلوگیریوں میں، تلواروں کی چھاؤں اور گولیوں
کی بوچھاڑوں میں، ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں اور زندہ جاوید کہلاتے ہیں۔

یہ تھی مشرق کی دنیا

....

دنیا کیا ہے؟ مادّہ نشین اور محنت کی وہ آشوب گاہ جہاں جسم اور روح کو یک جا رکھنے کے لیے
جسم اور روح کو ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، جہاں کا پورا
مجموعۂ اخلاق حکمرانوں اور سرمایہ داروں کا وہ ضابطۂ قانون ہے جس کی رو سے دنیا کی تمام فراوانیاں
ان کی طمع و آز کے لیے سند جواز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ صلح و عافیت کے وہ نظریات جن کو معلوم کر کے
خود صلح و عافیت کے دیوتاؤں کو اپنے اوپر رشک آنے لگے۔ فی الحقیقت وہ محرومیاں ہیں جن کو ایک
آسودۂ قلب و دماغ اُن بدبختوں کے لیے وضع کرتا ہے جو آسودگی کے مفہوم سے اتنے ہی نا آشنا ہیں
جتنے اس کی لذت سے بے خبر۔ کارگاہوں اور کارخانوں کے وہ خورد سال بچے جن کی معصوم اور

طفلانہ جست و خیز دوالیب دیو پیکر کی گردش پیہم اور ان کے دُود و غبار میں ضم ہو جاتی ہے، نو خیز نوجوانوں کی وہ جواں مرگ تمنائیں جن پر اس محشر تیرگی میں نجات کے تمام دروازے بند ہوتے ہیں۔ نامراد لڑکیاں جن کی نسوانی کیف و مسرت کا پورا فانوس کدہ اس حیا سوز اور عافیت کش فضا میں فنا ہو جاتا ہے۔ مظلوم اور بقیہ واماندگانِ حیات جن کی تنہا اُمید صرف موت کی انتظار کشی ہے، زندگی کے اس بار سے تحلیل ہو رہے ہیں جس کے صرف تخیل سے قلب و جگر کے پرزے اُڑنے لگتے ہیں۔

سرمایہ داروں کا ساز و ثروت اور ان کے وہ بیش بہا ملبوسات جن کی تکمیل اور تزئین پر ہزاروں بے کس بے نواؤں کا خونِ جگر صَرف ہو چکا ہے جن کے ہر تار سے فاقہ کش ہستیوں کی وہ اُمیدیں وابستہ رہی ہوں گی جن کو ملتے دیکھ کر انھوں نے اپنے مجروح قلب کی انتہائی خون آلود گہرائیوں سے ایک ایسی آہ کھینچی ہوگی جس کی تاب شاید صرف خدا کی بے نیازی لا سکی ہو۔ اہل جاہ کی وہ نخوت جو کسی زمانہ میں رود نیل کی لجۂ آب میں دفن کر دی گئی تھی، ان کے شبستانِ عشرت کے وہ حیا سوز مناظر جہاں کونینِ عصمت کی پوری قیمت صرف وہ لغزش تھی جب ایک لقمۂ طعام کے مقابلہ میں موت زیادہ روح فرسا نظر آنے لگی۔ ایسے سنگین حادثات ہیں جو خون کو منجمد کر سکتے ہیں۔

یہاں حرب و ضرب کے وہ جہنم کدے ہیں جہاں ذہن و فکر کا پورا سرمایہ صرف اس تحقیق پر صَرف ہوتا ہے کہ انسان کے عضلات اور استخواں کس طور پر جلد سے جلد دود و غبار میں تبدیل کیے جا سکتے ہیں۔ ایک انسان دوسرے انسان کو کتنی دور سے موت کا پیغام سنا سکتا ہے اور چند ہی دقیقوں میں زیادہ سے زیادہ کتنے یتیم اور بیواؤں کے شمار میں اضافہ کیا جا سکتا ہے اور سکرات کی گھڑیاں کس طور پر طویل بنائی جا سکتی ہیں۔ قصر حکومت کے سب سے بڑے وظیفہ خوار کا آذوقۂ حیات صرف اس پر ہے کہ وہ کس طرح کس عافیت زار کو محشر جدال و قتال بنا سکتا ہے۔ امیر الحرب کی پوری زندگی اس انکشاف کی نذر ہو جاتی ہے کہ کس مقام پر انسانی گوشت و پوست کا کتنا بڑا انبار لگایا جا سکتا ہے اور اس اسکیم کو عمل پذیر بنانے کے لیے کیسے حیلے تراشے جائیں اور کتنے خون آشاموں کو مستعد بیعت کرنا چاہیے۔

یہاں کا فلسفۂ اخلاق صرف ایک مظاہرۂ اشتداد و قوت ہے۔ ضیق جوع الارض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ان کی گرسنہ نگاہیں دنیا کے چپہ چپہ پر پڑتی ہیں اور ذرہ ذرہ کانپ

اُٹھتا ہے، لیکن لوگ اُنھیں اصحاب جرأت وعمل کہتے ہیں! ان کا تمدن اُن کا مذہب ہے اور اُن کا مذہب طمانچہ زنی کا عذر لنگ۔ کمزور کو کبھی نہ بخشنے والے اور مضبوط کے سامنے سرنگونی کو عافیت جوئی اور صلح پسندی کی ایک شانِ ایثار تصور کرنے والے۔ ان کی تیغ محض اُن لوگوں کے لیے بے نیام ہوتی ہے جو عالم بے کسی میں صرف اپنے سر وسینہ کو سپر بنا سکتے ہیں۔ ان کے افکار و کردار کا منکر، وحشی اور اُن کی دراز دستیوں پر لعنت بھیجنے والا ایک بزدل باغی، ان کا خدا صرف ستار العیوب اور قاضی الحاجات اور دوسروں کا خدا اُن کے نزدیک پست خیالیوں اور توہمات کا ایک عذر نامقبول!

مغرب کو اس دنیا پر فخر ہے!

....

حسینوں کی تین اقسام ہیں۔ ایک وہ جو مسلمہ طور پر حسین ہیں، دوسرے وہ جو لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید کے زمرہ میں آتے ہیں۔ تیسرے وہ جو ان دونوں حیثیتوں سے بے نیاز۔ ع

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ

کے مصداق یا بالفاظ دیگر سلف سپورٹنگ (Self supporting) ہیں یعنی اُن کے حسن و رعنائی کو کوئی نہ بھی تسلیم کرے تو وہ فی سبیل اللہ دنیا کو اس کی غلطی منوانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں گے۔ یہ فرقہ شاید اس امر کا معتقد ہے کہ ناقدر شناسی کا وہ رویہ جو موجودہ دنیا ان کی طرف سے اختیار کیے ہوئے ہے کہیں کرۂ مریخ والوں کو ناگوار نہ گزرے اور وہ دنیا والوں کو بدمذاقی کا مجرم نہ ٹھہرائیں۔ اس لیے ہر ممکن طور پر بھگوان کا نام لے کر شتر غمزہ پر تیار ہو جانا چاہیے۔

یہ تقسیم باعتبار ذات تھی۔ اگر صفات کا اندازہ لگایا جائے تو یہ تقسیم بغایت طویل ہوگی۔ پہلی اور دوسری قسم کے متعلق تو بے اختیار لیکن صدق دل سے اُن واعظوں اور مولویوں کی تقلید کرنے کو دل چاہتا ہے جو وعظ و پند شروع کرنے سے پہلے اعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا کا ورد کر لیتے ہیں۔ قسم اوّل کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ جماعت فطرتاً معذور بنائی گئی ہے۔ لولے لنگڑے، اندھے، کوزہ پشت، فلسفی وغیرہ وغیرہ کے خلاف ''نوٹس بنا بر دکھانے وجہ کہ......'' شائع کرنا ایک فعل عبث ہے۔ ایک حسین کے لیے یہ کیا کم آفت ہے کہ ایک دنیا اسے ایسے جرائم کا مرتکب گردانتی ہے جو قابلِ دست اندازی پولیس ہیں اور جہاں سائل یا

مدعی دستیاب نہ ہوتو ''قیصر ہند بنام فلاں ابن فلاں'' خانہ پُری کے لیے موجود ہوا ور کاغذی ثبوت
کے لیے شعرا کا دیوان پیش کیا جا سکے۔ لیکن خوش قسمتی سے بہت سے واقعات اور حادثات ایسے
پیش آئے ہیں جن میں گورنمنٹ فریق مقدمہ نہ تھی۔ اس لیے اس نے تفتیش اور تحقیق کے لیے ایک
کمیشن مقرر کیا جس کے جملہ اراکین چالیس سال سے زیادہ عمر کے تھے یا ''ڈائننگ ہال'' کے
کھانوں پر بسر اوقات کرتے تھے۔ ایک مدت کی کاوش اور جستجو کے بعد جس میں حسینوں نے
انتہائی بے ساختگی اور خندہ روئی کے ساتھ اراکین کمیشن کو ہر ممکن طریقہ سے جو فریقین کے نازک
تعلقات کو نازک تر نہ بنا سکتا تھا، مدد دی یہ طے پایا کہ بع

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا[1]

بعض اراکین کا خیال تھا کہ نتیجہ ہے (Bad Livelihood) بدمظنگیت سوہضمی کا عشاق بالعموم
مفلس ہوتے ہیں۔ بعض کو تو یہ سعادت وصیت نامہ کے ساتھ ہی مل جاتی ہے، دوسرے اسے بہ
زور بازو حاصل کرتے ہیں۔ مفلسی اور شدت اشتہا اسی طور پر لازم ملزوم ہیں جس طور پر کہ نا اہلی اور
خوش نصیبی اور چوں کہ شدت اشتہا کا رجع عمل گرانی معدہ ہوتا ہے، اس لیے ہر مفلس عاشق کا
سوہضمی میں مبتلا ہونا لازمی ہے۔ غذا پر ہضم سوم کا عمل ہونے کے قبل ہی ابخرات دماغ کی طرف
سعود کرنے لگتے ہیں۔ نتائج ظاہر ہیں نزلہ، جنون، مراق، صرع، مالی خولیا، غرض کہ باستثنا فلسفیت
ہر وہ مرض جس میں امرت دھارا مفید بتایا گیا ہے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ عشاق کی بدمظنگی دفعہ 55
تعزیرات ہند کی زد میں آسکتی تھی لیکن از راہ ''زخم شاہی'' یہ طے پایا کہ اس قسم کے لوگوں کا چالان
دفعہ 34 میں کیا جائے اور مقدمہ کسی ایسے آنریری مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائے جو تعدد ازدواج
کا قائل فلسفۂ ازدواج کا منکر اور قوی الجثہ بیوی کی دراز دستیوں کا خوگر ہو۔ دوران بحث میں ایک
جگہ ممبران کمیشن اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''بسلسلۂ تحقیقات ہم کو بعض ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو فی الواقع
حسین تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جس طور پر گداگری کا انسداد کیا گیا ہے
اسی طور پر اگر اُن بے تکے عشاق کا تدارک نہ کیا گیا تو ملک میں ان کی

---

1 بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل + کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا غالب

تعداد گریجویٹوں سے زیادہ ہو جائے گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر وہ شخص جس کی عمر پچیس سال سے زیادہ ہوگئی ہو اور گورنمنٹ کی ملازمت نہ ہونے کی وجہ سے وکالت پر آتر آیا ہو اور عاشق بننے کی تمنا رکھتا ہو ایک لائسنس حاصل کرے، لیکن یہ لائسنس ایامِ تعطیل میں کالعدم تصور کیا جائے گا۔ عشق و عاشقی کی پوری کارروائی آئینی طور پر ہوگی یعنی خضاب ممنوع قرار دیا جائے، داڑھیوں کی صفائی محض اس لیے نہ کی جائے کہ داغِ جوانی پر کہولت کی نمک پاشی ناقابلِ برداشت ہونے لگی تھی۔ لیکن اگر اس کا رکھ رکھاؤ مدِ نظر ہو تو اعتدال کا سررشتہ ہاتھ سے نہ دیا جائے۔ دورانِ عاشقی میں معشوق بننے سے قطعاً اجتناب کرنا پڑے گا اور چوں کہ عشاق کا مرض بالعموم دوری سے ہوتا ہے، اس لیے انھیں ''سفر حضر میں'' ہمیشہ امرت دھارا کی ایک شیشی ساتھ رکھنی پڑے گی اور اُن کے پاس بطور لٹریچر صرف اس دوا کا پرچہ ترکیب استعمال ہوگا۔ صحراؤں میں زقند بھرنا، گلیوں کی خاک روبی کرنا، پہاڑ کاٹنا، ٹھنڈی ہوا میں رقص کرنا، راتوں کو خوف ناک آوازیں لگانا، جنازہ بننا یا بنانا، قبروں میں اُترنا، قیامت مچانا، ملک الموت کو دعوت یا مہلت دینا اور ساتھ ہی ساتھ محبوب کو عیادت میں طلب کرنا، فلسفیت کا دم بھرنا اور خودکشی سے اغماض کرنا، ان تمام مزخرفات سے اجتناب کرنا لازمی ہوگا۔ پوشاک میں صرف ایک شلوار کی اجازت ہوگی۔ سر پر پٹہ ایک ہاتھ میں ریل بیگ اور حقہ کی نگالی دوسرے میں ٹن کا لوٹا اور حقہ کا بقیہ حصہ، بغل میں لپٹی ہوئی دری اور زبان پر.....''

صدقے اپنی درازیِ قد کے
سب ہمیں بے وقوف کہتے ہیں
یہ دنیا حسینوں اور ان کی ننھی الف، عشاق کی تھی!

....

دوسری قسم کے عشاق اس لیے قابلِ معافی ہیں کہ ان کی حماقتیں عامتہ الناس کی عافیت میں مخل نہیں ہوتیں اور وہ مجھ سے جائز طور پر مواخذہ کر سکتے ہیں۔ ع

محتسب را درونِ خانہ چہ کار

تیسری قسم البتہ قابلِ توجہ ہے۔ ان کے کریکٹر کا جائزہ لینے سے پہلے یہ حقیقت ذہن نشیں کر لینی چاہیے۔ ان کی جماعت کافی بڑی ہے اس لیے کہ کم و بیش ہر شخص اس مغالطہ کو اپنا عزیز ترین سرمایہ سمجھتا ہے کہ وہ اگر حسین نہیں بھی ہے تو دنیا میں ایسے حمقاء کی کمی نہیں ہے جو اُن پر عمداً یا سہواً ملتجی نگاہیں ڈالنے سے باز رہیں گے۔

ماشاء اللہ صورت ایسی کہ انسان چالیس روز دیکھے تو خوش مذاقی سے ہمیشہ کے لیے سبک دوش ہو جائے، اور بدقسمتی سے ہم نشینی پر مجبور ہو تو بھلے مانسوں کو دیکھ کر گریبان پھاڑنے لگے۔ یہ لوگ ہمیشہ اس جستجو میں رہتے ہیں کہ اگر کوئی ایسا موقع آئے جس میں بڑے بڑے لوگ موجود ہوں تو یہ اس طور پر وہاں داخل ہوں، گویا سارا ساز و سامان محض انھیں کے لیے ہوا ہے اور اُن کے وجود سے وہ مخصوص طبقۂ ارض آسمان بن جائے گا اور یہ کوئی دم دار ستارہ! ہنسنے یا اعضا کو حرکت دینے میں اس طفلانہ بے اختیاری سے کام لیں گے جو اُن سے کم سے کم چوتھائی صدی پیچھے جا چکی ہے۔ بات چیت کرنے میں بھی ان کا احساسِ تناسب قابلِ غور ہے۔ علم و حکمت کا مسئلہ چھیڑا جائے تو معلوم ہوگا کہ سقراط اور افلاطون کی روحیں ان کا اور اپنا دونوں کا سر دُھن رہی ہیں۔ انتظام و حکومت پر بحث ہو تو معلوم ہو کہ نپولین اور شارلیمن دونوں کافی وقت تک ان کا گلا گھونٹ چکے ہیں۔ شعر و شاعری یا ادبیات اور فنونِ لطیفہ کا تذکرہ ہو تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے تمام شاعر، ادیب، مصوّر اور نقاش ہی نہیں بلکہ زہرہ اور مشتری بھی ان کا اور اپنا دونوں کا کان پکڑنے کے لیے تیار ہیں۔ آواز میں لوچ پیدا کرنے کے لیے کسی قدر جھینپ کر خندہ فرمانا اور اس کے بعد ہی ہاتھ پاؤں کو اس طور پر بھینچنا کہ فرطِ بے اختیاری میں ممکن ہے کسی کے قلب کی حرکت رُک جائے، ان کا وہ شیوہ ہے جس پر وہ بجا طور پر اپنے بساطِ عقل و تمیز سے زیادہ ناز کرتے ہیں۔ مشاہیر و اکابر کی مشایعت حاصل ہو تو ان کی جملہ حرکات و سکنات کے انڈکس بن جائیں گے۔ اگر وہ تیز قدم ہوں تو یہ دلکی جائیں۔ وہ مسکرانے پر آمادہ ہوں تو ان کے پورے دندانِ مبارک کی زبردستی زیارت ہو جائے۔

وہ آمادۂ عتاب ہوں تو یہ غصہ میں غلط انگریزی بولنے لگیں۔

....

مضمون ختم کر دینے کی آخری مہلت بھی تمام ہو چکی اور منظور صاحب کا ملازم تھوڑی ہی دیر میں نازل ہونے والا ہے۔اس لیے یک بہ یک سلسلہ ٹوٹتا ہے اور مضمون بے ربط رہ جاتا ہے۔ ناظرین معاف فرمائیں،ابھی بہت دنیا دیکھنی ہے یار زندہ صحبت باقی۔

(علی گڑھ میگزین،علی گڑھ۔مئی تا جولائی 1923)

●●●

افیونی

اک چلتی پھرتی چھاؤں ہے ساری یہ کائنات
دیکھا تو ہم نے خوب جہاں تک نظر گئی

دنیا کے بہترین دل و دماغ اب تک اُس فوق البستی کا پتہ نہیں لگا سکے ہیں جس نے سب سے پہلے سونے کا فن ایجاد کیا اور اڈیسن سے لے کر کسی ہندستانی شاعر یا عاشق (دونوں تقریباً مرادف الفاظ ہیں) کی زندگی پر نظر ڈالیے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس حیرت انگیز انکشاف کی طرف سے جو غفلت برتی جا رہی ہے اس کا یہ انجام ہونے والا ہے کہ لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں گے اور نیند کا پتہ نہ پائیں گے۔ ستم ظریفی تو دیکھئے ابھی اس فن کا موجد نظروں سے پنہاں ہی تھا کہ کچھ لوگوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت، اس وجود کا پتہ لگانا شروع کر دیا جس نے جاگنے کا فن دریافت کیا تھا، انتہائی جستجو اور کاوش کے بعد صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ ان دونوں کا موجد ایک ہی شخص ہے۔ رہا یہ سوال کہ وہ شخص کون تھا، کس صنف سے تعلق رکھتا تھا، سلسلۂ ارتقاء کی کس کڑی سے وابستہ تھا، آج تک نہ معلوم ہو سکا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سعادت صرف افیونیوں کو نصیب ہوئی۔ ہندوستان کے مسلمان اسے اپنی قسمت کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں، بہتر یہ ہے کہ اس مسئلہ کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ بہر حال کچھ عرصہ کے بعد خدا خدا کر کے، زمانہ نے کروٹ بدلی اور ملک میں بیداری کے آثار نمودار ہوئے۔ ہر طرف تحریک و حرکت کی کش مکش شروع ہوئی،

نوبت بایں جارسید کہ دماغ نے بھی مرکز سے مغائرت کی اور نیم بے دار ہستیوں نے اپنی زندگی کا یہ مقصد بنالیا کہ تمام دنیا ہم خیال بنالی جائے۔ اس گروہ کے ایک پر جوش اور سرگرم ممبر نے اپنے ذمہ یہ کام لیا کہ وہ ہر طبقہ کے لوگوں سے ملے گا اور اُن کے افعال و کردار کو اُس اُصول کا پابند بنالے گا جس کے انکشاف پر لوگ اپنا اور بشرطِ امکان دوسروں کا سر پیٹ لیں گے۔ تشریح مقصد کے بعد غالباً اس امر کی ضرورت نہ محسوس کی جائے گی کہ ہمارے دوست کا سراپا ''کاغذی پیرہن'' سے ملبوس ہوکر ناظرین کے سامنے آئے۔ صورت ظاہری کے متعلق اتنا کہہ دینا غالباً کافی ہوگا کہ ''صورت سوال'' تھی عمر کے اعتبار سے ''فرو ریزو پر وبال'' کے مرحلہ تک نہیں پہنچے تھے۔ سن وسال کے تعین کے بعد اس امر کی بھی حاجت باقی نہیں رہتی کہ ان کے قول و فعل کی تشریح کے لیے کسی چوراہا کے اس ساکن و جامد ستون کی مثال پیش کی جائے جو آئندہ روندگان کو منزل مقصود کا پتہ بتاتا ہے، لیکن خود متحرک نہیں ہوتا۔

....

شہر کی ہمہ آفریں آبادی سے الگ ''ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی'' کی مصداق افیونیوں کی ایک خانقاہ تھی جس میں تقریباً ایک درجن تریاکیوں کی یاداللہ تھی، شیخ خانقاہ ایک طویل القامت نحیف الجثہ میر صاحب تھے جنھیں فیرنی کی دوکان اور مٹی کا حقہ اپنے جدامجد سے وراثت میں ملا تھا۔ فیرنی کی دوکان افیونی کا حلیہ شرعی اور بوسیدہ حقہ ہوحق کا عذر لنگ تھا۔ حقہ کا ''عرق مطبوخ ہفت روزہ'' جراثیم بصارت کے لیے پیام وصال تھا۔ دھوئیں کی سیاہی دیوار کی پردہ دار اور دروازہ کواڑ کی دست وگریبانی سے آزاد تھا۔ سپیدی نے ہر جگہ سے مغلوب ہوکر اپنا آخری خط دفاعی شیر برنج کی سطح پر قائم کیا تھا جس کی جھلک کبھی کبھی کسی افیونی کی نیم باز آنکھوں میں بھی نظر آجاتی تھی۔ اراکین اکثر وبیش تر مراقبہ میں رہتے تھے۔ اس لیے دوکان داری کا پورا انتظام ان مکھیوں کے سپرد تھا جو بیسویں صدی کے حکمرانوں کی طرح حکومت کی کامیابی محض مارشل لا میں مضمر سمجھتے تھے، لیکن یہ انتظام کچھ زیادہ کامیاب نظر نہ آیا تو حقہ سے اُس Scare Crow (ہوا) کا کام لیا جانے لگا جو زراعت و پیداوار کو چرند پرند سے محفوظ رکھنے کے لیے کسان اپنے کھیتوں میں نصب کردیتے ہیں۔ مجھے ان بزرگوں کی سادہ دلی پر حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے خواہ مخواہ اپنی

فکر کو زحمت پرواز دی، اُن کا باہمہ اور بے ہمہ وجود خود اس فرض کو بطریق احسن پورا کرتا تھا، لیکن کسی پُرعظمت ہستی نے اپنی شخصیت کا احساس کب کیا ہے جو یہ کرتے!

ان بزرگوں کے پاس جامۂ عریانی کے علاوہ صرف عشاق کے دامن و گریباں کی دھجیاں رہ گئی تھیں اور چوں کہ انھوں نے دھجیوں کی مقامی حیثیت بدلنے میں احترام شعریت کو ستر پوشی پر قربان کر دیا تھا۔ اس لیے آپس میں یہ اقرار صالح کیا گیا تھا کہ ان دھجیوں کو زیب عریانی کرنے کے بعد کوئی صاحب عاشقی کا دم نہ بھریں ورنہ پھر میونسپلٹی کا جام صبر لبریز ہو جائے گا اور اس نے انھیں ایک مجہول نوئسنس سمجھ کر ہمیشہ چشم پوشی سے کام لیا ہے، لیکن ان کا یہ اشتد ادی پہلو دیکھ کر اپنا جبری مہمان بنانے کے لیے مجبور ہو جائے گی۔ ایک طرف طلسم ہوشربا کی ایک ضخیم جلد پڑی ہوئی تھی، جس کے اوّل و آخر کے تقریباً دو سو صفحات 'سحر سامری' سے نذر ساد ر ہو چکے تھے اس وقت ہر شخص شغل میں مصروف تھا۔ رطب اللسانی اور زبان کی ''گھلاوٹ'' کچھ تو اس پیالی میں چنکیوں سے کھل رہی جا رہی تھی اور کچھ اس لب ولہجہ میں مضمر تھی جس کا پورا ساز (ارغنوں) صرف نون غنہ کا رہین منت تھا۔ مخاطب کوئی نہ تھا ہر شخص اپنے اپنے خیالات، اقوال اور ملہمات کی صورت میں پیش کر رہا تھا۔ کچھ حضرات گنے چھیل رہے تھے اور اُن کی یک سوئی اور انہماک میں اگر کوئی چیز مخل ہو سکتی تھی تو زکام و بلغم کی متحدہ مساعی تھی۔ ایسی حالت میں چاقو علاحدہ رکھ دیا جاتا تھا ورنہ اندیشہ تھا کہ عالم خود فراموشی میں ناک و چاقو کا وصال ناک صاف کرنے کا موجب نہ بن جائے۔ یوں تو دوکان خرید و فروخت کے لیے رکھی ہی گئی تھی، لیکن اگر کوئی ایسا خریدار آ جاتا جو فیرینی کے پیالوں کا طلب گار ہوتا یا ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز، نہ ہوتا تو پھر ہر شخص پلکوں کی آڑ سے کچھ اس طور سے گھورتا کہ قدرت ہوتی تو اسی سلسلہ میں اسے بھی چنکیوں کے فشار سے آشنا کر دیتے۔ تعجب تو یہ ہے کہ خود میر صاحب بھی کسی گاہک کی آمد سے خوش نہ ہوتے تھے اور ہمیشہ قیمت ایسی بتاتے تھے کہ خریدار کو ردّ و قدح کی ضرورت پیش آئے۔ میر صاحب اس حالت کے منتظر ہی رہتے۔ فرماتے ''میاں راستہ سیدھا کرو یہ خود ہمارے شوق کی چیز ہے، تمام دن سر کھپاتے ہیں تو اتنی سی تیار کر پاتے ہیں۔ میاں صاحب زادے عمل کرتے ہو تو آ جاؤ سب سامان تیار ہے، اک ذرا حقہ رنگ پر آیا اور میاں منجھو نے سفالہ میں گنڈیریاں لگائیں اور ہم نے چنیا

جان کر منہ لگایا۔'' مریدوں نے صدائے لبیک بلند کی، ''واہ واہ'' سبحان اللہ۔ ارے بھئی ہم تو اسی شہنشاہی مزاج پر مرتے ہیں'' کے غلغلہ سے خریدار مبہوت ہوکر لاحول بھیجتا ہوا چل دیا۔ میر صاحب کوئی وزیر اعظم تو تھے نہیں کہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ، ان کے وابستگان دامن اُن کے قول و فعل کو یکساں سمجھتے تھے ورنہ میر صاحب کی عظمت عرصہ تک قائم نہ رہ سکتی اور وہ بھی آخر میں موچی کے موچی، رہ جاتے۔ غرض کہ فوراً تمام سامان درست ہوگیا۔ خورد ونوش کے بعد کتاب کھولی گئی اور بدیع الزماں کی داستان شروع ہوئی۔ میاں منجھو اس دم خم کے ساتھ پڑھتے تھے گویا تمام واقعہ انھیں کی ذات سے وابستہ تھا۔ یہ حالت کچھ انھیں کی ذات کے ساتھ مخصوص نہ تھی۔ حاضرین بھی اُسی زیر و بم کے ساتھ داد دے رہے تھے۔ سامری اپنا طلسم ناریل پھینکتا اور اژدہوں کا یلغار ہوتا تو اس طور پر جھرجھری لیتے جیسے نااہل کو اپنی خوش قسمتی پر ناز ہوتا ہے یا آج کل کے نوجوانوں کو بیوی سے زیادہ اس کی دولت ملنے کی مسرت ہوتی ہے۔ اب اس ہنگامۂ رستخیز میں کسی قدر اضمحلال پیدا ہو چلا تھا کہ یکا یک ایک نوجوان آدھمکا۔ ہمارے ناظرین مضمون کے پچھلے حصہ میں ان سے روشناس ہو چکے ہیں اس لیے ان کے اغراض و مقاصد اور ہیئت کذائی کا تذکرہ تحصیل حاصل ہوگا۔

....

نوجوان: ''السلام علیکم''

یکے از حاضرین: ''میاں وعلیکم السلام'' (یہ جملہ اس حزن آفریں موسیقیت کے ساتھ اور اتنے عرصہ میں ادا کیا گیا گویا ہر شخص نے دن کا پورا کام جو گویائی سے متعلق تھا ختم کر دیا ہے۔

نوجوان: (بے صبری کے ساتھ) ''مزاج شریف''

وہی بزرگ: ''میاں شکر ہے، الحمدللہ'' (ناک میں) نزلہ وزکام...کریما بہ بخشائے بر۔

نوجوان: ''حضرات میں ایک خاص کام سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، آپ....''

میر صاحب: (بات کاٹ کر) ''ارے میاں اب کیا رکھا ہے، کب کا عمل ہو چکا، ذرا پہلے آئے ہوتے۔''

نوجوان: (بے اختیار ہوکر) ''آپ ایسے روشن خیال بزرگوں پر یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ آج کل قوم وملت کی کیسی ابتر حالت ہو رہی ہے.......''

ایک افیونی: ''اس میں کیا شک ہے ایک افیون ہی کو لے لو۔''

نوجوان: (چیں بجبیں ہوکر لیکن نرمی سے) یہ تو دیکھیے مسلمان تباہ ہو رہے ہیں۔ بیوہ اور یتیم فاقہ کر رہے ہیں، گورنمنٹ.....''

دوسرا افیونی: ''میاں صاحب زادے، شادی کر چکے ہو؟''

نوجوان: (طیش میں آکر) ''شادی کی کیا ضرورت ہے، میں جب تک برسرکار نہ ہو جاؤں گا، بیوی بچوں کی ذمہ داری لینا گناہ سمجھتا ہوں۔ مسلمانوں پر کیا آفت ہے، چار چار شادیاں روا رکھتے ہیں، کیا یہ محبت کی صریح توہین نہیں ہے؟''

منجھو: (مراقبہ میں سر جھکائے ہوئے) ''صاحب زادے سچ کہتے ہو، لیکن کہیں تم سے پہلے تمھاری بیوی نہ برسرکار ہو جائے۔ چار چار شادیوں کا زمانہ (آہ سرد کھینچ کر) تو کچھ ہم نے دیکھا ہے۔ تم کیا دیکھو گے، ایک پیالی چائے اور....... کے کھانوں پر تو صرف صنفِ نازک کا خواب نظر آسکتا ہے، چار بیویوں کو تو علاحدہ ہی رکھیے۔ اگر چار شادیوں کا خیال محبت کی توہین ہے تو شاید تم ایسے چار نوجوانوں میں ایک ہی....... محبت کی حرمت ہے۔''

نوجوان: (غضب ناک ہوکر) ''اور کیوں جناب غیر تعلیم یافتہ بیوی اور اسے چہار دیواری کے اندر محبوس رکھنا چہ معنی دارد؟''

افیونی: یا حضرت، بیویاں تو ہماری بھی پڑھی لکھی ہوتی ہیں۔ ہاں ''تعلیم یافتہ'' نہیں ہوتیں۔ آپ کے مسلک ''صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے'' سے تو چہار دیواری کی قید اختیاری اچھی ہی ہے۔''

نوجوان: (بے بس ہوکر) دیکھیے معاملہ کہاں سے کہاں تک پہنچ گیا، میں یہاں آیا تھا کہ آپ کے پاس موجودہ دنیا کی سب سے بڑی ہستی کا پیام پہنچاؤں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ ہندوستان کی نجات عدم اشتداد اور چرخے پر ہے۔ کھدر استعمال کیجیے اور اشتداد سے پرہیز کیجیے۔''

میر منجھو: ''میاں، میں نے تم سے دو کپڑے زیادہ ہی پھاڑے ہوں گے۔ اپنا تو خیال ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی ہستی گزر چکی ہے۔ موجودہ اور آئندہ، ایک مہمل خیال ہے کیا معلوم

کل دنیا کی ایک اور بڑی ہستی تمھاری آنکھوں کو خیرہ کرنے لگے، پھر کمزور ہستیاں تو کہیں کی نہ رہ جائیں گی۔ عدم اشتداد کا پیام ہمارے پاس لائے ہو؟ ہم نے تو اس کے ہاتھ پر بیعت کی ہے جس کے تصرف سے بڑے بڑے متمرد سربہ سجود ہو جاتے ہیں۔ کپڑے کے لیے کیا کہوں، جامہ ندارم دامن از کجا آرم۔ چرخہ کا مسئلہ طویل بحث چاہتا ہے اور اس وقت طبیعت بے کیف ہو رہی ہے۔ یہ لیجیے حقہ بھی دم توڑ رہا ہے۔''

نوجوان: مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے مشاغل میں حارج ہوا، میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات ایک مجلس منعقد فرمائیں۔ میں آپ کے سامنے ان خیالات کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں جن پر میرے خیال ناقص میں ملک وملت کی فلاح ونجات کا انحصار ہے۔ آج کل تمام ملک میں بیداری کے آثار نمایاں ہیں اور میرے لیے یہ خیال نہایت روح فرسا ہے کہ آپ حضرات کی توجہ مبذول کرانے میں نہایت غفلت شعاری سے کام لیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ہمارے خیالات سے ہمدردی فرمائیں گے۔

میر صاحب: میاں صاحب زادے، تمھاری نیت اچھی ہے، لیکن طرز عمل بالکل غلط ہے۔ تم نے ابھی ہمارے مسلک کی اہمیت پر غور نہیں کیا ہے تم جس جنت کا خواب دیکھ رہے ہو وہ

وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا[1]

اچھا اگر تم اس بات پر مصر ہو کہ ایک جلسہ منعقد ہونا چاہیے تو مجھے انکار نہیں ہے، لیکن دیکھو یہ کوئی اجتماع عظیم نہیں ہوگا کہ اخبارات واشتہارات سے تم تمام شہر سر پر اٹھا لو۔ ہماری طرف سے کوئی مدعو نہیں ہوگا، تمھیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ کوئی نا اہل ایسا نہ آنے پائے جو مطلب اور کنہ کو نہ سمجھے تو تالیاں بجائے۔ ہاں اس کا ضرور خیال رکھنا کہ جلسہ میں کوئی سی آئی ڈی کا بھی ممبر ہو، بہت ممکن ہے ہم یا تم کچھ مہمل اور بے معنی فقرے بول جائیں اور اس کا سمجھنے والا کوئی نہ ہو، پھر ساری محنت برباد ہو جائے گی۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم آنے والوں کی تخمینی تعداد بھی مجھے بتا دو، کیوں کہ اس تمام جلسہ کا انتظام شرعی ہوگا۔

---

1 پورا شعر اس طرح ہے:

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا + وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا غالب

نوجوان: جناب سب باتیں آپ کی مرضی کے مطابق ہوں گی آپ مطمئن رہیں۔
(یہ کہہ کر جلسہ کا وقت و تاریخ مقرر کر کے نوجوان نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، لیکن میر صاحب دوسرے عالم میں پہنچ چکے تھے)۔

ہمارے ایک افیونی دوست جن کے ذہن میں سوائے جلسہ یا مدعو کرنے کے کوئی اور مفہوم پناہ گزیں نہیں رہتا تھا۔ مراقبہ ہی میں کچھ کلبلائے اور ایک طویل نون غنہ کے ساتھ بولے، ''اور کیوں بھائی گانا کس کا ہوگا......کم بخت دھوبی ہے کہ کپڑے ہی نہیں دیتا۔''

دوسرے بزرگ جو نیم بیدار حالت میں تھے، ٹھنڈی سانس لے کر بولے ''میاں گانا کیسا سب کام شرعی ہوگا۔''

پہلے بزرگ (آہ سرد کھینچ کر) ''تو یوں کیوں نہیں کہتے 'قوالی' ہی پڑ رخایا۔''

ایک تیسرے بزرگ بولے، ''اور کیوں بھئی دن تاریخ کیا مقرر ہوئی کہیں قمر در عقرب تو نہیں پڑتا؟''

ایک طرف سے آواز آئی۔

''مشیت ایزدی میں کس کا چارہ ہے''

(برجستہ خیالی داد طلب ہے)

....

جلسہ کی تاریخ قریب ہے۔ میر صاحب صدر مجلس ہونے والے تھے، لیکن اس میں یہ دقت پیش آئی کہ اُسی زمانہ میں ان کا مسہل تھا اس لیے ایک دقیع تر ذمہ داری کے مقابلہ میں انھیں اس فرض کو قبول کرنے میں تامل ہوا۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ ان کا خطبۂ صدارت اس وقت تک پُر مغز نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ اسے کوئی دوسرا شخص نہ لکھ دیتا اور اس کے بعد اتنی مدت بھی مل جاتی کہ وہ اس کے الفاظ اور معنی پر پورا عبور حاصل کر سکیں۔ ورنہ ان کی حالت اس پروفیسر کی ہو جاتی جو لکچر دینے کے مقابلہ میں نوٹ لکھانا زیادہ محفوظ خیال کرتا ہے۔ غرض کہ بہت تلاش و جستجو کے بعد ہمارے دوستوں کی نظر ایک ایسے ہم مشرب پر جا پڑی جن کے انتخاب پر تمام افیونیوں کی پسلی پھڑک اُٹھی۔ آخر کار جلسہ کا دن بھی آ پہنچا، جس طرح باوجود تمام حلیۂ شرعی کے براتیوں کی

تعداد ہمیشہ تعداد متعینہ سے بڑھ جاتی ہے، اسی طرح حاضرین کی تعداد میں بھی کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ فیرینی کا خوانچہ جہاں رکھا جاتا تھا وہ حصہ کسی قدر وسیع اور مرتفع تھا۔ اس لیے کرسی صدارت کے لیے وہی جگہ منتخب ہوئی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں تمام جگہ پُر ہو گئی۔ میر صاحب نے انتخاب صدر کی تحریک پیش کرتے ہوئے حسب ذیل تقریر فرمائی۔

حضرات! انتخاب صدر کی تحریک پیش کرنے کا خوش گوار فرض میرے سپرد کیا گیا ہے۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں اپنے بزرگ دوست کی شان میں کچھ معرفانہ الفاظ و خیالات ادا کرنے کی عزّت حاصل کروں۔ وقت بہت کم ہے، جناب صدر اُن مغتنم ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے اس عالم انقلاب میں زمانہ کی نیرنگیوں کا بہ نظر احسان مطالعہ کیا ہے، جن حالات اور واقعات کی بنا پر آج اس مجلس شوریٰ کی ضرورت پیش آئی ہے ان پر صحیح و صائب رائے قائم کرنے کا جناب ممدوح کو صرف حق ہی نہیں حاصل ہے بلکہ ممدوح کے ''تجرباتِ حالیہ'' ایک بڑی حد تک ہمارے میدانِ عمل کے لیے خضر راہ بن سکتے ہیں۔ موصوف نے اپنے چندور چند مشاغل کے باوجود جس اخلاق و ہمدردی کے ساتھ ہماری دعوت قبول فرمائی ہے اس کے ہم سب شکر گزار ہیں۔ اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور آپ سے ملتجی ہوں کہ آپ ممدوح کو اپنا صدر منتخب فرمائیں۔

ایک دوسرے بزرگ نے اس تحریک کی تائید میں کچھ مختصر الفاظ کہے اور باتفاقِ آرا انتخاب عمل میں آیا۔

جناب صدر کو ضعف اور کمزوری کی وجہ سے کھڑے ہو کر تقریر کرنے میں تکلف ہوتا تھا، لیکن لوگوں کے اصرار سے اسی روشلک حقہ کی ٹیک لگا کر کھڑے ہو کر جس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے، کچھ لوگوں نے بڑھ کر پوست کے پھولوں کے ہار جناب صدر کے گلے میں ڈال دیے۔ حاضرین تالیاں بجانے سے باز نہ رہ سکے اور جناب صدر نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر دو چار دھواں دھار کش کھینچ لیے اور لوگوں کو عالم حواس میں پا کر یوں گہر افشانی شروع کی۔

برادرانِ مشرب! میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اپنا صدر بنا کر میری عزّت افزائی فرمائی۔ جن حالات یا واقعات کی بنا پر آپ نے مجھے اپنا صدر بنایا ہے اُن کا میں نے بغور مطالعہ کیا ہے۔ آپ یقین فرمائیے میں آپ کے سامنے کوئی ایسی بات نہیں پیش کروں گا جس

کی اہمیت یا صداقت کا میں خود قائل نہیں ہوں۔ میں اُن لوگوں میں نہیں ہوں جو تقریر کرتے وقت یہ امر بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں کہ کبھی وہ بھی انسان رہے ہیں اور ان کی ہدایات ونصائح پر عمل کرنے والے بھی انسان ہی ہوں گے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اور غالباً اس وقت آپ میں کوئی صاحب ہوش نہ تھا، میں نے دو باتوں پر غور کیا ہے۔ اوّل تو یہ کہ دنیا انسانوں کے لیے نہیں بنائی گئی ہے اور میرا خیال ہے کہ انسانوں کے بسنے کے لیے اب تک کوئی فضا تعمیر نہیں کی گئی ہے اور نہ اس کا عالمِ وجود میں آنا ممکنات سے ہے۔ ممکن ہے میں غلطی پر ہوں، لیکن میرے اس خیال کی معقول تردید اب تک نہیں ہو سکی ہے کہ یا تو دنیا میں کوئی انسان نہیں ہے یا پھر "انسانیت" کے صفات غلط وضع کیے گئے ہیں، اور اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اب تک جتنے الفاظ وضع کیے گئے ہیں وہ یا تو اصلی مفہوم کو بالکل نہیں ادا کرتے یا پھر غلط طور پر ادا کرتے ہیں۔ انسان اپنی معاشرت کے مختلف پہلوؤں کی ترتیب وتنظیم کے اصول وقواعد وضع کرتا ہے جسے ہم قانون کہتے ہیں اور تہذیب نام ہے اسی قانون کے نفاذ واثر پذیری کا!

اس لیے تہذیب، اصول وقوانین کا مظہر خیال کی جا سکتی ہے نہ کہ انسان وانسانیت۔ اگر غور کیا جائے تو یہ راز نہایت آسانی سے واضح ہو جائے گا کہ جو چیز کسی شے کے لیے وضع کی جاتی ہے وہ اس شے کی ذات نہیں خیال کی جا سکتی۔ تہذیب نام ہے تلوّن کا جو انسان کی ایک صفت اضافی ہے۔ اس لیے ہر تہذیب جس کی بنیاد ایسی کمزور ہو، شرفِ انسانیت کے لیے مہلک ہے۔ آپ کا دوسرا سوال یہ ہوگا کہ یہ دنیا اگر انسانوں کے لیے نہیں بنائی گئی ہے تو پھر اس کی آبادی کن نفوسِ قدسیہ پر مشتمل ہونی چاہیے۔ اس کے لیے میں یہ عرض کروں گا۔ اس میں صرف دو ہستیوں کا گزر ہو سکتا ہے، یعنی فلسفی یا ملائک کا۔ ایک انسانی صفات کا منکر دوسرا انسانی کمزوریوں سے محروم (حاضرین نے تالیاں بجانی شروع کر دیں اور جنابِ صدر نے جلد جلد حقہ سے شغل شروع کر دیا۔)

دوسری بات میرے ذہن میں تھی کہ اگر انسان کے لیے کوئی دنیا خلق نہ کی گئی تو پھر ان ناخواندہ مہمانوں کو کیا کرنا چاہیے، جن کے وجود کے جواز میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ یا میزبان ضرورت سے زیادہ سیر چشم ہے یا مہمان اس سے زیادہ عقل مند! دنیا کا موجودہ طور وطرز دیکھ کر

مجھے ان کمزور حکمرانوں کی حالت یاد آجاتی ہے جو دوسروں کو مغلوب رکھنے کے لیے ایک زبردست فوج قائم کرتے ہیں، لیکن رفتہ رفتہ یہی فوج خود ان کی عزل ونصب کی عنان اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہے۔ قحط، وبا، جنگ، خودکشی، فلسفہ، غرض کہ ان میں کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو انسان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کے لیے کافی نہ ہو۔ لیکن فطرت کی ایک ذرا سی بے اعتدالی سے توالد وتناسل کے رازہائے عریاں ان پر کچھ اس طور سے منکشف ہوگئے ہیں کہ انھوں نے بطور پروٹسٹ اپنے تمام اضطراری انفعال کو اختیاری بنالیا ہے۔ زن وشو کے تعلقات پر اگر کوئی معقول بات سمجھانے کی کوشش کرے تو نہایت غیر ذمہ دارانہ طریقہ سے کہتے ہیں ''یہ تو آنریری کام ہے جواب دہی کیسی؟''

یورپ کے بعض اکابر کا خیال ہے کہ خواہ انسان شادی کرلے، خواہ پھانسی پر لٹک رہے دنیا سے گلوخلاصی ناممکن ہے۔ وہاں کے ایک مقتدر صحیفہ میں ان لوگوں کی تصاویر دی گئی تھیں جنھوں نے خودکشی کرکے دنیا کو خیرباد کہا تھا، ان کا خاکہ اُلو کی شکل میں پیش کیا گیا تھا، لیکن ان لوگوں کو یہ کون سمجھائے۔ بسااوقات زندہ اُلو (جس کی کمی نہیں ہے) اپنے مردہ دوست سے زیادہ قابلِ مضحکہ نظر آتا ہے۔ لیکن یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس میں غلط فہمی کی گنجائش باقی ہی نہیں رہتی اور یہ بحث کا نہایت خطرناک پہلو ہوتا ہے اس لیے میں اسے یہیں ختم کرتا ہوں۔

(غور کرنے سے پتہ چلا کہ اس سلسلۂ تقریر کے ختم ہونے پر بہت سے حضرات جن پر اضطرابی حالت طاری ہونے لگی تھی مطمئن ہوگئے تھے۔)

حضرات اب میں نفسِ مطلب پر آتا ہوں۔ آپ بھی غور فرمائیں.......

(صدر کا یہ کہنا تھا کہ ہر افیونی نے اپنی اپنی خورجی سے ایک ایک ڈبیا اور پیالی نکالی، ادھر گھلنے لگی اُدھر جناب صدر نے ایک گولی منہ میں رکھی اور حقہ سے ہم آویز ہوکر، تقریر کا سلسلہ شروع کردیا۔

حضرات اب تک جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا اور انسان دونوں کچھ ''یونہی سے'' ہوکر رہ گئے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس امر کی متقضی ہے کہ یا تو انسان کے لیے کوئی دوسری دنیا خلق کی جائے یا اس دنیا کے لیے دوسرے لوگ پیدا کیے جائیں۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ فطرت کا فیصلہ کسی کمیٹی کے ہاتھ میں ہے اور نہ وہاں کسی مجلس شوریٰ کا وجود ہے۔

فطرت ایک حکومت مطلقہ ہے جو کسی دستور یا آئین کی متحمل نہیں ہوسکتی، اس لیے ہم نے اپنے لیے ایک نیا راستہ تجویز کیا ہے جسے خیر الاموراوسطہا کہہ سکتے ہیں۔ یعنی زندگی اس طور پر بسر کی جائے کہ ''رند کے رند رہیں'' اور ''ہاتھ سے جنت'' بھی نہ جانے پائے۔ بالفاظ دیگر ہم افیون کی طرف رجوع کریں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے بھائی فلسفی اس وادی کے امام رہ چکے ہیں اور ہم ان کے نقش مقدم پر چلتے ہیں، لیکن ہم ایک طرز نو کے موجد بھی ہیں یعنی فلسفہ میں کیف پیدا کر دینا ہمارا اعجاز ہے۔ فلسفی اور ہم دونوں بحر حیات کے گم شدہ مسافر ہیں، فرق صرف یہ ہے اسے ساحل نہیں ملتا ہم کو کشتی نہیں ملتی۔ لیکن ان امور سے قطع نظر بھی کر لیں تو ہمارا مسلک ہر طرح سے قابلِ رشک تسلیم کیا جائے گا۔ چشم بد دور اس وقت جامع المتفر قین نے ہم سب کو اکٹھا کر دیا ہے۔ آپ سب صاحبان جانتے ہوں گے کہ افیون کا ایک جرعہ جس وقت حلق سے اُترتا ہے اس وقت رگ رگ میں شبنم حیات نفوذ کر جاتی ہے۔ آنکھیں ماسوا سے پھر جاتی ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمام جسم صرف روح ہے اور روح ایک کیفِ محسوس! صاحبو اس حالت میں عالم سفلی کی کوتاہ بین نظریں ہمیں صرف ایک از کار رفتہ افیونی خیال کرتی ہیں (متعدد آوازیں..... شرم شرم!)

لیکن ان سادہ لوحوں سے کوئی پوچھے کہ افیونی سے افیون کی مذمت کس منطق سے استنباط کی جاسکتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسے لوگ کبھی حقیقی معنوں میں افیونی نہیں ہوسکتے۔ یہ حضرات تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ہم شکستہ حال، کسی بوسیدہ بورئے پر بیٹھے ہوئے مراقبہ میں ہیں یا وجد کر رہے ہیں اور حقہ (اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ یک بہ یک ذہن اس حقہ کی طرف منتقل ہوا جس کے سہارے نون غنہ کا طوفان برپا کر رکھا تھا۔ فرمایا ''لاحول ولاقوۃ باتوں ہی باتوں میں حقہ بھی ہاتھ سے گیا تھا'' یہ کہہ کر دو چار کش کھینچے، ایک آدھ جھپکی بھی لی، لیکن فوراً ہی سنبھل گئے)...... ہمارے منہ سے لگا ہوا ہے، لیکن ان کو کیا معلوم اس وقت ہماری روح کہاں ہوتی ہے؟ جب روح علیین کی طرف گرم پرواز ہوتی ہے اس وقت عالم سفلی میں صرف ہمارا جسد خاکی رہ جاتا ہے اور یہ حقہ ان دونوں عالموں کا زاویۂ اتصال! لیکن لوگ ان کیفیات سے واقف تو ہو نہیں سکتے۔ ہمارے متعلق عجیب عجیب قسم کے قصے اور افسانے تراشا کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ عوام صرف بوالہوس افیونی دیکھ سکتے ہیں جن کے افعال اور کردار کا جائزہ لینا اور اس پر رائے قائم کرنا

خطرناک ہے۔ اصلی اور حقیقی افیونی وہ ہے جس کے یہاں مدت حیات ''کیف وسرور'' سے ناپی جاتی ہو نہ کہ دن مہینہ یا سال سے، انسان کی زندگی کا سب سے بڑا دشمن وقت کا تخیل ہے۔ اگر یہ ذہن سے مفقود ہو جائے تو پھر تمام زندگی ایک مسلسل کیف ہے۔ ہمیں دیکھئے ہم کو نہیں معلوم آفتاب کب نکلا، کب غروب ہوا، رات کب آئی، اور سپیدۂ سحر کب نمودار ہوا۔ ہم صرف یہ بتا سکتے ہیں کہ روح نے اس جسد خاکی میں آکر کتنی بار کروٹیں لی ہیں اور فردوس کے جھولے میں نرم نرم پینگیں لیتے لیتے ہم کب یکا یک گر پڑے۔

آج دنیا میں جو اضطراب رونما ہے، ہمارے پُر جوش دوست نے اس کا پچھلی بار تذکرہ کیا تھا، اور آج اس جلسہ کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ میرا خیال ہے کہ بجائے کسی اور کوشش کے اگر وہ افیون کی طرف توجہ کریں تو ان تمام مخمصوں سے نجات پا جائیں گے۔ آج تک آپ نے کسی افیونی کو دوسرے پر غصہ ہوتے نہیں دیکھا ہوگا، وہ غصہ میں اپنا مخاطب خود ہوتا ہے۔ کیا نفس کو مطیع بنانے کی اس سے بڑھ کر کوئی اور ترکیب نکالی جا سکتی ہے۔ اشتداد اس کے یہاں کفر ہے، پھر اور کیا چاہیے؟ اور پھر انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔ ہم گورنمنٹ کے لیے پانی کے علاوہ ہر قسم کی سختیاں جھیلنے کے لیے تیار ہیں۔ اس نے افیون کی سرپرستی جس فراخ دلی کے ساتھ کی ہے وہ ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ اس نے افیونی حاکم مقرر کیے جنھوں نے بڑے بڑے ذی ہوش لوگوں کا نشہ کرکرا کر دیا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ اہلِ چین اپنی حماقت سے باز آ جائیں اور افیون کی درآمد نہ روکیں، لیکن یہ نہ مانے۔ آخر جو کچھ ہونے والا تھا ان کے سامنے آیا۔ بیداری میں آخر تباہی اور مصیبت کے علاوہ اور کیا نظر آئے گا۔ اب دیکھتے ہیں کہ کہیں جاپان دست درازی کر رہا ہے، کہیں دوسرے برادرِ شغال موجود ہیں۔ غرض کہ ایک عجیب آفت میں مبتلا ہیں..........''

....

جنابِ صدر پر اضمحلال طاری ہو چلا تھا، حاضرین بھی بے کیف ہو رہے تھے، حقہ بھی جل چکا تھا، کچھ لوگ غنودگی کی حالت میں تھے، کچھ مراقبہ میں اور بقیہ دوسرے عالم میں پہنچ چکے تھے۔ بیداری اور بدحواسی صرف ہمارے نوجوان پر طاری تھی، جس نے ہمہ تن آرزو بن کر

جناب صدر سے تقریر کرنے کی اجازت حاصل کی۔ صدر ممدوح نے اپنی تقریر ختم کی اور نوجوان کو اشارہ کیا کہ وہ بھی اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ پہلے تو نوجوان نے اپنی نیازمندی کا اعتراف کیا، اس کے بعد اپنے چند در چند مشغولیتوں کا اعادہ کیا اور اب نفسِ مضمون پر آنے والا ہی تھا کہ اس کی نظر جناب صدر پر جا پڑی جو حقہ منہ سے لگائے بورئے پر دراز ہو چکے تھے۔ نوجوان کو اپنی تقریر از بر تھی۔ پہلے تو اس نے ایسی ترکیبیں کیں کہ کچھ لوگ بیدار ہو جائیں، لیکن اس نے یہ مناسب نہ خیال کیا کہ ساری محنت یونہی رائیگاں جائے۔ اس لیے اس نے نہایت بلند آہنگی سے سب سے پہلے یہ شعر پڑھا۔

در دشت جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ [1]

تھوڑی دیر کے بعد کسی طرف سے ایک نحیف آواز آئی۔

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ناظرین بتائیں نوجوان کو کیا کرنا چاہیے تھا؟

(مطبوعہ: علی گڑھ میگزین۔ علی گڑھ، نومبر۔ دسمبر 1922)

●●●

---

1 اقبال۔ ترجمہ: میرے دشتِ جنون میں جبریل تک کا شکار آسان ہے۔ اے ہمت مردانہ تو ذرا اور ہمت کر کے یزداں کو بھی اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کر۔

فلسفۂ ازدواج

ایک بزرگ ہیں جنھیں رزق ہے نہ موت!

مجھ سے اکثر ملتے ہیں اُن کی وضع اور ہیئت دیکھ کر دل میں مختلف قسم کے خیالات آنے لگتے ہیں جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے خواہ کتنے ہی متضاد کیوں نہ ہوں، اکثر و بیش تر صحیح ہوتے ہیں۔ کبھی تو یہ بالکل 'والدین' معلوم ہونے لگتے ہیں، معاً خیال آتا ہے کہ یہ صرف معدہ کے مریض ہیں اور دیگر امراض کے ایک متروک الایام طبیب۔ تھوڑی دیر میں یہ ظاہر ہونے لگتا ہے کہ یہ کالج میں کسی جگہ کے اُمیدوار ہیں اور خدایانِ یونیورسٹی کی آستانہ بوسی کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔ عقل و فکر پر ذرا اور زور دیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ صرف ایک مایوس الحال فلسفی ہیں۔

ایک روز وہ مجھ سے ملنے آئے، کامل چار گھنٹہ کی نشست رہی جس میں وہ مشکل سے ایک درجن فقرے بول سکے۔ ایک طرف وہ مستقل سوالیہ جملہ کی شکل میں بیٹھے رہے۔ دوسری جانب میں جملۂ معترضہ بنا رہا، اور ہم میں سے ہر ایک کسی ایسے مسئلہ کو چھیڑنا چاہتا تھا جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ فریقِ ثانی کو احمق سمجھتا ہے۔ اکثر جب نشست طویل ہوتی ہے اور کوئی مسئلہ گفتگو کے لیے نہیں ملتا تو فریقین کچھ اس طور پر اپنے اپنے رُخ اور پہلو بدلتے ہیں جس سے ایک تیسرا شخص جس کی موجودگی کا ان دونوں کو علم نہ ہو، فوراً اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ دونوں احمق ہیں۔ بعض وقت فطرت خود اپنے انتہائی ستم ظریفانہ طریقے سے اس ضبطہ کا ازالہ کرتی ہے اور ایک ایسا

حادثہ ہوتا ہے کہ دونوں گھبرا کر قفلِ سکوت توڑنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایسے وقت میں جس طور پر سلسلۂ گفتگو چھیڑا جاتا ہے وہ دونوں کی حماقت پر آخری لفظ ہوتا ہے۔ اس وقت ہم دونوں ایک دوسرے کے متعلق جیسا کچھ خیال کر رہے تھے اور اس کا اثر جیسا کچھ ہماری ظاہری شکل وصورت پر پڑ رہا تھا، اُس کا اندازہ اس طور پر ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی ستم ظریف ہم دونوں کے سامنے ایک ایک آئینہ لا کر رکھ دیتا تو معلوم نہیں ہم میں سے کون فریق ثانی پر دست درازی کرنے پر پیش قدمی کرتا!

ان بزرگ کا خیال ہے کہ دنیا اپنا مرکز چھوڑتی جاتی ہے اور میرا خیال ہے کہ بیاس کی جگہ لینے کے لیے مخصوص ہو چکے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ "اس پردۂ زنگاری میں" ممکن ہے کبھی "کوئی معشوق" کارفرما رہا ہو، لیکن اگر وہ کوئی حور نہ تھی تو اب اس کی حیثیت صرف ایک سرکہ جبیں اور چیرہ دست 'بیوی' کی رہ گئی ہے۔ مرورِ ایام سے کسی معشوق کا بیوی بن جانا اتنا ہی لازی ہے جتنا کسی اچھے خاصے نوجوان کا والدین میں منتقل ہو جانا۔ پھر ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہیں ایک چیرہ دست بیوی اپنے متعلقین (جس کے چیئرمین، خواہ اُن کی حیثیت ایکس آفیشو کی کیوں نہ ہو۔ شوہر صاحب ہوتے ہیں) کے ساتھ کتنے دوررس اور زوداثر تعلقات روا رکھتی ہے۔ ہر ایسی بیوی تعزیراتِ ہند پر آخری لفظ ہوتی ہے اور ہر ایسا شخص ضابطۂ دیوانی کا ماہر، ہمارے دوست اُس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس کا بابا آدم ہی بیوی ہے۔ ان کی فلسفیت کی تاریخ ان کی بیوی ہے اور ان کی بیوی کی شانِ نزول وہی بت دیرینہ جو نسلاً بعد نسلٍ اور بطناً بعد بطنٍ منتقل ہوتی آ رہی ہے۔

....

میرے دوست کسی بحث کو پیش کرتے ہوئے ہمیشہ اس بات کو ملحوظ رکھتے ہیں کہ اس وقت تک جتنی گفتگو ہو چکی ہو اُسے موضوعِ جدید سے کوئی تعلق نہ ہو، لیکن وہ اسے پیش اس انداز سے کریں گے گویا یہ گفتگوئے ماقبل کا جزو لاینفک تھا۔ بیٹھے بیٹھے یک بہ یک فرمانے لگے "اور کہیے فلسفۂ ازدواج کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں ہمیشہ اُن سے عجیب وغریب کلمات سننے کا عادی رہا ہوں اس لیے مجھے ان کے اس سوال سے تعجب نہیں ہوا۔ میں نے کہا میں سوائے فلسفۂ ازدواج کے ہر فلسفہ کو ایک عاقل اور بالغ

مرد کے لیے شامت تصور کرتا ہوں! لیکن اگر عشق کی صفت حذف کردی جائے، اور بسا اوقات اس کے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آتا، تو پھر فلسفہ کا تعلق صرف ازدواج سے رہ جاتا ہے اور یہ دونوں چیزیں ممزوج ہو کر کارآمد ہو جاتی ہیں۔

ازدواج کے ساتھ فلسفہ کا ربط ایک طویل سلسلہ کسر وانکسار کی آخری کڑی ہے۔ سب سے پہلے شعریت ہوتی ہے۔ اس کے بعد ازدواج اور سب سے آخر میں فلسفۂ ازدواج۔ یہ تقسیم ایک تفصیلی بحث کی محتاج ہے۔ ازدواج سے پہلے ہر اُمیدوار یہ سمجھتا ہے کہ اسے جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ دنیا میں آج تک کسی کو نصیب نہ ہوا۔ اس کی وجہ ممکن ہے یہ ہو کہ اس سے پہلے انسان دورانِ خون سے عاری تھا، یا صنفِ نازک کا اس وقت تک انکشاف نہیں ہوا تھا، یا پھر دہلی اور لکھنؤ کے اطبا بے کار محض تھے! وہ بھول کر بھی نہیں خیال کرتا کہ اگر آج وہ خدنگِ نظر، سنانِ مژگان اور شمشیرِ ابرو کا قتیل ہے تو وہ دن بھی دور نہیں ہے جب اس اسلحہ خانے میں باورچی خانے یا موری خانے کا سارا اسباب واثاثہ بھی شامل کر لیا جائے گا۔ اس سے پہلے تو ممکن تھا کہ دوسرے بھی ان کی رفاقت پر تیار ہو جاتے، لیکن اب صرف انہی کے جانِ حزیں کو اس سے عہدہ برآ ہونا تھا اور وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ 'شہادت' اور 'زدوکوب' میں کون سی سعادت قابلِ دست اندازی پولیس ہے۔ ازدواج کا احساس اکثر اسی منزل سے شروع ہو جاتا ہے جب انسان یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ جس وادی میں اس نے قدم رکھا ہے وہاں وہ تنہا نہیں ہے اور جس چیز کو وہ پہلے ایک درسِ لطیف سمجھتا تھا اُس کی دفعات ضابطۂ دیوانی اور فوجداری میں بھی موجود ہیں۔

شعریت کا دور اکثر دو ہی طور پر ختم ہوتا ہے، بعض اوقات اُمیدوار یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اگر اس نے جذباتِ شعریت کو مزید تقویت پہنچانے کی کوشش کی تو فریقِ ثانی کے متعلقین اُن کے اعضاو جوارح کی اس طور پر آزمائش کریں گے کہ انھیں طبی امداد اور سارٹیفکٹ دونوں کی ضرورت محسوس ہونے لگے گی اور ضربِ شدید یا خفیف کے تشخیص میں آلۂ دھاردار یا کند معرضِ بحث میں آئے گا یا پھر گھروں میں بڑی بوڑھیاں یک لخت ایسے انہماک اور تگ و تاز کا ثبوت دینے لگیں گی جو اُن کے سن وسکت سے بالکل متضاد ہو گا۔ آپ ہزار کہیں گے آپ نے تکمیلِ تعلیم نہیں کی ہے، برسرِروزگار نہیں ہیں، عسرت ہے، لڑکی پڑھی لکھی نہیں ہے، حسین نہیں ہے، پیانو نہیں بجا سکتی،

کوئی شنوائی نہ ہوگی۔ اس میں شک نہیں یہ اعتراضات اکثر وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو خود جاہل اور کریہہ المنظر ہوتے ہیں اور جنھوں نے پیانو صرف گراموفون کے ریکارڈ میں کسی باجہ والے کی دوکان پر سنا ہے۔ کچھ یہ اعتراض کرتے ہیں، یہ ایک جھگڑا ہے۔ میری آزادی میں فرق آئے گا وغیرہ وغیرہ۔ حالاں کہ اکثر یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو مقامی اور گرد و نواح کی تمام اُن لڑکیوں سے جن کے والدین ضرورت سے زیادہ آزاد خیال ہوتے ہیں، عافیت سوز وابستگی رکھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک آزادی نام ہے اُس حیا سوز بے باکی کا جو اخلاقی قیود اور پابندیوں کا شیرازہ بکھیر دے۔ لیکن اس قسم کی شکایت کرنے والے اکثر وہ بزرگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی ہزرہ سرائیوں سے آسمان و زمین سر پر اُٹھا لیں گے، لیکن ایک طبی سارٹیفکٹ پیش نہ کریں گے کہ ایام سرما میں یا پہاڑوں پر انھیں چالیس دن تک کیا کرنا چاہیے اور نہانے اور کھانے میں ایسی کیا کیا باتیں ملحوظ رکھنی چاہئیں۔

بڑے بوڑھوں کے نزدیک لڑکوں یا لڑکیوں کی شادی کرنے کا بسا اوقات وہ زمانہ ہوتا ہے جب وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی منزل حیات کے آخری حدود ختم ہو رہے ہیں۔ میں اکثر سنتا ہوں کہ فلاں صاحب کے پاس تار آیا ہے اور شادی کے لیے اُن کی طلبی ہوئی ہے۔ قدیم مسلک کا ہندستانی ہونے کی وجہ سے میں تار پاتے ہی سراسیمہ ہو جاتا ہوں اور مجھے سورۂ یٰسین کا خیال آنے لگتا ہے۔ میں تو خط پا کر بھی پریشان ہو جاتا ہوں اور بہ یک نظر تمام مضمون میں صرف یہ دیکھ لینا چاہتا ہوں کہ کہیں کوئی عربی عبارت یا مشیت الٰہی وغیرہ تو نہیں لکھا ہے۔ شادی میں کسی کے تار طلب کیے جانے کے یہ معنی ہیں کہ یا تو کوئی بزرگ دنیا سے ہجرت کرنے والے ہیں اور اپنے نورِ چشم، راحتِ جاں کا سہرا دیکھنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ نوشہ سے بڑھ کر تمسخر انگیز ہیئت کسی کی نہیں ہوتی، یا دونوں خاندانوں میں اسباب و جائداد کا قضیہ پیش ہے یا پھر دولہا دولہن میں سے کوئی ایک اپنے حدود سے تجاوز کر رہا ہے۔

ازدواج کا دور اکثر عربی تقویم کے ماتحت، شام سے شروع ہو کر دوسرے دن کے اختتام تک ہوتا ہے۔ ''حجاب نوعروساں'' ممکن ہے، شب دیگر تک قائم رہے، لیکن شاعر صاحب کے سارے ردیف اور قافیے اس سے پہلے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ آنکھیں تو عرصہ تک بند رہتی ہیں،

لیکن بصیرت میں معتد بہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے غالب نے اسی ''صحبتِ شب'' کو مدِ نظر رکھ کر صبح کا نقشہ کھینچا ہو۔

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے!1

انگلستان میں ایک نا کت خدا عورت چھ مہینے تک عروس کہلاتی ہے۔ ممکن ہے اس عقیدے کی بنا مخصوص واقعات یا مشاہدات پر ہو۔ ہندوستان میں تو جب تک گھر کی بڑی بوڑھیاں زندہ رہتی ہیں یہ دلہن ہی کہلاتی ہیں۔ انگلستان ہر بات کو سائنس کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کا عادی ہے۔ علم خواص الاعضا یا علم المعاشرت کے بنا پر ممکن ہے وہاں کے لیے یہی حکم لازم آتا ہو۔ ہندوستان اپنی جہالت کے صدقے کچھ اور ہی رائے رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ازدواج کا مسئلہ ان دونوں ممالک میں مختلف نوعیت رکھتا ہے۔ قدامت پسند ہندوستان، انگلستان کے روشن خیالوں سے لرزتا ہے، لیکن مجھے یقین ہے یہ تضاد عرصہ تک قائم نہ رہے گا۔ اُن لوگوں سے تو کوئی توقع نہیں ہے جو ولایت کا پانی پی کر آئے ہیں، لیکن اپنی ہندستانی گھٹی کو نہیں بھولے ہیں۔ البتہ ان حضرات سے کچھ اور اُمید ہے جو انگلستان سے صرف ایک مفلوک الحال نو عیسائی شکل لائے ہیں۔ اس میں شک نہیں وہ اسی کی روٹی بھی کھاتے ہیں اور ان کی نااہلیت کی یہ پردہ پوش بھی ہے۔ اُن کا مسئلہ ازدواج اشتہار بازی ہے جس پر اُن کی تمام تر شخصیت کا مدار ہے۔ اُن کا اُصول یہ ہے کہ بیوی ایک سرمایۂ مشترک ہے اور اس کو کسی خاص مخصوص فرد کی تنہا ملکیت قرار دے دینا شرافت کے خلاف نہیں تو مردانگی کے خلاف ضرور ہے۔ لیکن وہ اس کو کیا کریں کہ شیر مادر مشرقی ہی تھا اور انھیں مشرقی اور مغربی عقائد کے درمیانی راستہ پر گام فرسا ہونے کی ضرورت پیش آئی۔ پردہ کو وہ ازمنہ جہالت کی ایک وحشیانہ تقلید سمجھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک بیوی کا انتہائی تزئین اور آرائش کے ساتھ مجمع عام میں کسی غیر شخص کے پہلو میں بیٹھنا اور کسی چغد آشیاں گم کردہ کی مانند گوشہ گیر رہنا انتہائی روشن خیالی اور شرافت نسبی ہے۔

---

1 غالب کا پورا شعر اس طرح:

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

میری ہرزہ سرائیوں کا سیماب ابھی صعود ہی کی طرف مائل تھا اور قریب تھا کہ میں یہ ساری داستان اپنے مخاطب کو بہ زورِ مشت سمجھانے پر اُتر تا۔ میرے ایک اور دوست آ گئے جو ابھی ابھی انگلستان سے واپس آئے تھے۔ فلسفی بزرگ نے معاً تخفیف تصدیعہ کیا۔ میں نے اضطراراً اپنے دوست کو خوش آمدید کہا۔ دورانِ تنفّس میں کوئی کمی نہ تھی، لیکن فلسفی دوست کے چلے جانے سے مجھ پر خوداعتباری کا یہ عالم تھا گویا میں نے اپنے دلائل و براہین سے نہیں بلکہ زورِ بازو سے حریف پر غلبہ حاصل کیا تھا اور داد کا طلب گار تھا۔ میرے نوواردد دوست نے رسمی مزاج پرسی کے بعد میرے خشونت اور اجلال جس کا اب بھی کافی اثر تھا، کا سبب پوچھا۔ میں نے فاتحانہ انکسار کے ساتھ پہلے تو اسے ایک نہایت معمولی واقعہ قرار دے کر ٹالنا چاہا، لیکن اُن کے اصرار پر اور اپنے پندار عالمانہ کو مزید تقویت پہنچانے کے لیے، مختصر روداد اس تمام داستان کی سنا دی۔ میرے دوست کا مذہب ''انگریزیت'' ہے وہ ہر چیز کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ اسلام میں اصلاحات کی اشد ضرورت ہے۔ موجودہ تہذیب، اسلام کے بہت سے عقائد اور خصائص کو قابلِ ترمیم سمجھتے ہیں۔ ازاں جملہ پردہ، تعلیمِ نسواں، روزہ اور سود ہے۔ مجھ سے اُن سے اکثر مباحثے ہوئے ہیں اور ہم دونوں نے انتہائی رواداری کے ساتھ ایک دوسرے کے خیالات کو گوش گزار کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم دونوں روز بہ روز اپنے عقائد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے دور ہوتے جاتے ہیں۔

چند لمحوں تک ادھر اُدھر کی گفت و شنید رہی، اُس کے بعد وہی دیرینہ مسائل متنازعہ فیہ معرضِ بحث میں لائے گئے۔

دوست: رشید صاحب، آپ تو شعریت کے اتنے دل دادہ ہیں۔ غور تو فرمائیے صنفِ نازک کے عنصر کو حذف کر دینے سے سوسائٹی کس قدر بے کیف ہو جاتی ہے۔ انگلستان کا سارا نظام سوسائٹی پر ہے یہاں خواتین کی موجودگی ناگزیر ہے۔ ہندستانی سوسائٹی چوں کہ اس عنصر لطیف سے بالکل معرا ہوتی ہے اس لیے آپ خیال کرتے ہوں گے کہ انگلستان میں عورتوں کے بے محابا ملنے جلنے سے اخلاق پامال ہوتا ہوگا۔ حالاں کہ وہاں یہ ایک ایسا عام واقعہ ہے کہ کوئی شخص اُس کے تاریک پہلو کی طرف غور تک نہیں کرتا۔ عورتوں اور مردوں

کے بے تکلف ملنے سے ہم کو اپنی شجاعت اور صلابت کو برسر کار لانے کا موقع ملتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

میں: میں شعریت کا ضرور دل دادہ ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں عورتوں کو مردوں کی سوسائٹی میں دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ عورت ایک پیکر لطیف ہے وہ ہمارے اُن لطیف اور نازک تخیلات کا پیکر محسوس ہے جسے ہم عام نظروں سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ عورت کا حجاب اُس کا حسن ہے اور اُس کا حسن ایک حباب جو چھونے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ عورت مرد کا راز ہے جسے پردۂ خفا ہی میں رکھنا بہتر ہے۔ عورت اور مرد کے عام تعلقات بالکل جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ میرا روئے سخن صرف شریف عورتوں کی طرف ہے پیشہ ور عورتیں معرض بحث میں نہیں ہیں۔ اُن کا تذکرہ بالکل بے سود ہے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے ہر عورت صرف ماں بننے کے لیے بنائی گئی ہے اگر ماں ایک باعظمت اور برگزیدہ ہستی تسلیم کی جاسکتی ہے تو آپ اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ اُس کا ایک پاک باز بیوی ہونا بھی لازمی ہے۔ پاک بازی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ طبی نقطۂ نظر سے باعصمت رہی ہو، بلکہ وہ اخلاقاً پاک دامن رہی ہو۔ آپ کا یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ بد چلنی کے اعتبار سے ہندوستان اور انگلستان دونوں ایک سطح پر ہیں، لیکن یہ فرض بھی کرلیا جائے تو اس سے آپ کو انکار نہیں ہوسکتا کہ انگلستان میں اس کا امکان اور زیادہ ہے۔ مشکل یہ ہے کہ انگلستان اور ہندوستان میں بد چلنیوں کے مختلف مدارج ہیں۔ انگلستان میں ملنے جلنے کی ایسی آزادی ہے کہ وہاں بد چلنی کا مفہوم بالکل محدود ہوگیا ہے۔ بہت سی ایسی باتیں جو ہندوستان میں صریح بد چلنی سمجھی جائے گی وہاں ایک رسمی اور معمولی واقعہ سمجھا جائے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے بد چلنی کی تعریف کردی جائے۔ آپ کے نزدیک تو صرف تعزیراتِ ہند کی بعض دفعات اس پر روشنی ڈال سکتی ہیں.......

دوست: (بات کاٹ کر) اور کسی قدر خفیف اور آزردہ ہوکر، آپ تو مذاق پر اُتر آئے ہیں اس معاملہ میں بالکل ''سیریس'' ہوں۔

میں: میں آپ سے زیادہ ''سیریس'' ہوں، صرف انگریزی نہیں بولتا!

اس فقرے پر میرے دوست نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا، جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی، سگریٹ جلا کر نیم سوختہ دیا سلائی کو ڈ گال دان میں ڈال دیا اور ایک لمبا کش لے کر کہا:

''آپ تو رشید صاحب زیادتی کرتے ہیں، پردہ کا جھگڑا کسی طرح ختم کیجیے پھر دیکھیے آپ کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ آپ ذرا سی بات پر فلسفیت پر اُتر آتے ہیں!''

میں: (آپے سے باہر ہو کر) لعنت ہے فلسفیت پر اور تُف ہے مجھ پر، بھلا ایسی لطیف بحث پر میں ایسی بدمذاقی کا مجرم ہو سکتا ہوں اگر میرے کسی فقرے سے فلسفیت کی بو آتی ہے تو میں اسے واپس لیتا ہوں۔ پردے کے متعلق آپ کی رائے نہایت دلچسپ ہے، میں تو اس کے لیے تیار ہوں۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ آپ حضرات نے جو انگلستان سے واپس آئے ہیں بے پردگی کا معیار کچھ عجیب قسم کا رکھا ہے۔ آپ کی بیویاں تو مجمع عام میں باصرہ نوازی کرتی ہیں یا گھروں پر صرف اُن لوگوں کو لطف صحبت کا موقع دیتی ہیں جو انگریز ہیں یا جنھوں نے انگریزوں کے ملک کا پانی پیا ہے یا پھر خانساماں، بھنگی، جاروب کش، دھوبی اور درزی کو یہ سعادت بخشتی ہیں۔ ہم ٹھیرے ادھوڑی[1] استر جونیئر اسٹاف آپ ہی بتایئے اگر ہم مسز... کے لیے بالکل فدوی ہی بنے رہے اور آپ نے منا کی ماں کو موٹر پر بٹھا لیا تو پھر کیا ہوگا۔ منا کے باپ تو صرف موذّن بن کر رہ جائیں گے! مجھے تو اپنے دوست آغا حیدر حسن صاحب علیگ[2] کا (جنھیں بارگاہِ رین بسیرا سے تعجب ہے

---

1. ادھوڑی۔ موٹا کچا چمڑا، گائے بھینس کا چمڑا جسے پنجابی میں دھوڑی کہتے ہیں۔

2. آغا حیدر حسن: ''موصوف دلّی کے رہنے والے ہیں۔ علی گڑھ میں تعلیم پائی اور حیدرآباد میں رہ بس گئے (ہیں) خوش اطوار، خوش گفتار، خوش لباس، سب سے اُلفت و احترام سے پیش آنے والے، شریفانہ رکھ رکھاؤ نفاست اور نزاکت جیسے اُن پر ختم ہوگئی ہو۔ دلّی کی زبان بالخصوص بیگمات کی۔ دلّی کے کوچے، دلّی والوں کی سیر و تفریح، شادی غمی، طور تہذیب، رسم و رواج، پہننے اوڑھنے، اُٹھنے بیٹھنے سے جتنے یہ واقف ہیں شاید ہی کوئی ہو۔ اُس زمانے میں دلّی کے میر باقر علی داستان گو سے ہم سب نے کئی داستانیں سنی تھیں اور آغا حیدر حسن کی زبان سے دلّی کے شریف گھرانوں کے معمولاتِ زندگی کی روداد بھی خوش گفتاری اور داستان کا موازنہ کیا، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ جتنا لطف میر باقر علی کی داستان گوئی میں آیا اس سے کہیں زیادہ آغا حیدر حسن کی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اب تک کوئی خطاب نہیں ملا) مقولہ بہت پسند آیا ہے کہ سب لوگ اپنی اپنی بیویاں باہر نکالیں، صرف ہمیں البتہ معاف کر دیں!

دوست: آپ تو مذاق پر اُتر آئے، اچھا، خوب یاد آیا۔ اسی سلسلہ میں، میں آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ تعدادِ ازدواج کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا چار چار بیویاں رکھنا انتہائی جہالت (جوش میں آکر) بربریت نہیں ہے؟ انگلستان میں لوگ اس کا خوب خوب مضحکہ اُڑاتے ہیں اور اسلام کو جاہلوں اور وحشیوں کا مذہب قرار دیتے ہیں۔ آپ ہی بتائے کیا یہ محبت کی توہین نہیں ہے؟ محبت تو صرف ایک سے ہو سکتی ہے اس کے بعد پھر کچھ ہی کیوں نہ ہو پائے ثبات کو لغزش نہ ہونی چاہیے۔ میرے ذہن میں تو چار بیویوں کے خیال سے غیظ و غضب کے شرارے اُڑنے لگتے ہیں۔ کیا یہ عورتوں کے ساتھ انتہائی ظلم نہیں ہے؟ اور کیا یہ خود ہماری نفس پرستی اور خود غرضی کا بیّن ثبوت نہیں، انگلستان کی خواتین تو اسے دورِ وحشت کا ایک افسانہ تصور کرتی ہیں اور اس کا تذکرہ سن کر چیخ اُٹھتی ہیں!

میں: خواتین انگلستان کا چیخ مارنا تو کوئی دلیل نہیں ہے۔ اُن کا چیخ مارنا بھی بے محل ہوتا ہے جہاں اس کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تو وہ محض ایک تبسم زیر لبی یا محبوبانہ استغنا کے ساتھ دادِ شہادت دے جاتی ہیں اور جہاں اس کی مطلق حاجت نہیں ہوتی وہاں آسمان و زمین ایک کر دیتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ بیوی پر اکتفا کرتے ہیں وہاں کی تو عورتیں بھی اس مسئلہ میں کافی آزاد منش ہوتی ہیں۔ اسلام کا بس اتنا قصور ہے کہ اس نے فطرتِ انسانی کو ملحوظ رکھ کر ان اُمور کو جائز قرار دے دیا ہے جن کا آپ زبان سے اقرار نہیں کرتے، لیکن اپنے افعال سے اس کا ثبوت دیتے ہیں۔ آپ ہی بتائیے جنگ کی وجہ سے مردوں کی تعداد میں جیسی دہشت ناک کمی ہوگئی ہے اور اسی نسبت سے عورتوں کی تعداد

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) گفتگو میں آتا تھا۔ آغا صاحب کا تعارف کرانا آسان نہیں ہے گو دل بہت چاہتا ہے اس لیے کہ اب شاید نہ دلّی کی تہذیب دیکھنے میں رہے نہ وہاں کی زبان سننے میں اور اُن ہستیوں اور اُن سرگرمیوں کے بارے میں کیا کہیے جن سے دلّی عبارت تھی۔'' (آشفتہ بیانی میری۔ رشید احمد صدیقی)

میں جیسا کچھ اضافہ ہوگیا ہے اُس کا کیا انتظام ہوگا؟ آپ نے اس کا انتظام عیاش اور بدچلن طبقے کے ہاتھ میں دے دیا ہے جس کے نتائج ظاہر ہیں۔ اسلام اس کو ایک فریضۂ مقدس قرار دے کر ذمہ داریوں میں اضافہ کر دیتا ہے۔ آپ خود جانتے ہیں اسلام نے اس کے متعلق کتنے سخت قوانین وضع کیے ہیں اگر کوئی شخص ان کی پابندی نہیں کر سکتا لیکن ان پر عمل کرتا ہے وہ قابلِ مواخذہ ہے۔

دوست: (بات کاٹ کر) پھر صرف چار ہی بیویوں کی قید کیوں لگائی گئی ہے، اس سے زیادہ کیوں نہ کی جائیں؟ دوسرا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اگر مرد چار بیویاں عقد میں لا سکتا ہے تو عورتیں اس آزادی سے کیوں نہ فائدہ اُٹھائیں؟

میں: انگلستان کی عورتیں تو ماشاء اللہ اس آزادی سے متمتع ہو لیتی ہیں۔ آج کل تو لوگ بیوی کے نام سے گھبراتے ہیں۔ ایک یا دو کا سوال تو بعد کو آتا ہے وہ تو کہیے اگلے وقت کے لوگ تھے جن کے دم سے یہ فنِ شریف روشن تھا۔

دوست: میں سمجھتا تھا کہ آپ اس مسئلہ کو اسی طور پر ٹال دیں گے اصل یہ ہے کہ واضعانِ قانون ہمیشہ مرد رہے ہیں اس لیے ہر قانون میں انھوں نے اپنا ہی نفع مضمر رکھا ہے۔

میں: نہیں یہ تو نہیں ہے اسلام کے قوانین، قوانینِ الٰہی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس میں حقوق کی کامل نگہداشت رکھی گئی ہے۔ میں اس کا تو دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ عین منشاالٰہی کے مطابق ہے۔ اس کے سمجھنے والے اہلِ دل ہیں۔ میں ٹھیرا کالج کا درنا کیولر اسٹاف، میں تو آپ کو صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ اگر آپ کی......خدانخواستہ کامیاب نہ ہو تو آپ کس طرح دوسرے طریقہ پر اس سے زیادہ روپیہ کما سکتے ہیں یا اگر آپ ایک مرتبہ اور خدانخواستہ بالکل نااہل ہیں تو اپنی نا قابلیت کو کس طرح بزور بازو محض ایک حیثیت ثانوی دے سکتے ہیں۔ آپ کو کس کس کی آستانہ بوسی کرنی چاہیے اور مقصد حاصل ہو جانے پر کس طرح انھیں آستانوں کو ٹھکرانا چاہیے۔

دوست: (ایک فتح مندانہ تبسم کے ساتھ) کیا آپ کے پاس بس یہی ایک آلۂ مدافعت رہ گیا ہے؟

میں: تو کیا واقعی آپ کو مباحثہ پر اصرار ہے؟

دوست: بشرطیکہ آپ اپنا مذاق نہ کردیں۔

میں: اچھا آپ عریانی خیالات سے برہم تو نہ ہوں گے؟

دوست: بظاہر تو اس کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

میں: عورت اور مرد کے ملنے میں فطرت نے کیا راز مضمر رکھا ہے؟

دوست: توالد و تناسل۔

میں: ایک بچہ کی پیدائش کی مدت طبعی کیا ہے؟

دوست: نو مہینے۔

میں: فرض کیجیے ایک عورت کے سو شوہر ہیں، نو مہینے میں بالعموم کتنے بچوں کی اُمید کی جا سکتی ہے؟

دوست: ایک۔

میں: فرض کیجیے ایک مرد کے سو بیویاں ہیں، نو مہینے میں کتنے بچوں کی توقع کی جا سکتی ہے؟

دوست: (گھبرا کر، لیکن معاً ایک فرمائشی قہقہہ لگا کر) پھر وہی مذاق!

میں: (آنکھیں نکال کر) مذاق کے کیا معنیٰ؟

دوست: تو پھر چار کے بجائے سو بیویاں کیوں نہ ہوں؟

میں: اس کا جواب تو میں پھر دوں گا، فی الحال آپ میری پہلی دلیل کا جواب دیجیے۔

دوست: (شفقت آمیز دل دہی کے ساتھ) اچھا اچھا دوسرے مسئلہ پر بھی تو کچھ اظہار خیال کیجیے۔

میں: اچھا اس سے تو آپ کو انکار نہیں ہوسکتا، کیوں کہ اس پر طبی شہادت موجود ہے کہ استقرار حمل کے تین ماہ بعد سے وضع حمل کے تین ماہ بعد تک زن و شو کو اپنے مخصوص فطری تعلقات سے دست کش رہنا چاہیے۔ ورنہ سنگین اور اندوہ ناک نتائج کے ظہور پذیر ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ میں اس مسئلہ پر خالص طبی نقطۂ نظر سے بحث کر رہا ہوں!

دوست: ہاں اسے میں تسلیم کرتا ہوں۔

میں: فرض کیجیے جس حادثۂ فطری کا میں نے تذکرہ کیا ہے وہ پہلے ہی دن پیش آجاتا ہے۔ پہلے تین ماہ تک تو کوئی بات بحث طلب نہیں رہتی اس کے بعد طبی نقطۂ نظر سے شوہر پر 9/ماہ تک پرہیز لازم آتا ہے۔ چوتھے مہینے کے ابتدا میں وہ دوسری شادی کرتا ہے اور متذکرہ

بالا مراحل پھر پیش آ جاتے ہیں پہلی شادی کے ساتویں ماہ میں وہ تیسری شادی کرتا ہے۔
یہی واقعات پھر رونما ہوتے ہیں، دسویں مہینے کے ابتدا میں وہ چوتھی شادی کرتا ہے اور
اس کا بھی وہی انجام ہوتا ہے۔ اب اس کی پہلی بیوی اور وہی لیل ونہار! آپ ہی بتائیے
ان حالات کے ماتحت چار بیویوں سے زیادہ کی حاجت، باقی رہتی ہے یا نہیں؟

دوست: (اس طور پر ہنستے ہوئے گویا میرے سارے دلائل لغو محض تھے۔ سرپرستانہ انداز سے)
آپ کی منطق اور ظرافت کا میں قائل ہو گیا۔ فلسفہ، ریاضی، طب اور منطق کا آپ نے
خوب ہی معجونِ مرکب تیار کیا ہے۔

میں: مجھے آپ کے خیال سے بالکل اتفاق ہے بشرطیکہ آپ مجھے فلسفہ کا مجرم نہ قرار دیں۔ اس
معجونِ مرکب سے آپ فلسفہ نکال دیجیے ورنہ میں خودکشی کرلوں گا۔

دوست: کیا خوب، آپ نے فلسفیانہ طریق پر تو بحث کی ہے اور فلسفہ کے نام سے چراغ پا
ہوتے ہیں۔

میں: لیکن آپ جانتے بھی ہیں، میں کس مشرب سے منسلک ہوں؟ میں اُن نفوس قدسیہ کا نام
لیوا ہوں جو فلسفہ کے نام پر صفر محض ہیں اور فلسفی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اسلام کے
اصول کا استہزا کرتے ہیں لیکن تنخواہ مسلمان ہونے کی پاتے ہیں۔ آپ ہی انصاف کیجیے
میں کتنا بڑا ایثار کرتا ہوں کہ بقول آپ کے فلسفہ چھانٹتا ہوں اور فلسفی ہونے سے
گریز کرتا ہوں!

دوست: (قطع کلام کرتے ہوئے) رشید صاحب، آپ نے جو کچھ اب تک فرمایا ہے ممکن ہے وہ
صحیح بھی ہو، لیکن مباحثہ کی اسپرٹ کو اگر نظر انداز کر دیجیے تو آپ بھی غالباً اس حقیقت
کے قائل ہو جائیں گے کہ پردہ وغیرہ کے متعلق جتنی مشرقی یا اسلامی پابندیاں ہیں وہ کم
سے کم جہاں تک تعلیم نسواں کا تعلق ہے، ہماری ترقی کے راستہ میں سنگِ گراں ہیں۔ اگر
عورتیں تعلیم یافتہ ہوں تو بہت سی دقتیں جن کے لیے ہم ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں خود بخود
رفع ہو جائیں۔ اگر اور کچھ نہیں تو آپ ایسے لوگوں کے خیالات کی کافی اصلاح ہو جائے
معاف فرمائیے گا۔

میں: یہ آپ نے کیسے فرض کرلیا کہ میں تعلیم نسواں کے خلاف ہوں۔ یہ البتہ ہے کہ میں تعلیم یافتہ بیوی سے ذرا ڈرتا ہوں۔ میں تو لکھی پڑھی بیوی چاہتا ہوں، لیکن اس شرط کو لازمی نہیں قرار دیتا اگر وہ لکھی پڑھی ہو تو بہتر ہے ورنہ میں تو جاہل بیوی کا زیادہ قائل ہوں۔ خدا نہ کرے مجھے کسی ایسی بیوی سے سابقہ پڑے جو میز کرسی پر چائے پیتی ہو، اُس کے بعد اپنی ڈاک کا مطالعہ کرے۔ صبح و شام ہواخوری کی عادی ہو، شوہر سے ہاتھ ملائے اور اس کے دوستوں سے واقف ہو اور اُن کی پالیٹکس میں حصہ لے۔ گرمیوں میں شوہر کو چھوڑ کر پہاڑوں کی راہ لے اور شوہر کی آمدنی کی جانچ پڑتال کرے، میں نہیں چاہتا میری بیوی ملٹن اور شیکسپیئر کے متعلق میرے مبلغ علم کا جائزہ لے اور فنونِ لطیفہ میں دخل رکھتی ہو۔ میں تو نری ہندستانی بیوی چاہتا ہوں جو بقول شخصے باورچی خانہ کا ٹمٹماتا ہوا دیا ہو نہ کہ چاندنی چوک دہلی کا برقی ہنڈا مجھے ملٹن، شیکسپیئر، خانساماں، گلیڈ اسٹون، مہاتما گاندھی اور مولانا محمد علی وغیرہ کے متعلق اگر معلومات فراہم کرنی ہوں گی تو سر کھپانے کے لیے لٹن لائبریری[1] اور یونین کلب موجود ہیں۔ فرقہ بندی، بدمذاقی اور بدگوئی کی ضرورت محسوس ہوگی تو کوئی کلب قائم کرلوں گا۔ تمام دن ان مزخرفات میں گزر سکتا ہے۔ اب گھر میں بھی یہی تذکرے بیوی نے چھیڑے تو اُس کے بعد صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے، میں کسی بدمذاق فلسفی کو کاٹ کھاؤں۔ بیوی میکے کا راستہ لے اور میں پاگل خانہ کا!

....

بیوی کا کام صرف یہ ہے کہ میں پریشان اور خستہ حال مکان میں داخل ہوؤں اور وہ مجھ کو پاکر باغ باغ ہو جائے، وہ صرف یہ محسوس کرے کہ مجھے تسلی اور عافیت کی ضرورت ہے۔ وہ تمام کام چھوڑ کر ہماری جنبش ابرو کا مطالعہ شروع کردے۔ اسے یہ کبھی نہیں پوچھنا چاہیے کہ میرے تفکر اور پریشانی کا باعث کیا ہے اگر میں اس سے اُس کا تذکرہ کروں تو وہ مجھے دفاعی ترکیبوں اور سازشوں کی صلاح نہ دے۔ وہ صرف یہ کہے "پریشان مت ہو، منہ ہاتھ دھوؤ کچھ ناشتہ کرلو، تھوڑی دیر آرام کرو، میں خدا سے دعا کروں گی وہ تمھاری مشکلات کو آسان کردے گا۔ زیادہ فکر و محنت نہ کیا کرو،

1 مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا قدیم نام۔

تمھاری بے کلی دیکھ کر میں پریشان ہوتی ہوں۔ تمھارے لیے پان بنادوں؟'' وہ میرے کپڑوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہے۔ ''تمہاری اچکن اُتاروں؟'' وہ میرے موزے اور جوتے اُتار دے اور سلیپر لا کر سامنے رکھ دے۔ وہ ان باتوں کے متعلق جن سے مجھے دلچسپی ہے، دل خوش کن واقعات سنائے اور مجھے رفتہ رفتہ آسائش پذیر ہوتا پائے تو مسرور ہو جائے۔

آپ ان باتوں کو سن کر دل ہی دل میں میرا مضحکہ اُڑاتے ہوں گے۔ آپ خیال کرتے ہوں گے کہ میں نے یہ صفات کسی بیوی کے نہیں بلکہ خادمہ کے سنائے ہیں۔ لیکن آپ یقین مانیں، ہر شخص اپنی بیوی میں انھیں صفات کا متمنی ہوتا ہے، یہ اور بات ہے کہ وہ فیشن اور گمراہی کے سبب سے اس کا اقرار نہ کرے۔ آپ بیوی کو معشوق کی حیثیت دینا چاہتے ہیں، یہ دو دن کی چاندنی ہے عشق و عاشقی سے گھر نہیں بستا۔ یہ کاغذی ناؤ ہے زندگی کے پُر آشوب طوفان میں اس کا پتہ بھی نہ لگے گا۔ معشوق ممکن ہے کچھ دنوں تک معشوق بنا رہے، لیکن یقین مانئے آپ عرصہ تک عاشقی کا دم نہیں بھر سکتے۔ یہ سنگین اور سنگلاخ واقعات اور حقائق ہیں تخیل کی زیاں کاریوں کو ان کے سامنے نہ لایئے۔

دوست: ''شعریت'' اور ''ازدواج'' پر تو آپ نے اظہار خیالات کیا، لیکن آخری بند کو تو آپ نے ایسا رقت انگیز کر دیا کہ شاید اب ''فلسفۂ ازدواج'' پر آپ کا گریہ گلو گیر ہونے لگے۔ کہیں یہ تجربات عالیہ میں سے تو نہیں ہے؟

میں: جی ہاں مقام تو یہ رونے ہی کا تھا، لیکن یہ کوئی ضروری بات نہیں ہے کہ اس کا شمار ''تجرباتِ عالیہ'' میں ہو۔ تجرباتِ عالیہ تو بالعموم چالیس سال کی عمر سے شروع ہوتے ہیں جب جسم کا سارا زور سمٹ کر زبان پر آجاتا ہے۔ گو آج کل بہت سے نوجوان ایسے بھی ملیں گے جو اس لحاظ سے بڑے بڑے سن رسیدوں کو بھی نیچا دکھا سکتے ہیں۔

دوست: محبت ایک غیر فانی چیز ہے، عمر کی قید بے محل ہے۔ بہت سن رسیدہ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں میاں کی محبت قابلِ رشک ہوتی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

میں: اس حقیقت سے مجھے انکار نہیں ہے، لیکن مستثنیات سے اصول نہیں وضع کیے جاسکتے۔ فلسفۂ ازدواج کے عمر کی قید ضروری ہے اور اگر آپ اس کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں

تو کم سے کم یہ تو ضرور تسلیم کر لیں گے کہ پہلی شادی کے بعد جب کبھی دوسری یا تیسری شادی کی نوبت آتی ہے اُس وقت اس کی نوعیت بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ میں نے بہت سے بزرگوں کو دیکھا ہے جن کی شادی اُن کی فطرتِ ثانیہ ہوتی ہے۔ اگر پہلی شادی سے کچھ بارآور نتائج برآمد ہوتے ہیں تو بالعموم دوسری اور تیسری شادی اس نیت سے کی جاتی ہے کہ گذشتہ حماقت زائیوں کے لیے ایک سند جواز حاصل کر لی جائے۔

پہلی شادی بہ منزلۂ قرض کے دوسری سود، تیسری سود در سود، چوتھی دیوالہ، پانچویں سول جیل اور ان سے سبک دوشی یعنی موت۔

فلسفۂ ازدواج اکثر اس وقت سے بھی شروع ہو جاتا ہے جب شادی کی ہر سال گرہ عقیقہ پر ختم ہونے لگتی ہو۔ اقتصادیات ایک عجیب مسئلہ ہے کہ مفلس طبقہ اکثر و بیش تر افزائش نسل میں زیادہ منہمک رہتا ہے، لیکن فطرت اس سے بھی زیادہ ستم ظریف ہوتی ہے۔ مشہور تو یہ ہے کہ روزی خدا کے ہاتھ میں ہے، لیکن یہ اب تک نہ معلوم ہو سکا کہ اس کی تقسیم کا کیا اصول ہے۔ اکثر کھانے والے ایک خاندان میں بھیجے جاتے ہیں اور روزی دوسرے خاندان میں بھیجی جاتی ہے۔ فلسفۂ ازدواج کا اگر پتا لگانا مقصود ہو تو سب سے پہلے یہ دریافت کرنا چاہیے کہ شوہر اور بیوی میں سے کون اس آفت سے گلو خلاصی حاصل کرنے کے درپے ہے۔ بعض پھلوں میں ایک عجیب خاصیت دیکھی گئی ہے، یعنی وہ پک کر نئے سرے سے خام ہونے لگتے ہیں۔ یہی حالت ازدواج کی بھی ہے۔ بعض اوقات میاں بیوی تمام مراحل طے کرنے کے بعد، پھر شعر و شاعری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اعلیٰ طبقہ میں اس کی ابتدا تعلیم یافتہ بیوی سے ہوتی ہے اور طبقہ ادنیٰ میں یہ سعادت شوہر کو نصیب ہوتی ہے۔ اعلیٰ طبقہ میں یہ تعلقات اکثر غیر سرکاری ہوتے ہیں جس کے دوسرے معنی ہیں ''داخلہ پرائیویٹ'' ادنیٰ طبقہ میں اس کا پتا فریق ثانی کو چلتا ہے تو وہ مجرم کو بزورِ بازو یا بزورِ زبان راہِ راست پر لاتی ہے۔ اعلیٰ طبقہ میں اوّل تو اس کی طرف سے لاتجسسوا پر عمل کیا جاتا ہے اور اگر یہ اصول کامیاب نہیں ہوتا تو پھر مجرم کو پہاڑ وغیرہ پر اس خیال سے بھیج دیا جاتا ہے کہ شاید وہاں کی آب و ہوا راس آ جائے.......

گفت وشنید کا سلسلہ منقطع ہی نہیں ہوتا تھا، لیکن اب شام ہو چلی تھی اور میں یہ وقت صرف ٹینس کے لیے مخصوص کر چکا ہوں اور مجھے سخت کوفت ہوتی ہے، اگر اس وقت مجھے کسی دوسرے کام کے لیے طلب کیا جائے یا ٹینس سے باز رکھا جائے۔ بطیب خاطر میں دنیا کا کوئی اور کام اس وقت کرنا پسند نہیں کرتا۔ بعض اوقات ایسے مواقع پیش آجاتے ہیں کہ ٹینس کو خیرباد کہنا پڑتا ہے، لیکن وہ وقت ہوتا ہے جب مجھے 'برخاست' ہوجانے کا اندیشہ ہوتا ہے اور ایسی حالت میں بعض لوگ تو بڑی بڑی قربانیاں کرنے پر تیار ہوجاتے ہیں۔ میں صرف ٹینس کا فاتحہ پڑھ لیتا ہوں۔ میرے دوست میری اس عادت سے واقف تھے، انھوں نے بقیہ آئندہ کے سلسلہ میں مجھ سے رخصت چاہی اور میں نے تھوڑے سے تصنع کے ساتھ انھیں رخصت کیا اور ریکیٹ لے کر ٹینس کورٹ کی طرف چل دیا اور ازدواج کی تمام حماقت زائیوں کو فراموش کر کے صرف یہ دعا مانگتا رہا کہ خدا کرے میں جیسے ہی پہنچوں، میرے پیش روسٹ ختم کر دیں، لیکن میری بدحواسی کی کوئی انتہا نہ تھی جب وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ آج کسی ٹرسٹی صاحب کے جاں بحق ہونے کے سلسلہ میں کھیل بند ہے!

اِنّا للّٰہ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونْ

(مطبوعہ: علی گڑھ میگزین، علی گڑھ۔ نومبر 1923، 'الناظر'، لکھنؤ۔ جنوری 1924)

نوٹ: اس مضمون کی اشاعت پر بعض پروفیسروں کی طرف سے جن کی بیویاں انگریز یا جرمن تھیں سخت احتجاج کے پیشِ نظر یہ مضمون شمارہ سے نکال دیا گیا اور رشید صاحب کو معذرت کرنا پڑی۔ (مرتبین)

●●●

خلطِ مبحث

مجھے اکثر کچھ ایسا محسوس ہوا ہے کہ بعض جانوروں کی شکل بعض آدمیوں کی شکل سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے۔ میرا یہ عقیدہ اُس وقت سے ہے جب میں ''فلسفۂ میمونی'' سے قطعاً نا آشنا تھا۔ اس معذرت کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ کوئی صاحب اس کلیہ کی تطبیق میں غیر معمولی ذہانت یا ستم ظریفی کو دخل نہ دیں گے۔

یہ تمہید (اگر اس کو تمہید کہہ سکتے ہیں) مختصر بھی ہے اور نامکمل بھی، اور میری عادت ہے جب تک کسی مضمون پر ابتدائی دو چار اوراق سیاہ نہ ہو لیں طبیعت میں روانی نہیں پیدا ہوتی۔ بدقسمتی سے میں سوچنے کا عادی نہیں ہوں، اور اگر کبھی ایسا اتفاق ہوا ہے تو مفید نتائج نہیں برآمد ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ موضوع زیر بحث پر کافی غور و خوض کے بعد قلم اُٹھایا ہے، لیکن بعد میں معلوم ہوا ہے کہ جو کچھ سوچا تھا وہ تو ذہن میں رہ گیا اور جو ضبط تحریر میں آیا وہ کچھ اور ہے۔ اسے میں یادش بخیر ''مرشد'' (ذاکر حسین خاں صاحب بی۔اے علیگ کا) فیضان سمجھتا ہوں۔ مرشد کو ایک بار ڈرائنگ کا شوق ہوا، فرماتے تھے ''میں نے نہایت کوشش کے ساتھ گھوڑے کی تصویر بنانی شروع کی، لیکن جب بنا چکا تو معلوم ہوا کہ گھوڑے کے بجائے اچھا خاصا گدھا موجود ہے۔'' مرشد دل برداشتہ ہو گئے۔ میں نے کہا ''آپ نے غلطی کی، آپ کو گدھے سے شروع کرنا چاہیے تھا'' کہنے لگے، ''اب میں ہرگز اس واہیات میں نہ پڑوں گا۔'' لیکن میرے

مزید اصرار پر چیں بہ جبیں ہوکر فرمایا "اور کیوں جناب گدھا بنانے میں کسی آدمی کی شکل بن گئی تو میں کیا کروں گا خواہ مخواہ کھنچا کھنچا پھروں گا۔ یہ آسیبی فن آپ ہی کو مبارک !"

اس طریقۂ کار کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ تمہید بے معنی یا غیر متعلق رہ جاتی ہے، لیکن مضمون چل نکلتا ہے۔ اس لیے میں اسے یہیں ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ بہت ممکن ہے مضمون مکمل ہو جانے پر اسے حذف کر دوں۔ پھر یہ بھی توقع ہے، شاید کھینچ تان کر کوئی مفہوم نکال لیا جائے۔ آخر تصوف کے زور سے بعض ذی فہم، بے معنی یا پیچیدہ اشعار کے بھی تو معنی نکال ہی لیتے ہیں۔

میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ آپ اکثر ایسے لوگوں کو بھی پائیں گے جن کو دیکھنے کے ساتھ ذہن کسی خاص چیز یا جانور کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ ہم کو اکثر ایسی خوشبو سونگھنے کا اتفاق ہوتا ہے جس سے وہ باتیں یا واقعات تازہ ہو جاتے ہیں جو مدت ہوئی کبھی اس کے ساتھ نسبت رکھتی تھیں۔ اس کے ثبوت میں، میں خود اپنا تجربہ پیش کرنا چاہتا ہوں اور وہ بھی اردو کے بے پناہ مضمون نویس یا بجٹ نگار کے انداز سے جن سے اردو داں حضرات غالباً واقف ہوں گے۔ وھو ھذا

1۔ "یوکلپٹس آئل" سے انفلوانزا کی یاد تازہ ہوتی ہے۔
2۔ نیپتھلین کی گولیوں سے پلیگ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ یا پھر کافور سے جنازہ کی
3۔ ایڈوفام سے اسپتال کی یاد تازہ ہوتی ہے۔
4۔ "والدین" سے علی گڑھ کالج پر ترک موالات کی یورش کی۔
5۔ شلجم کے اچار سے نمائش علی گڑھ کی
6۔ اپنے موجودہ مکان مسکونہ سے کسی کہن سال مفلس عیال دار عیسائی کے ریلوے کوارٹر کی۔

....

میرے مکان کا ایک فلسفۂ تاریخ ہے۔ یورپ میں تاریخ کا کچھ ہی مفہوم ہو، ایک قدامت پرست ہندستانی کی حیثیت سے تو میں تاریخ کے معنی یہ سمجھتا ہوں کہ کب اور کتنے لوگ جان لینے یا دینے پر آمادہ ہوئے۔ اس کلیہ کے تحت میں مہابھارت، تیسرے درجہ کے مسافر، انجمن بین الاقوام، میونسپلٹی کے الیکشن، میرا مکان (جو میرے ورود سے قبل یونانی شفاخانہ یا ہندستانی دواخانہ تھا) آجاتے ہیں۔ کہتے ہیں یونانی شفاخانہ اور اس کے متعلقات اور مستحقین سب کا وصال ساتھ ہی ہوا۔

میں نہیں سمجھ سکتا، اس پر اظہار تاسف کروں یا مسرّت، ممکن ہے دونوں خطرہ سے خالی نہ ہوں۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ کسی پادشاہ کی وفات پر اس کا لڑکا وارث تاج و تخت ہوا۔ نئے حکمراں سے اس کی تخت نشینی پر کوئی اظہار مسرّت کرتا تو اس قصور پر سزا پاتا کہ اس نے والد مغفور کی وفات پر اظہار تعزیت کیوں نہ کیا، اور اظہار تعزیت کرتا تو یوں قابلِ تعزیر قرار دیا جاتا کہ موجودہ حکمراں کی تاج پوشی پر اظہار تہنیت کیوں نہ کیا۔ بالآخر مسخرہ کی باری آئی۔ پادشاہ نے دیکھا کہ یہ اپنا منہ انتہائی پہنائیوں اور گہرائیوں تک کھولے ہوئے خاموش کھڑے ہیں۔ خطاب ہوا ''کیا ماجرا ہے؟''

یہاں آواز کے بجائے منہ سے مکھیوں کی درآمد برآمد جاری تھی۔ سار اور بار متحیر تھا، مزید استفسار پر غائیں غائیں کرکے رہ گئے۔ بالآخر سب نے مل کر سخت اصرار کیا تو فرمایا۔ ''جہاں پناہ، یہ دونوں واقعات کچھ ایسے مسلسل اور بے لاگ پیش آئے کہ مجھے ''منہ بائی'' (ایک مرض جس میں منہ ایک دفعہ کھل کر پھر بند نہیں ہوتا) ہوگیا۔ اب حضور ہی سمجھ لیں مجھ پر کیا عالم گزرا۔''

....

بہر حال اب یہ عالم ہے کہ ہم ہیں اور یونانی شفاخانہ۔ مجھے وہ زمانہ بھی یاد ہے، جب (ایک کمرہ میں حکیم صاحب بیٹھے رہتے تھے بڑے کمرہ میں مریض لڑکے اور تندرست بیرے) کسی کے ہاتھ میں پرزہ ہے اور کسی کی بغل میں گلاس یا پیالے۔ کوئی پڑیا سنبھال رہا ہے، کسی کو کٹہرہ کے اندر سے ''حافظ جی'' سفوف ملیّن پھنکار رہے ہیں اور اوپر سے غیر مالیدہ، المونیم کے گلاس میں کچھ اسی قسم کا جوشاندہ پلا رہے ہیں۔ حافظ جی کے ہاں ہر قسم کے حرکاتِ ارادی یا غیر ارادی کا ایک علاحدہ محکمہ تھا اور اُس میں سے ہر ایک کو خود مختار نو آبادیوں کا اقتدار حاصل تھا۔ ان کے ہاں کوئی محکمۂ منتقلہ نہ تھا، اور یہی وجہ ہے کہ وہ دوعملی کے جھگڑوں سے پاک رہے۔ حافظ جی کے پاؤں چلتے رہتے تو زبان خاموش رہتی، سنتے تو دیکھنے سے اغماض کرتے تھے۔ غرض ایک وقت میں صرف ایک کام کرتے تھے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ واقعتاً وہ صرف ایک کام کرتے تھے، بلکہ جس طرح کسی ایک فعل کے سرزد ہونے میں سارا نظام اعصابی متحرک ہوجاتا ہے اور فی الحقیقت ایک

فعل مختلف دوسرے افعال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسی طور پر دیکھنے والے صرف یہ دیکھتے کہ حافظ جی مسلسل سفوف ملین اور جوشاندہ کا دور کرار ہے ہیں، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ فی الحقیقت فعل کہیں پہلے سرزد ہو چکا تھا صرف وقوع فعل ہمارے مشاہدہ میں آسکا۔ جس طور پر پرند کے شکار ہو جانے کے بعد بندوق کی آواز کان میں آتی ہے، ٹھیک اسی طور پر مریض دوا پینے سے پہلے ہی محسوس کر لیتا کہ وہ حافظ جی اور دوا دونوں سے عہدہ برآ ہو گیا۔ معمولی نگاہوں نے کبھی یہ نہ محسوس کیا کہ حافظ جی نے کب سفوف ملین کی طرف رُخ کیا۔ وہاں سے جوشاندہ کی دیگ پر کیسے پہنچے اور ان دونوں کو مریض کے گلے سے کب اُتار کر وہ چلے گئے۔ بعضوں نے اُن کو صرف دوا پلاتے دیکھا، بعضوں نے مریض پر جھپٹتے دیکھا، اور زیادہ ایسے ہیں جنھوں نے حافظ جی کا چہرہ بشرہ دیکھ کر یہ محسوس کیا کہ یہ خود کوئی بدمزہ دوا استعمال کر چکے ہیں اور کلی کرنے کا پانی باوجود تلاش کے نہیں ملا ہے!

....

یہ مکان فن عمارت وطب دونوں کا بہترین نمونہ ہے۔ بظاہر یہ دونوں باتیں بے جوڑ معلوم ہوتی ہیں، لیکن غور کرنے سے کافی ''انشراحِ صدر'' ہوتا ہے۔ انجینئر مکان ایسے بناتا ہے جس میں دھوپ اور ہوا کی بہتات ہو، حفظانِ صحت کے لحاظ سے مکان کی چھت ایسی بنائی جاتی ہے کہ دھوپ اور جراثیم کو تباہ کر دینے کے لیے آسانی سے ہٹائی جا سکے۔ اطبا کشتہ پھونکتے ہیں، معجون تیار کر کے اسے کچھ عرصہ تک مدفون رکھتے ہیں، اور عرق کھینچنے کے لیے نل بھبکے کا استعمال کرتے ہیں۔ ان حالات کے ماتحت اس مکان کا جائزہ لیا جائے تو وجد میں آ کر خودکشی کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مکان کی چھت لوہے کی چادر کی ہے جس کے اوپر محض ''خاک پاشیدہ'' ہے۔ کوئی روشن دان نہیں ہے۔ کواڑ بھی آہنی چادروں کے ہیں، رُخ بھی پچھم کا ہے۔ برآمدہ نہایت وسیع، کھپریل انگریزی۔ شام کے وقت کمرہ کی آخری اندرونی دیوار پر بھی چار چار فٹ اونچی دھوپ رہتی ہے، یورپ میں عرصہ سے گیس اور بجلی کے مانند دھوپ کے محفوظ رکھنے کا مسئلہ زیر غور ہے۔ یہاں بھی اس پر طبع آزمائی ہو چکی ہے۔ یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ سورج کا دیوتا رتھ پر سوار ہو کر مشرق سے نکلتا ہے اور بقول ملٹن شام کے وقت اس کی گاڑی کا دُھرا بحر مغرب میں ٹھنڈا ہوتا ہے۔ یہاں

یونانی اطبا نے کوشش کی تھی کہ جب وہ تھک کر، مغرب کے وقت یونانی شفاخانہ سے گزرے تو فوراً کمرہ کے دروازے (ٹاپے!) بند کر لیے جائیں۔

اگر وہ نہ نکل سکا تو پھر جس طور پر چاہیں گے دھوپ پیدا کرلیا کریں گے اور ساری دنیا میں کہرام مچادیں گے اور کشتہ پھونکنے، معجون دفن کرنے یا عرق کھینچنے میں کسی قسم کی زحمت نہ ہوگی۔ گرمی اور حبس کافی میسر آجایا کرے گا۔ معلوم نہیں عہداولین کی یہ ترکیب کبھی کارگر ہوئی یا نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ عرصہ سے یہاں سخت گرمی پڑ رہی ہے اور اس کی مختلف دلیلیں بھی کی جارہی ہیں۔ کوئی سمجھتا ہے یہاں گندھک کی کان عنقریب مشتعل ہونے والی ہے۔ کوئی کہتا ہے سورج میں مشتعل گیس کا کوئی نیا آتش فشاں بھڑک اُٹھا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس کے متعلق اور شاید اسی سے متاثر ہوکر، میری تفتیش یہ ہے کہ خسرو خاور واقعی کسی دن یونانی شفاخانہ میں مقید ہوگئے تھے اور انھوں نے ضرورتاً یا انتقاماً بعض ایسے مقویات اور کشتہ جات کھالیے جن کا بدرقہ اُن کو نہ مل سکا اور نزلۂ حار اور تبخیر کی شکایت پیدا ہوگئی۔ بہر حال میری رائے یہ ہے کہ جب ممدوح کی آمد ورفت اس درجہ مسلسل اور مرتب ہے تو پھر بجائے اس کے کہ دھوپ کی فراوانی سے ہم گھبرائیں، کیوں نہ علاج شمسی کا ایک محکمہ کھول دیں!

....

غور تو فرمایئے ایسے مکان اور ایسے موسم میں ماہِ صیام کی پذیرائی کس طور کی جاسکتی ہے۔ داخل شفاخانہ ہونے سے پہلے میں گل منزل (کچی بارک) میں ہر موسم کے ساتھ کروٹیں لے چکا ہوں۔ کچی بارک میں برسات کا ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب ''بارانِ رحمت'' سے کوئی جائے پناہ نہ مل سکی تو میں نے ناچار بستر تہہ کرکے میز پر رکھا، اور ''سربقعود'' ہوکر میز کے تلے جابیٹھا اور وہ بھی اس طور پر کہ دیکھنے والے یہ سمجھے کہ میز کو سر پر اُٹھا کر جلاوطنی اختیار کرنے کا ارادہ ہے۔ اسے پہلے ایک مصیبت سمجھتا تھا، لیکن اس مکان میں آکر اپنی پچھلی زندگی اور اس کے تجربات کو تائیدِ غیبی سمجھنے لگا ہوں۔ گرمی کی شدت میں جب لوہے کی چھت تاؤ پر آتی ہے اس وقت اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا کہ زمین پر خوب پانی بہایا جائے۔ چارپائی پر بھیگی ہوئی چادر ڈال دی جائے، اور کلی کرتے کرتے چارپائی کے تلے پہنچ کر دراز ہوجائیں۔ ہم روزوں کی

اور بیوی بچے اپنی اپنی خیر منائیں اور کوئی ستم ظریف اس گروپ کا "اسنیپ شاٹ" لے کر اس کے نیچے لکھ دے۔

"ہندوستان میں رمضان شریف"

مشکل یہ ہے کہ رمضان شریف میں دو چار باتیں کچھ عجیب قسم کی پیش آتی ہیں۔ روزہ نہ ہو تو دوسروں پر بے جا طور پر بھی غصہ کر لیجیے لوگ کچھ نہ بولیں گے۔ روزہ رکھ کر اور بجا طور پر بھی، اپنے اوپر غصہ کیجیے تو لوگ گوارا نہیں کرتے۔ یہ ایک ایسی ستم ظریفی ہے جس کی مثال تعزیرات ہند میں بھی نہیں ملتی۔ بالغ اور عاقل ہونے کا خمیازہ یوں تو اکثر اُٹھانا پڑا ہے، لیکن دنیا میں ایسے خوش قسمت لوگ بھی ہیں جو اس سے ہر قسم کا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اس کی ادنیٰ مثال عید کا چاند دیکھنا ہے۔ میں کہتا ہوں عقل اور بلوغت کس کام کی اگر یہ صفات وقت پر برسر کار نہ لائی جاسکیں۔ 29 دن کے روزوں کے بعد ریاستوں میں کم سے کم دو بالغ اور عاقل مسلمان ایسے مل جاتے ہیں جو کسی نہ کسی طور پر چاند دیکھ لیتے ہیں، اور عید منا لے جاتے ہیں، لیکن ان ریاستوں سے کوئی پوچھے اگر تم ترکِ موالات نہیں کر سکتے تو کیا یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ تم میں سے کوئی مردِ خدا (یا بقول حاجی بلغ العلا کیا نام کہ عاقل اور بالغ مسلمان یہ کہہ دے کہ رمضان کوئی نیا چاند اپنے ساتھ نہیں لاتے بلکہ یہ شعبان ہی کے چاند کو کھینچ تان کر لے جاتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہو تو اس میں کیا قباحت آتی ہے اگر متذکرہ صفات کے دو سو بزرگ جائز طور پر قسم کھائیں کہ اب تک انھوں نے رمضان کا چاند ہی نہیں دیکھا!

....

رمضان میں بعض لوگوں کو مخصوص سہولتیں حاصل ہوتی ہیں اور بغیر کسی غیر معمولی کوشش کے دنیا پر ظاہر کیا جاسکتا ہے کہ اسلام روشن خیال طبقہ میں بھی مقبول ہو رہا ہے۔ مثلاً وہ لوگ جو پان، تمباکو، سگریٹ، چائے غرض کہ ہر قسم کی منشیات و مقویات میں ایک پیشہ ور یا کامل الفن کی حیثیت سے دلچسپی نہیں لیتے اُن کو دیکھ کر پتہ ہی نہیں لگ سکتا کہ یہ روزہ کی ذمہ داریوں کے کس حد تک حامل ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں اس امر کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ خوش قسمتی سے جن لوگوں کو کام کرنا پڑتا ہے اور ذمہ داریاں بہت ہیں (بالفاظ دیگر بڑی بڑی تنخواہ پانے والے روزہ کی

پابندیوں سے معذور سمجھے جاسکتے ہیں۔ زیادہ کام اکثر حارج نہیں ہوتا، لیکن زیادہ ذمہ داریاں اس کی بھی متحمل نہیں ہوسکتیں اور یہی سبب ہے کہ روزہ ہی نہیں بلکہ دوسری شرعی پابندیاں بھی عوام اور تنگ حال افراد کے لیے زیادہ ضروری ہیں۔ خواص اور آسودۂ حال ان سے مستثنیٰ یا معذور ہیں۔

....

اتنا لکھنے کے بعد میں نے سوچا آخر طبیعت میں حدت اور وحشت کیوں پیدا ہونے لگی ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو عنقریب کچھ ایسے الفاظ نکلنے والے ہیں جن کے غلط سمجھنے یا بالکل نہ سمجھنے کی سخت کوشش کی جائے گی۔ میں سنبھلا، کچھ دیر تک ادھر اُدھر دیکھا کیا، آواز دی، معلوم ہوا کہ جس طور پر نصوح کو خواب آور دوا دے کر ڈاکٹر چلا گیا تھا اور بیوی بچے علاحدہ ہٹ گئے تھے وہی حشر میرا ہوا ہے۔ زمین خشک ہوگئی تھی اور سخت تپش محسوس ہورہی تھی، میں نے خیال کیا اگر کوئی شعر اس وقت یاد آجاتا تو گھر والوں کو مخاطب کرنے کے لیے کچھ یوں ہی پڑھ سادیتا۔ لیکن بدقسمتی سے جو شعر یاد آیا، کباب سیخ ہیں [1]......الخ'' اس کے پڑھنے کے بجائے سر پھوڑ لینے کی طرف طبیعت زیادہ مائل نظر آئی اس لیے محض لاحول ولاقوۃ پر اکتفا کیا۔

رفتہ رفتہ چار پائی کے نیچے سے برآمد ہوا، کلیاں کیں، چادر، چار پائی اور فرش پر پانی بہایا تھوڑا سا سر سے بھی گزار لیا، اور ایک دفعہ پھر چار پائی کے تلے دراز ہوگیا۔ اب طبیعت کسی قدر موزوں ہونے لگی تھی، روزے بھی قابل برداشت معلوم ہورہے تھے۔ خیال آیا شیطان نے کن وسوسوں میں ڈال دیا تھا، تھوڑی دیر اور نہ سنبھلتا تو خدا جانے کیا پیش آجاتا۔ سوچنے لگا کہ انسان کو بے صبر نہ ہونا چاہیے۔ یہ عالم رنگ و بو ہے، کسی کو دوام نہیں، کیا تعجب ایک زمانہ ایسا آجائے جب ازمنۂ جہالت کی کوئی سنت باقی نہ رہے۔ مذہب کے بجائے صرف تہذیب رہ جائے، مناکحت کے بجائے صرف جانبین کی روشن خیالی ہو، توالد و تناسل کا مسئلہ صرف فنونِ لطیفہ سے طے ہوسکے، قابلیت کے بجائے قسمت کی پرستش ہونے لگے۔ یونیورسٹی کی ڈگری کی بجائے جنم کنڈلی کا مطالبہ....

---

1 کباب سیخ ہیں ہم، کروٹیں ہرسُو بدلتے ہیں　　جو جل اُٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

(ناسخ)

خیالات کا سلسلہ یہیں تک پہنچا تھا کہ میں ایک دوسرے عالم میں پہنچ گیا۔ معلوم ہوا کہ سوراج قائم ہے، بڑے بڑے مقرر جمع ہیں۔ ایک بڑے زبردست چرخہ پر جلسہ کا پروگرام لگا ہوا پہیے کی گردش کے ساتھ ساتھ پروگرام کی مختلف مدیں نکلتی آتی ہیں اور اسی اعتبار سے ہر مقرر تقریر کے لیے آموجود ہوتا ہے۔ کارروائی کا زیادہ حصہ ختم ہو چکا تھا، چرخہ کو گردش دی گئی۔ یہاں تک کہ آخری کارروائی کی نوبت آئی۔ یہ مسلمانوں کا رزولیشن تھا۔ نحیف الجثہ صدر نے یہ کہہ کر کرسی صدارت پر ایک مسلمان بزرگ کو بٹھا دیا کہ یہ خالص مذہبی معاملہ ہے جس کو مسلمان بھائی خود طے کر لیں ان کا مقرر اُٹھ کھڑا ہوا تو سب لوگ دم بخود ہو گئے، اور تقریر کا آغاز یوں ہوا۔

''حضرات! میں جو تحریک پیش کرنے والا ہوں وہ کسی طویل مذاکرہ کی محتاج نہیں ہے۔ قومی نقطۂ نگاہ سے جو باتیں ضروری تصور کی جاسکتی تھیں وہ سب آپ نے منظور کر لیں۔ میں مذہب کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں، اور اس کے لیے ضرورت ہے کہ آپ توجہ اور ہمت سے کام لیں۔ مذہب میں چند اصلاحات کی سخت ضرورت ہے، اور اس مسئلہ کی اہمیت صرف اس حقیقت سے محسوس ہو سکتی ہے کہ ہم نے حالت محکومی میں بھی جب تک ممکن ہو سکا اس میں اصلاح کی کوشش کی اور ایک حد تک کامیاب بھی رہے۔ آپ جانتے ہیں مسئلہ جواز سود میں ہم نے ایک نمایاں حد تک ترقی کی ہے، ہمارے بعض غیر ملکی مسلمان بھائیوں نے تعدادِ ازدواج کو بھی جرم قرار دیا ہے۔ کیوں کہ آپ جانتے ہیں کہ پردہ اُٹھ جانے کے بعد تعدادِ ازدواج کا مسئلہ بھی بے معنی رہ جاتا تھا۔ ہندوستان میں ابھی پردہ کا جھگڑا باقی ہے اس لیے تعدادِ ازدواج کا مسئلہ خوش اسلوبی سے طے نہیں ہو سکا ہے۔ خلافت کے اوراق پارینہ ہو چکے، حج کے مسئلہ میں اسمبلی کا فیصلہ آپ کو یاد ہی ہے۔ زکوٰۃ کا مسئلہ بھی اس درجہ دقت طلب نہیں ہے جتنا ہم نے اسے بنا رکھا ہے۔ آپ غور فرمائیں تو سود اور خیرات، دونوں میں ایک اقتصادی راز ہے۔ بعض مسلمان سود نہیں لیتے، لیکن سود دینے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ اس طور پر سود نہ لینے سے نہ صرف مسلمان سراسر نقصان میں رہتے ہیں بلکہ دوسرے اس سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ خیرات کسی دوسری قوم میں اتنی لازمی نہیں قرار دی گئی جتنی اسلام میں۔ اب اگر صرف مسلمان خیرات دیں اور خیرات نہ لے سکیں تو قاعدہ سے وہی نقصان اُن کے حصہ میں آئے گا جو سود کے سلسلہ میں پیش آیا تھا۔ اس لیے اگر

زکوٰۃ کو ایک مستقل لین دین کی حیثیت دی جاسکے تو خیر ورنہ اس کا حذف کر دیا جانا ہی بہتر ہے۔ کیا ''خسرانِ مبین'' نہیں ہے کہ مسلمان سود بھی دیں اور خیرات بھی اور خود اُن کی آمدنی کا ذریعہ کچھ نہ ہو، اب لے دے کر صرف نماز اور روزہ رہ جاتے ہیں۔ نماز کے اوقات ضرورت سے زیادہ رکھے گئے ہیں اور اس کے لوازم اور شرائط ایسے ہیں جن کو بیسویں صدی کا ایک مہذب انسان بجا لانے سے قاصر ہے۔ آپ جانتے ہیں نماز میں طہارت اور وضو کی کیسی سخت پابندیاں رکھی گئی ہیں، اور یہ چیزیں وہ ہیں جن کی قدم قدم پر پرسش ہوتی ہے، اور ہم کو خواہ مخواہ ہر ہر قدم پر اس کے متعلق اپنے نفس سے محاسبہ کرنا پڑتا ہے۔ آپ جانتے ہیں شرعی پابندیاں عاقل اور بالغ مسلمانوں پر عائد کی گئی ہیں، لیکن اس سے کس کو انکار ہوسکتا ہے کہ گرم ملکوں میں انسان عاقل ہونے سے کہیں پہلے بالغ ہوجاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک عقل آئے بلوغ کی جولانیاں اور شرم ساریاں کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں ہندوستان کے بالغوں کو یا تو نماز سے معذور رکھا جائے یا پھر یہ طہارت وغیرہ کی پابندیوں سے مستثنیٰ کردیے جائیں۔ مجھے معلوم ہے آپ میں سے بعض حضرات یہ اعتراض پیش کریں گے کہ انگریزوں کا دورِ حکومت و ہیبت ختم ہوچکا ہے اس لیے اب اس امر کا اندیشہ نہیں رہا ہے کہ کسی سفید پوش حکام رس بزرگ کو طہارت کی پابندیاں گراں گزریں۔ یہ اعتراض ایک حد تک صحیح ہے، لیکن یہ سوال انگریزوں کی ذات کا نہیں بلکہ اُن کے گذشتہ اثر و اقتدار کا ہے جو اب بھی ہم پر مسلط ہے اس لیے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ نظر برآں، میں یہ تجویز پیش کروں گا کہ ہفتہ میں صرف ایک بار جمعہ کی نماز ہوا کرے۔ اگر آپ اجازت دیں تو اسی سلسلہ میں ایک اور بات کی طرف آپ کی توجہ مائل کراؤں۔ ہم میں سے بعض قدیم الخیال لوگ اب بھی 'پردہ' کے حامی نظر آتے ہیں، اُن کا خیال ہے کہ اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی ہے، اور اگر عورتوں کو اس بارۂ خاص میں آزادی دی گئی تو نہایت سنگین اور اندوہناک نتائج مرتب ہوں گے۔ مجھے ان حضرات سے کامل ہمدردی ہے۔ میں اس وقت آپ کے سامنے یورپ وغیرہ کی مثال نہیں پیش کرنا چاہتا، میں صرف یہ عرض کروں گا کہ جب تک ہندوستان میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش میدانِ حیات میں گام فرسا نہ ہوں گی اُس وقت تک ہندوستان کو کامل نجات حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس لیے میری رائے ہے کہ فی الحال عورتوں کو کم سے کم

نماز جمعہ میں مردوں کے ساتھ صف آرا ہونے کی اجازت دی جائے۔ خدا کے حضور میں دونوں اپنی اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں گے۔ اگر خطبہ یا قرأت سننے میں طبیعتیں مائل نہ ہوں گی تو یہ کیا کم ہے، ''دعا'' زیادہ ''رقتِ قلب'' سے مانگی جاسکے گی۔

حضرات، مجھے یہ معلوم کر کے نہایت مسرّت ہے کہ آپ میں ایک روشن خیال طبقہ اس پر تیار ہے کہ خطبۂ جمعہ اردو میں ہو۔ یہ تحریک ابھی بالکل ابتدائی مدارج میں ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ خصوصیت کے ساتھ مستحق ستائش ہے کہ اس کے بعض اساتذہ نے انتہائی جرأت اور صاف گوئی سے کام لے کر بہت سے متشکلکین کے لیے راستہ صاف کر دیا ہے۔ مجھ کو نہایت افسوس ہے کہ جامعہ کو دہلی منتقل ہونا پڑا، ورنہ مجھے کامل یقین تھا کہ ہمسایہ مسلم یونیورسٹی جس نے اردو کو لازمی مضمون قرار دیا ہے اس پیش قدمی سے شرم سار ہوتی۔ مسلم یونیورسٹی کے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ خطبۂ جمعہ کے بجائے نماز جنازہ اردو میں کرا دے........''

قابل مقرر کا سلسلۂ کلام جاری ہی تھا کہ کہیں دور سے اذان کی آواز سنائی دی۔ کچھ لوگ پہلو بدلنے لگے، اور مجمع میں ایک طرح کا ہیجان پیدا ہونے لگا تھا کہ پریسیڈنٹ نے یہ کہہ کر کہ یہ قابل مقرر کے ساتھ سخت ناانصافی ہے، آرڈر آرڈر کہہ کر مجلس کے اضطراب کو روک دیا۔ مقرر نے کہنا شروع کیا۔

''حضرات! نماز، حج اور زکوٰۃ کے بعد میں روزہ پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر سوت کاتنے کے بجائے کتوانے کی شرط بھی منظور کی جاسکتی تھی تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ روزہ رکھنے کے بجائے رکھوایا نہ جائے۔ آپ کو معلوم ہے ہندستانی آبادی کا بہت بڑا حصہ اپنے بعض محبوب و مقبول مشاغل کے اعتبار سے فاقہ کش رہا ہے۔ اس فن میں ہندوستانیوں کو اب بھی وہ ملکہ حاصل ہے جو کبھی ڈھاکہ کو ململ بنانے میں حاصل تھا۔ امرا کے مشاغل اور ذمہ داریاں اظہر من الشمس ہیں۔ اگر اُن کو یہ رعایت حاصل ہو جائے گی کہ وہ فاقہ کش آبادی کو روزہ کے شغل میں لگا سکیں تو پھر آپ یقین مانیے نمک پر کتنا ہی محصول کیوں نہ بڑھا دیا جائے اُن کو کبھی محسوس نہ ہوگا۔ آپ کو معلوم ہے روزہ میں لوگوں کو خواہ مخواہ غصہ آتا ہے اور یہ اصول عدم اشدّاد کے منافی ہے۔ اعلیٰ طبقہ میں روزہ کے باعث غصہ پیدا ہونا بعض اوقات نہایت الم ناک نتائج کا

باعث ہوتا ہے۔ اوّل تو اس سے زن و شو کے تعلقات میں اکثر ناخوشگواری پیدا ہوتی ہے اور بعض اخبار والے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس طبقہ پر روزہ کا بار ڈالنے سے بسا اوقات مذہب و ملت پر حرف آنے کی نوبت پہنچتی ہے۔ یہ لوگ صاحب علم و اقتدار ہوتے ہیں اور خدانخواستہ کوئی بات اُن کو ناگوار طبع ہوئی پھر آپ یقین فرمائیں مذہباً یہ اس قدر روشن خیال ہو جاتے ہیں کہ مذہب و معاشرت کی خیر منانی پڑتی ہے۔ مفلوک الحال طبقہ، اس میں شک نہیں، اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا، لیکن ان کا غم و غصہ اتنے مہلک نتائج نہیں پیدا کر سکتا۔ آخر ''قہر درویش'' کس کے لیے وضع کیا گیا ہے۔

حضرات، یہ تو ایک عام بحث تھی جس کے صحیح اور سنجیدہ ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا، اب میں اس کا دوسرا پہلو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں بیسویں صدی میں ایک زندہ اور ذہین قوم بغیر اجتہاد کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اجتہاد کی بہترین جولاں گاہ، جو اب تک دریافت کی جا سکی ہے، انتخاب زوج یا مذہب ہے۔ آپ کو معلوم ہے، اسلام میں ہم نے اب تک کیسے کیسے نادر اور مفید اجتہاد کیے ہیں، جس کا اشارہ میں تقریر ماقبل میں کر چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ روزہ کے مسئلہ میں بھی آپ اپنی معاملہ فہمی اور زندہ دلی کا ثبوت دیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اسے سرے سے حذف کر دیا جائے، لیکن جب نماز میں خطبۂ جمعہ اردو میں ہو سکتا ہے، موسیقی میں قوالی کا عنصر روا رکھا گیا ہے، قومی کاموں کے لیے بے پردہ ہونا بھی جائز ہے، تو کیا (گرج کر) سات کروڑ فاقہ کشوں کے لیے ہم ماہِ صیام میں ہر روز صرف ایک وقت کا ناشتہ نہیں منظور کر سکتے؟ (مجمع پر کچھ اثر نہ دیکھ کر، رقت آمیز لہجہ میں) اچھا ناشتہ نہ سہی، تو کیا آپ ایک آدھ سگریٹ، دو چار گلوریاں، دو ایک پیالی چائے (آپ چاہیں تو دودھ اور شکر حذف کر سکتے ہیں) ایک آدھ چھینٹے، دو چار جرعے اور کچھ ایسے لطائف و ظرائف کے بھی، جو خلوت یا جلوت میں کہیں ''نقض امن'' کے موجب نہ ہوں، روادار نہیں ہو سکتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ روزہ میں جن حرکات و سکنات کی مذہباً ممانعت کی گئی ہے اُن سب کو آزادی دے دی جائے کیوں کہ پھر یہ ایک ایسی رعایت ہو گی جس سے ہم باوجود کوشش کے بھی عہدہ برآ یا متمتع نہ ہو سکیں گے۔ پھر اس میں یہ بھی اندیشہ ہے کہ وہ لوگ جو ماہِ صیام کے محض اس بنا پر شکر گزار ہوتے ہیں کہ اس میں بعض جبری خدمات معاف کر دی جاتی ہیں،

اس پر اعتراض کریں گے اور چوں کہ ایسے لوگ بالعموم حکام رس ہوتے ہیں۔ ممکن ہے ہمارے خلاف ایک دفعہ پھر کوئی ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کرادیں اس لیے سوراج نباہنے کے لیے ضروری ہے کہ اس طبقہ کو مکمل آزادی دے دی جائے۔

حضرات، مسئلہ نازک اور وقت تنگ ہے.........''

''وقت تنگ ہے'' کا سننا تھا کہ یک لخت آنکھ کھل گئی۔ فوراً چار پائی کے اندر سے نکلا، لیکن سر پائے سے ٹکرا گیا تھا۔ چاردن ہی تاریکی نظر آتی تھی۔ میں سمجھا شام ہوگئی، افطار کا وقت بھی نکل گیا۔ لپک کر صراحی کی طرف بڑھا کہ اتنے میں ''ہائیں ہائیں'' کی آواز آئی۔ میں نے اپنی غلطی کا احساس کیا، معلوم ہوا کہ ابھی ابھی بارہ بجے ہیں۔ بہر حال ایسے موقعہ پر بیوی ہو یا اپنے محکمہ کا کوئی لاٹ پادری، اضطراراً کوئی نہ کوئی حیلہ کرنا لازمی ہے۔ میں نے کہا، اور اس طور پر جس میں درد، خفت، غصہ، بے بسی، سب کچھ شامل تھا۔ کیا کلی کرنے کا ارادہ کرنا بھی کوئی جرم ہے؟'' میں نے روکنے والے کے چہرہ کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا ورنہ ممکن تھا جرم بھی متیقن ہو جاتا!

....

یہ تو مکان کی اندرونی حالت تھی، باہر سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کسی مفلس، کہن سال، سیاہ فام، نیم برہنہ، عیسائی نے جو ریلوے کی ادنیٰ ملازمت سے پنشن یاب ہو کر دوران جنگ میں عراق عرب گیا تھا اور ایک پاؤں اسی دار و گیر کی نذر کر چکا ہے، اپنی بیساکھی سمیت اس مکان پر قابض ہے۔ برآمدوں میں کم خرچ بلند بالا چقیں پڑی ہیں۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ دروں میں گرد آلودہ پودوں کے گملے آویزاں کر دیے جائیں (میرے ہمسایہ دوست نے اسے بھی ملحوظ رکھا ہے) مکان کی کرسی ذرا بلند ہو، پھر تو گویا متذکرہ صاحب خانہ ایک خاکی ہاف پینٹ پہنے ہوئے زینہ پر بیٹھے ہیں، بیساکھی پہلو میں رکھی ہے۔ کثیف بنیائن گھٹنوں پر ہے، اور واقعات کی کھتونی میں ناخن تدبیر سے کام لیتے جاتے ہیں۔ سامنے مرغیوں کا بہت لمبا چوڑا ڈربہ ہے۔ اس سے زیادہ لمبی چوڑی میم صاحبہ، عرض و طول مساوی، مشکیں نسب، سفید بال، سفید سایہ، سفید موزہ، سیاہ جوتا جس پر تازہ سیاہی لگی ہو اور اس کا کچھ حصہ موزوں پر منتقل ہو چکا ہو، ایک درجن مرغیوں کو دانہ چگاتی اور اپنے ہی کم و بیش ایک درجن ''بابا لوگ'' کو گھڑکتی چمکارتی نظر

آتی ہیں۔ان بچوں کا سرسری نظر سے بھی جائزہ لیا جائے، تو یہ معلوم ہوگا کہ یہ صرف اسی فضا کی پیداوار ہو سکتے تھے۔کبھی یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک بڑھتے بڑھتے اپنے والدین اور موجودہ فضا اور ماحول کے مانند ہو جائے گا۔کبھی یہ محسوس ہوتا کہ ان میں سے ہر ایک اپنے والدین اور اس فضا کا مختصر مجموعہ ہے۔

....

خیالات کا سلسلہ یہیں تک پہنچا تھا کہ چپراسی نے ایک نوٹس لا کر دیا جس میں حکام بالا دست نے ہدایت کی تھی کہ مکان خالی کر دیا جائے تا کہ چھتیں بلند اور پختہ کر دی جائیں اور کچھ ضروری ترمیم اور مرمت بھی ہو جائے! کیا 'خداساز' بات ہے۔

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں!

(مطبوعہ: الناظر لکھنؤ، جولائی 1925)

●●●

کشکول

(1)

میرے ایک دوست کہ نہایت شریف النفس اور خوش مزاج ہیں، ایک لحاظ سے ہمیشہ عجیب الخلقت پائے گئے۔ میں نے بارہا اُن کو آزمایا، مگر تانگے والوں، گاڑی والوں خوانچہ والوں، اور قلیوں سے اُن کو ہمیشہ برسرپیکار پایا، بارہا اُن کے ساتھ سفر کرنے کی حسرت پوری ہوئی، مگر ملک کی اس آبادی سے اُن کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ پائے گئے۔ ایک مرتبہ اُن کے ساتھ بنارس سے پٹنہ جانے کا اتفاق ہوا، اُن کے علاوہ چند اور محبانِ کالج بھی ہم سفر تھے، اور وقت نہایت ہنسی خوشی سے کٹ رہا تھا۔ مغل سرائے کے اسٹیشن پر گاڑی بہت دیر ٹھیرتی ہے، اور وہاں آب خوروں میں بالائی بڑی کثرت سے بکتی ہے کھانا کھانا شروع کرنے سے قبل ہم لوگوں نے بھی جناب کے اشارہ پر بالائی خریدی اور دسترخوان بچھا کر دادِ شجاعت دینے لگے۔ جناب اسٹیشن سے ملے ہوئے تختہ پر باہزاراں کرّوفر جلوہ افروز تھے۔ بالائی والوں نے جن کی تعداد بہت تھی یہ دیکھ کر یہ جماعت کھانا کھا رہی ہے آنا شروع کیا، اور میرے دوست کو ہدفِ تکلم بنایا۔

ایک بالائی والا۔ ''سرکار! بالائی حاضر ہے!''

''نہیں، بھئی! نہیں چاہیے۔''

دوسرا بالائی والا ''سرکار! بالائی!''

''جاؤ جی، جاؤ، ہمیں نہیں چاہیے۔''

تیسرا بالائی والا! ''سرکار! کتنی بالائی حاضر کروں؟''

سکوت مطلق!

چوتھا بالائی والا! ''دہی''؟

میرے دوست کے تیور بدلنے لگے، نتھنے پھیل رہے ہیں، اور آنکھوں سے چنگاریاں برآمد ہورہی ہیں پانچواں بالائی والا۔ ''دہی؟''

میرے دوست آنِ واحد میں گاڑی کے باہر پہنچ چکے تھے، اور بے چارے کی منہنی مگر کثیف گردن ان کے آہنی پنجہ میں معلق تھی، اور ہمارے دوست رجز خوانی پر آمادہ نظر آتے تھے۔ سب نے بھاگ دوڑ کر فساد رفع کیا، ورنہ یار غار کی تنگ ظرفی کا تاوان پردیس میں بھگتنا پڑتا، اُس دن سے عہد کر چکا ہوں کہ اب اُن کے ساتھ کبھی سفر نہ کروں گا۔

(2)

غالب مرحوم کے بہت سے اشعار مجھے یاد ہیں، مگر ان میں بعض ایسے ہیں جو سال کے صرف مخصوص حصہ میں یاد رہتے ہیں۔ مثلاً مارچ کے شروع میں جب ہندوستان کا نام نہاد موسم بہار شروع ہوتا ہے، اور درختوں پر نئی نئی حسین و دلکش کونپل رونما ہوتی ہے تو خواہ مخواہ میری زبان پر یہ مصرع جاری ہوجاتا ہے۔

ع ''موجِ خرام یار بھی کیا گل کتر گئی!''

مگر

خواہ موسم برشگال کی اودی اودی گھٹاؤں والی شام ہو، یا موسمِ سرما کی نہایت طویل اور پُرسکون رات مجھے وہ قطعہ کبھی نہیں بھولتا جس کا ایک نشتر یہ ہے۔

لطف خرام ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے [1]

---

1 مرزا غالب۔صوفی

اس شعر کو دہراتا رہتا ہوں، اور سوچتا رہتا ہوں کہ اس عالمِ کون ومکاں میں ہر فرد کی ''جنت نگاہ'' ''فردوسِ گوش'' جدا جدا ہے، مثلاً:

نام	جنت نگاہ	فردوسِ گوش
1۔ ورڈس ورتھ	لہلہاتا مرغزار	پرندوں کی نغمہ سرائی
2۔ مجنوں	جمالِ لیلیٰ (اگر ممکن ہو) ورنہ اس کے کتے کی رعنائی ودلکشی	لیلیٰ کی چھاگلوں کا نغمۂ شیریں یا اُس کے کتے کی غیر منظم زیر وبم
3۔ حضرت خالدؓ	بہادرانِ اسلام کی فوجی قطار بندی	تیغ وتبر کی جھنکار
4۔ حضرت بلالؓ	جمالِ رسالت مآبؐ	کلمہ تکبیر
5۔ شاعر (مشرقی)	''حسنِ ملیح نو''	ٹھوکر کی آواز جس کو صدائے قُم باذن اللہ تصور کیا جاتا ہے۔
6۔ ٹینس پلیئر	صاف آسمان، اور ہرا ابھرا لان	''سرکار! نئی گولیاں حاضر ہیں!''
7۔ علیگ	مرغ پلاؤ، اور شامی کباب	ظروف کی جھنکار، جس سے معلوم ہو کہ کھانا چنا جارہا ہے۔
8۔ بیسویں صدی کا سوج	''برقِ تابانِ جمال''	ہارمونیم کی ترنم ریزی۔

(3)

میرے ایک عزیز دوست عوام الناس کی خام کاریوں، اور ہوس ناکیوں سے دیگر وگرفتہ ہو کر اکثر اپنے خیالات کو اس لباس میں ظاہر کرتے ہیں۔

شادی سے اور رومانس (Romance) سے کوئی تعلق نہیں، بہ الفاظ دیگر نکاح کے بعد عشق کا رنگ وروغن غائب ہو جاتا ہے یعنی ؎

''نامرادی باعث افزائش لذات ہے
آرزو کی موت ہے گویا حصول مدعا''

یہ تو خیر ع مقطع میں آپڑی تھی سخن گسترانہ بات

یہ اہم موضوع اس امر کا حاجت مند ہے کہ اس پر دل کھول کر ایک مبسوط مضمون تیار کیا جائے مگر مجھے ایک انگریز مصنف کا ایک خیال بیان کرنا ہے جس نے بین الاقوامی فضائل نسوانی ایک فقرے میں منجمد کر دیے ہیں۔

''اگر میرے ملک کے قوانین مجھے کثرت ازدواج پر مجبور کریں، تو میں ورجینیا یا انگلستان کی ایک دوشیزہ کو اپنے دل کا مالک بناؤں گا، ایک جرمن لڑکی میرے گھر کے انتظام کی ذمہ دار ہوگی۔ فنونِ لطیفہ کی جانب میلانِ طبع کو فرنچ پری پیکر کے حوالہ کر دوں گا، اور دماغی روشنی ایک امریکن ماہ رو کی طلعت ریزیوں سے اخذ کروں گا۔ اس کے باوجود اگر زندگی میں کبھی جمود پیدا ہوا تو میں ہسپانوی نازنین کی طرف متوجہ ہوں گا۔''

میرا ذاتی خیال ہے کہ سرزمین ہند کی سلمٰی اور شکنتلا ان تمام صفات کا مجموعہ ہو سکتی ہے، اگر اس کو جاہل نہ رکھا جائے، اور اس کی تعلیم و تربیت کا پورا پورا انتظام ہو۔

اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی لائقِ غور ہے کہ عورت کے فرائض شادی ہونے کے بعد کس قدر وسیع ہو جاتے ہیں۔ اس حالت میں وہ محض حسن کی دیوی نہیں ہوتی جو حسین کنجوں میں اور شبِ ماہتاب میں پھولوں کے ہار گوندھتی رہے، اور صفحۂ دہر کو قرطاسِ محبت سمجھا کرے اور بس، وہ محبت و اُلفت کا سرچشمہ ضرور ہوتی ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک وسیع اور اہم ترین سلطنت کی ذمہ داریاں اُس کے ناتواں شانوں پر عائد ہو جاتی ہیں، وہ عشق کی داستانِ پارینہ پسِ پشت ڈال دیتی ہے، اور مردانہ وار دنیا کے اکھاڑے میں اُتر آتی ہے۔

اس وقت یہ عرض کرنا محال ہے کہ تعلیم کس پیمانہ پر اور کس طریقہ سے ہو؟ یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے، مگر اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ تعلیم ایسی ضرور ہو جو عورتوں میں نسائیت اور مشرقیت کو برقرار رہنے دے۔ عورت مجموعہ ہے حسن و جمال کا، رعنائی و دلکشی کا، شیرینیت و محبوبیت کا اور اگر اس کی تعلیم نے اس کے اجزائے ترکیبی میں فتور ڈالا، تو نتیجہ معلوم۔

(4)

مغرب میں قتل عمد کو ایک فنِ لطیف تصور کیا جاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ قتل عمد خواہ فنونِ لطیفہ میں داخل ہو یا نہ ہو، مگر ''بحث بازی'' ضرور اس لڑی میں منسلک کی جا سکتی ہے۔

اس ''بازی'' کے ساتھ ساتھ مجھے وہ مزعفر پوش شاہ صاحب یاد آ جاتے ہیں جنھوں نے ڈائننگ ہال کے کھانے کی ایک پلیٹ میں سے ایک مرتبہ (165) ایک سو پینسٹھ ہڈیاں نکالی تھیں، اور ایک جھیل میں سے کھڑے کھڑے چالیس مہاشیر مار لائے تھے۔ شاہ صاحب تو فی الحال نظروں سے اوجھل ہیں، اور خدا جانے کب اُن کے دیدار فرحت آثار سے ہماری آنکھیں منور ہوں، مگر جب جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ہمارے آقائے نامدار شاہ صاحب کے حقیقی معنوں میں سجادہ نشین ہیں۔ اُس کی خیال آرائی سے اس قدر عاجز آ گیا ہوں کہ اب میرا ایمان ہے کہ ملازم خواہ کچھ ہو مگر خدا نہ کرے کہ وہ بجٹ باز ہو۔ کسی سوال کے جواب دینے سے آپ اُس کو قاصر نہ پائیں گے اور اُس کے جوابات صحت سے اُسی قدر دور ہوتے ہیں جس قدر کہ ایک پاپیادہ کے لیے منٹو سرکل سے اکاؤنٹس آفس۔ آپ کی طبیعت اس قدر شورش پسند اور ہنگامہ نواز واقع ہوئی ہے کہ کوئی میچ ہو، کھیل ہو، جوبلی ہو، یا نمائش وائسرائے آئیں یا گورنر ہماری چائے اور کھانا دونوں غائب، نہ پان میسر آتا ہے، اور نہ سگریٹ دستیاب ہوتا ہے، علاوہ ازیں یکساں (Monotonus) زندگی سے بہت جلد عاجز آ جاتے ہیں۔ آٹھویں دن بلاناغہ اُن کے پیٹ میں درد اُٹھنا، دورانِ سر اور امتلا کا شروع ہونا ناگزیر ہے۔ چنانچہ ایک آدھ دن کی جبریہ تعطیل منانا اُس کے فرائض میں داخل ہے۔ اس درمیان دنگل میں شرکت فرمائی کہیں سرکس میں جا کودے، کہیں نوٹنکی میں چلے گئے، اور تیسرے، چوتھے دن بیک بینی و دوگوش آموجود ہوئے۔ چہرہ حسب معمول نہایت سنجیدہ اور متین، آنکھیں زمیں دوز اور کام میں انتہائی سرگرمی اور دوڑ دھوپ جس کی وجہ سے یہ ناز آفرینیاں برداشت کی جاتی ہیں۔

علاوہ ازیں طبیعت آپ کی غیر معمولی طور سے ہمہ گیر واقع ہوئی ہے۔ کالج کے تمام شعبے اور تمام مسائل آپ کی دلچسپی کا موجب ہیں۔ مشاعرہ بیت بازی، کھیل کود، جلسے، ڈنر، پارٹی، یونین اسٹاف کلب، یونیورسٹی کے دفاتر، غرض کوئی گوشہ اور کوئی عنوان ایسا نہیں جو اُن کی دست برد سے باہر ہو، یا جہاں اُن کی دلچسپی و تفنن طبع کے لیے مواد موجود نہ ہو۔ جن جن اصحاب کو وہ زیر بار احسان کر چکے ہیں اُن کی تاریخ ولادت سے لے کر آج تک کے جزوی سے جزوی حالات اُن کو ازبر ہیں۔ چنانچہ ڈپٹی صاحب کی ٹانگ کٹنا، اور پیر جی مرحوم کا مرض الموت میں گرفتار ہونا

(وغیرہ وغیرہ) اُن کی زبان کے سب سے نمایاں گوشہ میں محفوظ ہیں، اور ہر نئے ملاقاتی کا وہ اُن دل ہلا دینے والی افسانوں سے خیرمقدم کرتے ہیں۔ مزید برآں ڈاکٹر صاحب، سجاد حیدر صاحب، ابوالحسن صاحب، حیدر خاں صاحب، قریشی صاحب، حبیب الرحمٰن صاحب، وحید الدین خاں صاحب ان اکابر یونیورسٹی کی نقل و حرکت و آمد و رفت کا پروگرام اُن کے ذہن میں محفوظ رہتا ہے، اور اس کے جس جز سے ناواقف ہوتے ہیں اُس کو بجث بازی کی مدد سے فوراً پورا کر دیتے ہیں۔ مگر ذمہ دار سے ذمہ دار شخص کے رو برو وہ اپنی لاعلمی ظاہر کرنا کفر سمجھتے ہیں۔

....

ہمارے محلّہ میں ایک حاجی صاحب رہتے ہیں جن کی عمر اس وقت کچھ اوپر ساٹھ کی ہوگی، مگر یہ کسی کو نہیں یاد کہ حاجی صاحب بیت اللہ شریف کب تشریف لے گئے تھے۔ قد بوٹا سا، جسم گول مٹول، سر پر لانبے لانبے پٹے، بیچ میں مانگ جمی ہوئی، ٹوپی چنی ہوئی، بیل دار لکھنؤ کٹ کی، اُن کی ہیئت کذائی دیکھ کر معاً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ابھی کس محفل رقص و سرود میں کسی کی معیت میں اپنے کمالات دکھا کر آ رہے ہیں۔ ایک مرتبہ آپ کی اہلیہ محترمہ سخت علیل ہوئیں، اور حاجی صاحب کو یہ خوف پیدا ہوا کہ شجر عیش و عشرت کی یہ آخری شاخ جو عالم ضعیفی میں عصائے پیری کے ہم پلّہ ہو جاتی ہے کہیں پیوند خاک نہ ہو جائے۔ اس لیے حاجی صاحب علاج معالجہ میں نہایت سرگرم ہوئے، اور رائے بہادر ڈاکٹر ہر پرشاد کو بلا کر مریضہ کی نبض دکھائی، جن کا یہ مستقل طرز عمل ہے کہ ایک مرتبہ کافی غور و خوض کرنے کے بعد نسخہ لکھ دیتے ہیں، اور اس میں شاذ و نادر ہی کبھی تبدیلی کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف حاجی صاحب سیماب صفت اور وحشت زدہ، اس پر طرّہ یہ کہ ع

"مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"

حاجی صاحب بے حد سراسیمہ اور پریشان ہوئے۔ بار بار ڈاکٹر کو بلاتے، فیس دیتے، اور نسخہ بدلنے پر طرح طرح سے خوشامدیں کرتے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کا وہی جواب ہوتا کہ "ابھی یہی نسخہ چلنے دیجیے، اسی سے شفا ہوگی۔" اس سکوت اور جمود مطلق نے حاجی صاحب کے دماغی توازن کو برہم کر دیا، دامانِ متانت ہاتھ سے جاتا رہا۔ اُدھر ڈاکٹر صاحب گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے اِدھر

حاجی صاحب باہر تشریف لے آئے، مگر اُن کا دماغ انتہائی کرب و بے چینی سے لبریز تھا۔ باہر چند بے تکلف احباب جمع تھے، جن کو اغلباً یہ علم نہ تھا کہ اس غریب کے دل و دماغ پر کیا گزر رہی ہے۔

ایک صاحب۔ حاجی جی! گھر میں کیا حالت ہے؟

حاجی جی۔!!! (خاموش)

دوسرے صاحب۔ سنا ہے کہ ڈاکٹر ابھی آیا تھا؟

حاجی جی۔!!! (سکوتِ مطلق، مگر چہرہ کا افق غبار آلود ہو چلا)

حاضرین کو رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ حاجی جی ڈاکٹر سے اغلباً برافروختہ ہیں۔

تیسرے صاحب (از راہِ تمسخر، مگر سادہ لوح بن کر) ''مگر جناب! ڈاکٹر ہر پرشاد بڑا حاذق طبیب ہے، جس پر ہاتھ رکھ دیا اُس کو شفا ہوئی۔''

سب (ایک زبان ہو کر) ''اس میں کیا شک ہے، خدا نے اُس کے ہاتھ میں عجیب شفا دی ہے۔''

اب کیا تھا، حاجی صاحب کا دریائے غیض و غضب اُبل پڑا، مطلع غبار آلودہ ہو چلا، ذہن مبارک کے اودے اودے ساحل پر کف جھنے لگا، چہرہ پر کسی نے ہیز ہوٹی مل دی، اور کسی دقیانوسی اور مغلوب الغضب تھانہ دار کی روح اُن کے قالب میں حلول کر گئی......(پے در پے)....

حاضرین نے فصاحت و بلاغت کے ان انتہائی کمالات کا نہایت حیرت اور دلچسپی کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ اب بھی حافظ صاحب کے سامنے ''ڈاکٹر ہر پرشاد'' کہہ دینا گویا ایک پُرگو شاعر کو مصرع طرح دے دینے کے برابر ہے۔ مگر اب اس کا کسی کے پاس کیا علاج کہ اُس محلّہ کی کل آبادی حافظ صاحب کو صرف ''ڈاکٹر ہر پرشاد'' ہی کے نام سے یاد کرتی ہے، اور حافظ صاحب محض چیں بہ چیں ہو کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

(مطبوعہ: علی گڑھ میگزین، علی گڑھ۔ جوبلی نمبر، جنوری/فروری 1925)

●●●

بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا

کچھ دن ہوئے یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر ہوئی تھی جس کا عنوان تھا، ''آپ نے پہلے نہیں کہا'' اصلاح واضافے کے بعد یہ کچھ سے کچھ ہوگئی جس کی ذمہ داری تمام تر میرے اوپر ہے اور تھوڑی بہت ''مدیر ساقی'' پر، لیکن یہ باتیں اس وقت کے لیے ہیں جب مجھ پر یا مدیر ساقی پر مقدمہ چلے گا۔ ناظرین کو تو صرف تقریر سے سروکار ہے اور وہ حاضر ہے اور مقدمہ ہی چلنے لگا ہو تو مدیر ساقی کو اختیار ہے وہ اس میں خود بھی جہاں چاہیں اضافہ اور اصلاح کرلیں۔ مقدمے تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ اس طرح سے موقعے روز روز نہیں آتے۔ فی الحال تو شاہد صاحب آل انڈیا ریڈیو دہلی کا شکریہ ادا کریں اور ناظرین نعرہ لگانے سے باز رہیں۔

(رشید احمد صدیقی)

....

''بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانئے کیا یاد آیا'' اور میں ایک صاحب کو مار بیٹھا جو پاس ہی دوزانو اس طور پر سر جھکائے مودّب بیٹھے ہوئے تھے جیسے میرے ہاتھ پر بیعت کرچکے ہوں یا مجھ پر توجہ ڈال رہے ہوں کہ میں ان کے ہاتھ پر بیعت کرلوں گا۔ اُن کو دیکھ کر کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا تھا جیسے قوالی سے اخلاقاً متاثر ہوئے ہوں اور قوال کا حق مارنے کی فکر میں ہوں، لیکن دراصل وہ شعر یوں ہے۔

دل میں اک ٹیس اُٹھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے

بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا!

آپ یقین فرمائیں مار بیٹھنے سے پہلے میرے دل میں کوئی ٹیس نہیں اُٹھی تھی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور نہ مار کھانے کے بعد میرے دوست کے دل میں کوئی ٹیس اُٹھی یا اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ظاہر ہے یہ صورت احوال ایسی تھی کہ ہم میں سے کم سے کم ایک کو ضرور ڈوب مرنا چاہیے تھا، لیکن چوں کہ مرنے کا وقت پہلے سے معین ہے اور کسی کو نہیں معلوم حتیٰ کہ مرنے والے کو بھی، اس لیے غیرت کا تقاضا یہ تھا کہ ڈوبنے ہی کی کوشش کرتے اور دریا پایاب ہونے کی دعا کرتے۔ بہر حال نہ ہم ڈوبے نہ وہ مرے۔ یہی نہیں بلکہ کچھ ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے ہماری اس بے حسی اور بے غیرتی پر کوئی دوسرا ڈوب مرے تو بھی ہم پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ یہاں مجھے یہ تردد ہورہا ہے کہ بغیر مار کھائے ہی آپ میں سے کوئی ڈوب مرنے کی کوشش نہ کرنے لگے۔ اگر ایسا ہے تو میرا مشورہ ہے کہ دریا کے پایاب ہونے کی دعا پہلے کیجیے اور ڈوبنے کی کوشش اس کے بہت بعد۔ دعا کے قبول ہونے کا انتظار کر لینا بہر حال اولیٰ ہے۔ ظاہر ہے دعا کا قبول نہ ہونا بھی ڈوب مرنے کی بات ہے۔ یہ باتیں میں نے اس لیے عرض کر دیں کہ آپ کے دشمن ڈوب مریں تو یہ نہ کہنے کو ہو کہ ''آپ نے پہلے نہ کہا'' اور ورثا خوش ہوں کہ نہ جنازہ اُٹھانے کی زحمت ہوئی اور نہ مزار بنانے کی زیرباری۔

اپنی اس حرکت پر مجھے کچھ اس طرح کی فراغت محسوس ہوئی جسے حماقت سے متمیز کرنا دشوار تھا۔ آپ بھی کچھ ایسے گئے گزرے نہ ہوں گے کہ آپ پر کیفیت نہ طاری ہوئی ہو! افسوس ہے کہ مجھے اس موقع پر اُستاد کا کوئی شعر یاد نہیں آتا۔ ورنہ میں آپ کو ضرور سناتا گو ہمارے استادوں نے فراغت اور حماقت کے خاصے اشعار کہے ہیں۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ کوئی استاد بھی آس پاس نظر نہیں آتے ورنہ انھیں کو پیش کر دیتا۔ ہم دونوں نے اس حادثے کے بعد ایک دوسرے کو غور سے دیکھا اور ٹٹولا بھی۔ انھوں نے میری نیت کو، میں نے اُن کی جیب کو، لیکن کسی کو کچھ نہ ملا۔ اور ہم دونوں قوم کی تقدیر اور پولیس کے حسنِ تدبیر پر صابر نظر آئے۔ شاید آپ خیال کرتے ہوں کہ میرا یہ فعل غیر شریفانہ اور غیر آئینی تھا، ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ الیکشن اور افلاس کے

زمانے میں اس طرح کی باتیں ہو ہی جاتی ہیں، لیکن آئین اور شرافت سے قطع نظر میں یہ کہنے والا تھا کہ اگر میں اُن کو مار بیٹھا تو وہ مجھے مار بیٹھے۔ آپ ہی بتایئے جو شخص قوال کے پیسے مار بیٹھنے کی فکر میں ہو وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ زندگی میں بعض لمحات ایسے آتے ہیں جب آدمی بے قافیہ نظم ہی لکھنے کے لیے بے تاب نہیں ہوتا بلکہ بے اختیار یہ چاہنے لگتا ہے کہ کسی کو مار بیٹھے! مارنے اور مار کھانے کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر آپ کسی کو نہ ماریں گے تو وہ مار بیٹھے گا۔ جو لوگ لڑائی کے میدان سے لوٹے ہیں بلکہ مجھے تو ایک زمانے میں یہ محسوس ہونے لگا تھا جیسے لڑائی میں شریک ہونے والوں سے کچھ زیادہ تعداد اُن کی ہے جو لوٹ کر آئے ہیں۔ اُن کا بیان ہے کہ لڑائی میں دشمن کہیں کسی حالت میں نظر آئے اسے مار ڈالنا چاہیے، نہیں تو وہ تم کو مار ڈالے گا اس اصول کے مدِ نظر میں کسی سے ملتا ہوں تو اس سے قرض مانگ لیتا ہوں تا کہ وہ مجھ سے نہ مانگ بیٹھے۔ چوری کرنے، بھیک مانگنے اور عاشق ہو جانے کے معاملے میں بھی اس پالیسی پر عمل کرتا ہوں۔ یہ عاشق ہو جانے والی بات میں نے ذرا سوچے سمجھے بغیر کہہ دی۔ عاشقی میں ہوتا بھی کچھ ایسا ہی ہے اور کہہ اس لیے دی ہے کہ اس کا جس پر اثر پڑنے والا ہو وہ مجھ سے خبردار رہے اور یہ نہ کہہ سکے کہ میں نے پہلے سے نہیں کہہ دیا تھا۔ اب جب کہ عاشقی کا ذکر چھڑ گیا ہے تو ایک شعر بھی سن لیجیے۔ عاشقی بغیر شعر کے اور لیڈری بغیر نعرے کے نہیں ہوتی وہ شعر یہ ہے۔

جو تجھ سے ہی کہنے کی تھی ایک بات
وہی بات تجھ سے چھپا کر چلے !!

لیکن محبوب سے کوئی بات چھپا کر چل کھڑا ہونا تعجب کی بات نہیں۔ ممکن ہے آپ نے عقل مندی سے کام لیا ہو۔ یعنی آپ نے بات کا زیادہ نہ خیال کیا ہو بلکہ اپنی ہڈی پسلی کا زیادہ خیال کیا ہو۔ اس لیے کہ بعض دوستوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ بات کی ضرب تو خفی اور خفیف ہوتی ہے، لیکن لات اور لاٹھی کی ضرب خاصی جلی اور شدید ہوتی ہے۔ اس سے قطع نظر آپ محبوب سے کوئی بات چھپا کر چل کھڑے ہوں تو اس میں کسی کا کیا اجارہ، البتہ مجھے اُمید ہے کہ آپ اس کے ڈرائنگ روم سے کچھ چھپا کر چل نہ دیے ہوں گے۔ یہ میں نے اس لیے کہہ دیا کہ جہاں تک اردو شاعری کا میرا مطالعہ ہے دربان کا کیریکٹر ہرگز ایسا نہیں ہے کہ کوئی شریف یا کمزور آدمی اس

کے پاس بے تکلف چلا جائے۔ ممکن ہے اس کا یہ سبب ہو کہ اردو شاعری کا محبوب خاصا محفل پسند واقع ہوا ہے جہاں ہر شخص آسانی سے پہنچ سکتا ہے اور اردو شاعری کے عشاق بھی کچھ کم مخدوش یا منحوس نہیں ہوتے۔ اُن کے لیے ضروری تھا کہ دربان اُن پڑھ اور آبرو باختہ رکھا جاتا۔ یہاں وہ مقام آتا ہے جسے قصیدے میں گریز کہتے ہیں جس سے میں اب تک گریز کرتا رہا۔ قصیدے میں یہ بڑے معرکے کی چیز سمجھی جاتی ہے جہاں سے جلوس گزر رہا ہو، لیڈر تقریر کر رہا ہو، پولیس انتظام میں مصروف ہو یا طالب علم سرگرم نیاز ہوں وہاں بھی یہ بڑے کام کی چیز ہے۔ زندگی اور ادب میں البتہ یہ بڑی چیز بتائی جاتی ہے اور یہ اُن دوستوں کی رائے ہے جو کسی بات سے گریز نہیں کرتے ــــ گالی گلوج سے بھی نہیں۔ یہ جاڑے کا زمانہ ہے اور الیکشن کا موسم۔ کبھی اس جاڑے میں انگریز کیک کھاتا تھا اور ہندستانی سردی۔ یا اب انگریز پیچ و تاب کھاتا ہے اور ہندستانی لاتیں۔ ہمارے دوست جن کا تذکرہ اوپر کر آیا ہوں مار کھاتے ہیں اور یہ خاکسار قسمت کی کھاتا ہے اکثر منہ کی بھی۔ یورپ کے سائنس دانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی عقل و محنت سے گھٹیا سے گھٹیا چیز سے بڑھیا سے بڑھیا چیز برآمد کرتے ہیں۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اپنی بدعقلی سے بڑھیا سے بڑھیا چیز کو گھٹیا سے گھٹیا سطح پر دھکیل دیتے ہیں اور الیکشن کا زمانہ وہ ہوتا ہے جب یہ بدعقلی اور بے ہودگی سب سے زیادہ بھیانک اور گھناؤنے روپ میں اُبھرتی ہے۔ دوست دشمن کسی کے نہیں ہوتے۔ چنانچہ دشمنوں نے مشہور کر دیا کہ مجھے کوئینگ یعنی جھوٹ اور سچ ملانا خوب آتا ہے۔ اس لیے الیکشن کے موقع پر مجھے ہر اُمیدوار یاد کر لیتا ہے، لیکن مجھے یاد کرنے والے ایسے ہی اُمیدوار ہوتے ہیں جن کو ووٹ دینے کی بجائے گوشمالی کرنے پر لوگ آمادہ ہو جاتے ہیں اور اُس کو نہیں پاتے تو اس کے ایجنٹ ہی پر اکتفا کرتے ہیں تو خدا کا کرنا اور میرا ابھرنا کچھ ایسا ہوا کہ میں الیکشن ایجنٹ ہو گیا۔ طب میں جتنے امراض یا قانون ہیں جتنے چور دروازے ہوتے ہیں ملک میں اتنی ہی پارٹیاں تھیں۔ مجھ سے سب نے رجوع کیا اور میں نے سب کا کام سنبھال لیا! بظاہر میری یہ حرکت آپ کو خاصی ناشائستہ بھی معلوم ہوئی ہوگی۔ اس طرح کی حرکت ایک ڈپٹی صاحب بھی کیا کرتے تھے۔ اُن کا حال یہ تھا کہ وہ مقدمات میں مدعی، مدعا علیہ یہاں تک کہ وکلائے فریقین سے بہ یک وقت روپے لے لیتے تھے۔ جس کے خلاف فیصلہ صادر کرتے اس کے روپے واپس

کر دیتے اور بقیہ رکھ لیتے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ یہ رشوت نہیں محنتانہ، نذرانہ یا شکرانہ تھا۔ اس دلیل کو زیادہ قوی بنانے کے لیے بھی اعتراض کرتے کہ درگاہوں میں مٹھیں سبھی مانتے ہیں قبول تو ایک ہی کی ہوتی ہے۔ وہاں کوئی شکایت نہیں کرتا حالاں کہ ان درگاہ کے اولیاؤں کا کوئی خرچ ہے نہ اُن کی کوئی ذمہ داری۔ مجھے دیکھیے کسی دن جیل خانے بھیجا جا سکتا ہوں۔ مجھے اُن کی منطق نصیب نہ ہوئی، لیکن اُن کی عادت ضرور ملی ہے اور عادت اور خواہش کو یوں بھی کسی منطق کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بات دراصل یہ ہے کہ جن اُمیدواروں نے مجھے اپنا ایجنٹ بنایا تھا وہ اپنے لیے ووٹ ہی نہیں چاہتے تھے کتنے اور کام بھی سپرد کر دیتے تھے۔ مثلاً کوکین فراہم کرنا، لڑکی لڑکے کا رشتہ تلاش کرنا، رشتہ داروں میں کسی کو امتحان میں پاس اور کسی کو فیل کرانا، چوری کے مال کی خرید و فروخت، کوئی تیر بہ ہدف دوا یا مجرب خضاب وغیرہ! لیکن کام شروع کرنے سے پہلے میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ میں خود بھی الیکشن میں کیوں نہ کھڑا ہو جاؤں! جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ جھگڑوں کا عجیب خاصہ ہے کہ جب ضرورت سے زیادہ ہو جاتے ہیں تو ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا پاش پاش ہونے لگتے ہیں۔ البتہ یہ شرط ہے کہ جب یہ ٹکرا رہے ہوں تو آپ کترا رہے ہوں۔ الیکشن میں اُمیدواری کا اعلان کر دیا۔ نیت یہ تھی کہ وقت آنے پر اپنی اُمیدواری کسی دوسرے کے حق میں بیچ دوں گا۔ چنانچہ ایک پارٹی سے ٹکٹ بھی مل گئے۔ قباحت صرف اتنی تھی کہ پارٹی میں ٹکٹ زیادہ تھے ووٹر کم۔ میں نے اس کی بھی پروا نہ کی، لیکن میرے پروا کرنے نہ کرنے کا اتنا سوال نہ تھا جتنے میرے دشمنوں کا جنھوں نے اس امر کی کوشش شروع کر دی کہ میں منتخب بھی ہو جاؤں جب بھی میرا زرِضمانت ضبط کر لیا جائے۔ دلیل یہ پیش کرتے تھے کہ اگر میں منتخب ہو گیا تو نہ زر کی اہمیت رہ جائے گی نہ ضمانت کا کوئی احترام۔ میں نے کچھ فقرے تصنیف کیے جو الیکشن میں بہت اہم ہوتے ہیں۔ ان نعروں کا حال بعینہٖ ایسا ہے جیسے بعض اشخاص کو جانوروں اور پرندوں کی آواز کی ہو بہو نقل اُتارنے کی مشق ہوتی ہے۔ شکارگاہ میں جا کر انھوں نے یہ آوازیں نکالنی شروع کیں اور جانور ہجوم کر کے آئے اور شکار ہو گئے۔ ان نعروں کا مفہوم کچھ ہو مقصود کچھ اس قسم کا تھا۔ مثلاً درد میرا پیٹ آپ کا، ہاٹ تیری پاٹ میرا، شعر ہمارا مشاعرہ تمھارا، سودا میرا سر آپ کا، خضاب تیرا داڑھی میری، ورثہ میرا، قرضہ تمھارا کام

کر دیا گیا۔ لیکن جہاں کہیں جاتا تھا لوگ مجھ سے بچنا چاہتے تھے اور اپنے بچوں کو خاص طور پر میرے سامنے نہ آنے دیتے تھے اور جو نہیں بچنا چاہتے تھے ان کے تیور دیکھ کر میں بچنا چاہتا تھا۔ میں طبعاً صلح پسند واقع ہوا ہوں، لیکن میرے اس اعتراف سے آپ یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ میں کوئی ایمان دار سبزی خور یا کنبہ پرور قسم کا آدمی ہوں۔ بات یہ ہے کہ جس شخص کے ہاتھ میں سارے ملک کے باشندوں کی جان و مال آبرو کا فیصلہ ہو معرفت اس جھولی کے جس میں میں نے اپنے سارے گاہکوں کے الیکشن مینی فیسٹو ڈال رکھے تھے اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ اس طرح کی سرگرمیوں میں اپنی ذات کے اعتبار سے علاحدہ اور اپنی صفات کے اعتبار سے منہمک رہے۔ چنانچہ میں اپنی ذمہ داری سے قبل از وقت سبک دوش ہو گیا اور دوسروں کے لیے کام کرنے لگا۔ ایک صاحب کے یہاں حاضر ہوا جو یوں تو ٹھیک معلوم ہوتے تھے، لیکن ان کی صورت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی تھی کہ میں حیص بیص میں پڑ گیا۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا گو دکھائی نہ دیتا تھا جیسے ان کے چہرے پر آنکھ، کان، ناک، منہ کے علاوہ کچھ اور عضو بھی تھے جن کی شکل نام یا مقام کا تعین نہیں کیا جا سکتا تھا یا پھر یہ کہ چہرے پر جس عضو کو جہاں ہونا چاہیے تھا وہاں سے ہٹا ہوا تھا یا ہٹار ہتا تھا۔ میں نے ایک اُمیدوار کی سفارش شروع کی تو انھوں نے نوکر کو کچھ اس طرح آواز دی کہ کان کھڑے ہونے کے ساتھ میرے جسم کے سارے رونگٹے بھی کھڑے ہو گئے! میں نے بات کا رُخ بدل دیا اور عرض کیا کہ میرے پاس خاندانی اطبا کے کچھ مجربات بھی ہیں۔ بولے، کیا مطلب ہے اس کا؟ میں نے عرض کیا۔ حضور اطبا تو خاندانی تھے، لیکن ان کے مجربات کا نشانہ خاندان کے باہر کے لوگ تھے۔ موصوف ڈھیلے پڑ گئے اور بولے۔ آپ نے پہلے کیوں نہیں کہا؟ اتنے میں نوکر آ گیا جس کو دیکھ کر محسوس ہوا کہ میرے رونگٹوں نے جو تعظیم دی تھی وہ لاحاصل نہ تھی۔ میں نے دوا کے بارے میں خطبۂ افتتاحیہ شروع کیا اور کہا۔ یہ شیشی ملاحظہ ہو۔ پہلے اس کا ایک لاطینی نام تھا جو حلق سے نہیں اُترتا تھا، اب اس کا نام روپ پچھاڑ رکھ دیا جو ذہن سے نہیں اُترتا۔ اس کے موجد نے اس میں ایک عجیب صفت یہ رکھی ہے کہ یہ مرض سے اتنا سروکار نہیں رکھتی جتنا مریض سے۔ موجد کا کہنا یہ ہے کہ مریض پیدا کرو۔ مرض خود بخود وجود میں آ جائے گا۔ بعض لوگوں کے امراض اتنے قبیح اور طبیعت اتنی خبیث ہوتی ہے کہ طبیب اُن سے

پناہ مانگتا ہے اور بعض طبیب ایسے ہیں جن سے مریض پناہ مانگتے ہیں۔ یہ دوا ان تمام دشواریوں کو دور کر دیتی ہے۔ یہ اعضائے رئیسہ کے افعال تک بدل دیتی ہے۔ مثلاً کوئی عضو کسی ایک فعل سے معطل ہو گیا تو اس کے کسی دوسرے عضو کا فعل تفویض کر دیتی ہے اور عضو معطل کے سابقہ فعل کو کسی دوسرے عضو کے سپرد کر دیتی ہے۔ اس طور پر اس نے وظائف الروٗسا میں انقلاب عظیم برپا کر دیا ہے۔ میرے شین قاف اور عربی کے جرثقیل سے صاحب خانہ کچھ ڈھیلے پڑتے معلوم ہوئے اور ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے رعب کے عربی تلفظ میں عین کا جو حصہ تھا وہ مجہول کی طرف جھک گیا ہے۔ ایک گٹھے اور منجھے ہوئے سیاس کے ناقابل گرفت انداز میں فرمایا کہ عربی میں دوا بیچنے یا سنسکرت میں بھیک مانگنے کا جو انداز تمہاری گفتگو کا ہے وہ تبت کے بڑے سے بڑے لامہ کی سنجیدگی میں خلل ڈال سکتا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ بعضوں کو خضاب سے دلچسپی ہوتی ہے۔ کیا یہ دوا اُن کی حاجت بھی رفع کر سکتی ہے۔ میں نے کہا جی ہاں! اس کی قرارداد مقاصد میں رفع حاجت بھی ہے، لیکن چوں کہ حال ہی میں ایجاد ہوئی ہے اس لیے اس میں تجربے کی تھوڑی سی کمی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ اپنے الہڑپنے میں بالوں کو لیے ہوئے بالوں ہی کے راستے باہر نکل گئی یا بالوں کو سیاہ کرنے کی بجائے قلب کو سیاہ کر گئی اور چوں کہ خضاب استعمال کرنے والوں کی نیت حاکموں کی طرف سے بالعموم اور عورتوں کی طرف سے بالخصوص صاف نہیں ہوتی، اس لیے اُن کا یہ انجام ہماری ہمدردی کا مستحق نہیں۔ خضاب کے جواز میں شاید یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس سے کفار پر رعب رہتا ہے۔ ممکن ہے اس لیے بعض احباب سرخ کافروں پر رعب رکھنے کے لیے سرخ خضاب استعمال میں لاتے ہوں اور کالا خضاب کالے کافر کے لیے ہوتا ہو، مگر حضور والا کچھ ہی ہو خضاب کی فروخت اور فروغ میں قرآن کے کافر کا اتنا دخل نہیں جتنا غزل کے کافر کا۔ صاحب خانہ نے غضب ناک ہو کر فرمایا، دین متین کے ساتھ یہ بے ادبی! میں نے مری ہوئی آواز میں عرض کیا۔ جناب والا! یہ دین متین کے ساتھ بے ادبی نہیں 'دیوانِ غالب' کی طرف اشارہ تھا۔ انھوں نے گرج کر آواز دی۔ ''کوئی ہے؟'' میں نے کہا ''حاضر ہوتا ہوں۔'' (حیدرآباد کے مفہوم میں دفع ہوتا ہوں) اور قبل اس کے کہ نوکر مجھ تک پہنچ چکا تھا، الیکشن مینی فیسٹو کا ایک بنڈل بدحواسی یا بے تکلفی میں وہیں چھوڑ گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ اس کے

اوراق کھڑکی کے راستے سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آ گئے، لیکن علامہ اقبال کو یاد کر کے سنبھلا اور فرطِ افتخار سے چلاّ اُٹھا! سڑک پر ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں پمفلٹ میرے۔ آگے بڑھا تو ایک پرانے ساتھی ملے، معلّمی کرتے تھے۔ جی اُکتا جاتا تو اسٹرائک کرتے اور دونوں سے بے زار ہو جاتے تو اولاد پیدا کرنے لگتے۔ مہارشی ٹیگور نے کہیں کچھ اس طرح کی بات کہی ہے کہ جب کبھی دو بچے کو دیکھتے تھے ـــ تو یہ محسوس کرتے تھے کہ خدا ابھی انسانوں کی طرف سے مایوس نہیں ہوا ہے۔ میں اپنے اس معلّم دوست کو دیکھتا تھا تو عجیب تذبذب میں پڑ جاتا تھا کہ جس قسم کی اور جس شرح سے یہ اولاد پیدا کر رہے تھے اس سے منعمِ حقیقی کے تاثرات ان کی طرف سے کیسے ہوں گے اور یہ نہ بھی ہو تو دوست کو کیسے سمجھایا جاتا کہ ان جیسے والدین کو دیکھ کر خدا معصوم بچوں کی طرف سے نہیں بہت سی اور باتوں سے بھی مایوس ہو سکتا تھا!

یہ معلّم دوست کتنے ہی نالائق لڑکوں کے ٹیوٹر تھے۔ ان کے دولت مند والدین کے میلے کپڑے بھی دھوبی کو دے آتے اور واپسی میں اپنی بکریوں کے لیے درخت سے پتّیاں توڑ لاتے۔ یہ ایک امتحان میں ممتحن تھے۔ انھوں نے بڑے تپاک سے سلام کیا اور مصافحہ کرنے کے درپے ہوئے۔ میں نے ان کو سینے سے لگا لیا۔ انھوں نے کھانے پر مدعو کیا۔ میں نے ان کے گھر بستر ڈال دیا۔ انھوں نے سارا کام چھوڑ کر میری مدارات شروع کر دی۔ میں نے ہر تکلف یا غیرت کو بالائے طاق رکھ کر سگریٹ، چائے، بھنگ، ٹکٹ، لفافے، جائے نماز، دانت کھودنے کے لیے جھاڑو کے تنکے، اسپغول کی بھوسی، معجون، آڑو خرما کی فرمائش کر دی، اور یہ بھی کر دی، اور ہو سکے تو محلّے کے کسی موڈرن خاندان سے فلمی گانوں کی کوئی کتاب بھی مانگ لائیں۔ موصوف نے اپنے بے شمار بچوں کو ان کے پیار کے نام سے جو تمام چینی جاپانی پراکرتوں سے ماخوذ معلوم ہوتے تھے پکارنا شروع کیا اور مجھے اندیشہ سا ہونے لگا کہ وہ اپنے بچوں کو بلا رہے تھے۔ یا جناتوں کو طلب فرما رہے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کوئی سات آٹھ عدد بچے نمودار ہوئے۔ ہر شکل ہر عمر ہر صحت ہر سائز اور ہر مارکہ کے۔ میزبان نے ان کا تعارف کرایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ اگر ان کا موجودہ ننھیالی رشتہ نہ ہوتا تو اس میں سے ہر ایک سینما اسٹار یا اسٹالین ہوتا یا مریخ پر پہنچنے کے لیے مرن برت رکھتا!

ان بچوں نے آتے ہی جلدی جلدی ٹیڑھی میڑھی صف قائم کی اور آنکھ بند کر کے ہاتھ جوڑا اور جی چھوڑ کر میرے خیر مقدم میں 'لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری' گانا شروع کر دیا۔ میزبان نے معلوم نہیں کیا میرے چہرے سے بھانپا کہ ایک دستی پنکھے سے میرے منہ پر ہوا جھلنی شروع کی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان مکھیوں کو اُڑانا چاہا ہو جو غیر معمولی تعداد اور ترنگ میں میرے چہرے کے آگے پیچھے چہل کر رہی تھیں۔ گارڈ آف آنر ختم ہوا تو میں نے سب سے کمزور اور کثیف بچے کا بوسہ لیا اور اس کی معرفت ان کی والدہ کو اپنا سلام بھجوایا۔ پھر یہ خیال کر کے کہ موصوفہ میرے درود کے اعزاز میں ان کو پیٹنے نہ لگ جائیں ہر ایک کے ہاتھ پر ایک ایک اکنی رکھی۔ بچے قطار باندھ کر کمرے سے باہر نکل گئے تو میں نے بے تکلفی کی ابتدا کی یعنی ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ زور ہی کی ایک دھپ دوست کو لگائی۔ پھر ایک موٹی سی گالی دی اور ان کے سگریٹ کے ڈبے سے تین چار سگریٹ نکال لیے۔ ایک سلگایا اور بقیہ نظر کے سامنے اور ہاتھوں سے قریب رکھے، دو تین کش لگانے کے بعد اپنی چند جسمانی اور قوم کی بے شمار اخلاقی بیماریوں کا تذکرہ شروع کر دیا۔ جواب میں انھوں نے میرے لیے اپنی آزمائی ہوئی مقویات مہلات بتائے اور قوم کے مستقبل اور مغفرت پر کچھ صدارتی کلمات ارشاد فرمائے۔ پھر اپنے چند ایسے جرائم کی طرف اشارہ کیا جو قابلِ دست اندازیٔ پولیس تھے۔ میں نے ان سے نجات دلانے کے لیے رشوت کی رقوم کا حساب لگا کر ان کو بتایا انھوں نے مروجہ طریقۂ تعلیم کے نقائص بتائے تو میں نے امتحان کے مہمات جتائے اور یہاں پہنچ کر میں نے اپنے اُمیدوار کی طرف اشارہ کیا جس کے نمبر بڑھانے تھے، لیکن وہ اس طور پر چوکنے ہوئے جیسے میں ان سے عشق جتاتے جتاتے اجمیر شریف تک پہنچنے کا کرایہ مانگ بیٹھا۔ میں نے بے تکلفی کو ناکافی سمجھ کر بے ہودگی کا سہارا پکڑا اور کہنے لگا کہ اس لڑکے کا باپ کسٹوڈین کے دفتر میں منشی، چچا خفیہ پولیس میں جمعدار اور ہونے والے خسر ایک مذہبی اخبار کے ایڈیٹر ہیں۔ لڑکا فیل ہو گیا تو تم جانتے ہو تمھارا انجام ان رشتہ داروں کے ہاتھوں کیا ہوگا۔ میزبان آبدیدہ ہو گئے اور کچھ اس طرح کے کلمات زبان پر لائے جیسے دم واپسیں بر سر راہ ہو اور مجھ سے مرن برت رکھنے کے متوقع ہوں۔ میں نے کچھ اس طرح کی باتیں شروع کر دیں کہ اُن کا غم غلط ہو یا نہ ہو میرا مطلب فوت نہ ہو۔ انھوں نے رونے کے ارادے سے

فراغت پائی تو آوسرد کی طرف رجوع فرمایا اور بولے بھئی کیا کروں تم نے ایک فرمائش کی۔ وہ مجھ سے پوری نہ ہو سکی، تمھاری عمر اور میری صحت دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ ہم دونوں پھر کبھی ایک دوسرے کے کام آسکیں گے۔ بات یہ ہے کہ تم نے پہلے نہ کہا ورنہ میں کاغذات روک لیتا۔ جنھیں میں نے آج ہی ٹیبو لیٹر کے پاس بھیج دیا۔

(مطبوعہ: ساقی، دہلی)

●●●

لُر

کرسمس کا زمانہ تھا جب انگریز کیک اور ہندستانی سردی کھاتا ہے، بارش ہورہی تھی، ہوا تیز وتند، سردی نہیں کپکپی کا عالم تھا۔ رات تاریک جیسے تارکول کا سمندر یا بھوکے بھیڑیے کا کھلا ہوا منہ۔ بیوی بچوں سے جو کچھ بچا تھا وہ جسم پر لپٹا ہوا تھا، پارسال کی روئی دار مرزئی تیرس کے سال کا سوئٹر اور مفلر اس سے پہلے کا کمبل اور محاذِ جنگ سے پلٹا ہوا چٹر، دو دو موزے ایک دوسرے کے پردہ پوش، انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ سب لوگ اس اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہیں گویا نہ یونیورسٹی تھی اور نہ پولیس، نہ بیوی تھی نہ انفلوائنزا ایک سکوت کا عالم تھا۔ معلوم ہوتا تھا ہر شخص اپنے جذبہ اور میلان کے اعتبار سے ایک فردِ واحد ہے اور وہ بھی ایسا جس نے چھوٹے چھوٹے قرضوں کو ایک بڑا قرض لے کر ادا کر دیا ہو، بھوک لگی نہ ہو اور قضائے حاجت کے لیے اُٹھنا نہ پڑے، مختصر یہ کہ جس پر بیوی اور اللہ میاں دونوں مہربان ہوں۔

کمرہ باہر موسم اپنی تمام تر آشوب ناکیوں کے ساتھ مصروف کارزار تھا اور ہم اس عافیت کے ساتھ اپنے کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے تھے گویا اس سے بڑھ کر موسم کی توہین کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں تھا۔ اسی زمانہ میں وائسرائے اور سینا کلاز اپنے اپنے محافظین اور مقربین کے ساتھ کلکتہ میں رونق افروز ہوتے ہیں اور مہاتما گاندھی اپنی تمام چرخہ زائیوں یا ہندستانیوں کے ساتھ کہیں اور ہوتے ہیں پھر مسٹر کیررا اور مسٹر پٹیل کے ہوتے جب وائسرائے بالقابہ کلکتہ جاسکتے

ہیں تو پھر ہم کو بیوی بچوں کی کیا پرواہو سکتی تھی۔ ایک کرسی پر تکیہ لگائے ہوئے اور ربڑ کے حلقے پر جس کے اندر ہوا بھری ہوئی تھی، اس طور پر بیٹھے تھے گویا

سری گنیش اشمہ!

اتنے میں یخ سیال کا ایک زبردست جھونکا، سوکھی پتیوں، بجلی کی چمک اور بادل کی گرج کے ساتھ، کواڑ کو زور کا دھکا دیتا ہوا اس تیزی اور تندی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا گویا ساری چٹخنیاں اور چولیں پاش پاش ہو جائیں گی۔ لیمپ گل، حواس غائب، مرشد نے پکارا ''ایک نعرۂ حیدری''۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا ''یا حسین!''

خلفشار کم ہوا دیا سلائی جلائی گئی تو دیکھتے ہیں حاجی بلغ العلا[1] بہ شکل سینٹا کلاز وارد ہیں بس یوں سمجھ لیجیے کہ ایک داڑھی اور ایک کمبل پر حاجی صاحب اس طور پر مسلط ہیں جس طور پر سارے ہندوستان پر یونین جیک۔ جہاں تک حاجی صاحب کے حلیہ کا تعلق ہے بہت کم لوگ اس راز سے آشنا ہوں گے کہ فی الحقیقت داڑھی اور کمبل حاجی صاحب پر مسلط نہیں ہوتے، ایسی عام شکلیں تو ماگھ میلہ اور غازی میاں کی درگاہ پر کافی سے زیادہ تعداد میں نظر آئیں گی بلکہ خود حاجی صاحب کمبل اور داڑھی پر مسلط ہوتے ہیں۔ یہی فرق حاجی بلغ العلا صاحب فیوضہ اور دیگر قسم کے لوگوں میں مابہ الامتیاز ہے۔

لیکن حاجی صاحب کا تذکرہ آ گیا ہے تو مقتشابہ لگنا بھی بے محل نہیں ہے۔ چنانچہ بعض ماہرین ریاضی کا اب تک خیال رہا ہے کہ جسم کے لیے ابعاد ثلاثہ یعنی لمبائی چوڑائی اور موٹائی کا پایا جانا لازمی ہے، لیکن ریاضی کے بعض جدید الخیال متفکرین کا خیال ہے کہ جسم کے لیے یہ شرائط ناکافی ہیں کیوں کہ اگر یہ شرائط سہ گانہ صرف آئی ہیں تو پھر جسم کہاں اس لیے جسم کے متیقّن کرنے کے لیے جہات سہ گانہ (یعنی لمبائی، چوڑائی، موٹائی) کے ساتھ وقت یا ٹھہراؤ کا پایا جانا بھی لازمی ہے۔

حاجی صاحب ان دنوں قانونِ مسعودی اور رمضان شریف سے اُلجھے ہوئے ہیں، اس لیے ممکن ہے ریاضی و ہندسہ کے اس دلچسپ نظریہ سے باز پرس نہ فرمائیں ورنہ بعید نہ تھا اگر

1۔ مولوی محمد فاروق دیوانہ گورکھ پوری۔ ملاحظہ کیجیے رشید صاحب کا خاکہ ''میر مرحوم عجب تھا کوئی'' مشمولہ ''گنج ہائے گراں مایہ'' حصہ دوم۔ ص:223 مطبوعہ مکتبہ دانیال کراچی۔ مرتبین م۔ ندیم (علیگ) لطیف الزماں خاں

کسی وقت جب کہ ہم بالکل غافل اور خالی الذہن ہوں۔ حاجی صاحب بہ جہات سہ گانہ ہم پر نازل ہو جائیں کیوں کہ اس وقت بھی ان کی آمد یا تو صرف بہ جہات سہ گانہ تھی یا صرف بشرط اولیٰ (یا جہت رابع)..........(فتشابہ انتھیٰ)

ہاں تو پھر حاجی صاحب نظر آئے، لیکن کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ گنگنا رہے ہیں یا فرمائش کرنے والے ہیں یا لیٹ جانے والے ہیں۔ لوگوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔

"آغاہ حاجی صاحب قبلہ"، فرمایا۔

بالم نیا ڈگانگ ڈولے

معلوم نہیں نیا ڈول چکی تھی یا نہیں، لیکن ریش مبارک پر اب بھی اہتزاز طاری تھا، بولے۔

"اور کیوں جی تم میں سے کوئی جانکی بائی سے واقف ہے؟"

قاضی صاحب[1] نے مصلّے پر سے سلام پھیرا۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مرشد نے کہا۔

"کوئی نہیں قاضی صاحب یہ تو حاجی بلغ العلا تشریف لائے ہیں۔"

قاضی صاحب نے ایک ایسے لہجہ میں جس میں خشیت، خشونت اور خفت سب آہنگ تھیں، فرمایا۔

اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِن شُرُورِ اَنفُسِنَا وَ مِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا..... الخ

حاجی صاحب نے دریافت فرمایا۔

"کس مسئلہ پر غور کر رہے تھے؟"

کہ ایک طرف سے آواز آئی۔

---

1. قاضی جلال الدین صاحب مرادآبادی مرحوم۔ ملاحظہ کیجیے "پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ" فکر و نظر علی گڑھ۔ جولائی 1962، ص: 62 تا 67

''بھائیو، اپنی اپنی ٹانگیں اُٹھاؤ آسمان گرا پڑتا ہے۔''

سنتے ہی مرشد ہنکارے۔

''بم مہادیو، ٹن گنیش۔''

میں نے پوچھا۔

''ان دونوں میں کوئی فرق بھی ہے؟''

فرمایا۔

''مسلم لیگ اور مہا سبھا کا۔''

اصغر صاحب[1] بولے۔

''نہیں لکھنؤ اور لاہور کا۔''

حاجی بلیغ العلا نے گردن کو جھٹک کر کہا مہمل۔

''مس میو اور جان بل کا۔''

جگر صاحب[2] نے وجد میں آ کر کہا۔

''ہائے کچھ نہیں، تیرا اور میرا۔''

قاضی صاحب نے فرمایا۔

''چائے — پانی کا۔''

گھر میں سے بڑی بی ہانپتی کانپتی آئیں، کہا۔

''میاں، بیوی!!''

سب نے یک زبان ہو کر تصدیق کی بالکل ٹھیک۔

''میاں، بیوی کا۔''

---

1 اصغر گونڈوی مرحوم ملاحظہ کیجیے۔ ''حضرت اصغر گونڈوی مرحوم'' گنج ہائے گراں مایہ، حصہ اوّل، ص:117، مطبوعہ فرینڈز پبلشرز، راول پنڈی 1951

2 ملاحظہ کیجیے ''تری یاد کا عالم'' گنج ہائے گراں مایہ، حصہ دوم، ص:135، مکتبہ دانیال کراچی، مرتبہ: مہر الٰہی ندیم (علیگ) لطیف الزماں خاں۔

حاجی صاحب بولے۔

''اماں، کوئی مضمون نہیں لکھتے؟''

میں نے کہا۔

''کیا اور کس پر۔''

کہنے لگے اسی جملہ پر

''اپنی اپنی ٹانگیں اُٹھاؤ آسمان گرا پڑتا ہے''

میں نے کہا۔

''یہ کیا تھا؟''

کہنے لگے۔

''اعلانِ جنگ بھی اور اعترافِ شکست بھی۔''

میں نے کہا۔

''کس کا؟''

فرمایا۔

''اُر کا۔''

میں نے کہا۔

''اچھا یہی سہی تو پھر درویشوں کے تجربہ میں جس جس قسم کے اُر آئے ہوں سنائیں۔''

حاجی صاحب یک لخت قالین پر سے مسند پر بیٹھ گئے، فرمایا۔

''بالکل ٹھیک۔ میں پریسیڈنٹ ہوں۔''

....

حاجی صاحب نے مرشد کی طرف داڑھی اور آنکھ کو حرکت دی اور مرشد نے پہلو بدلا۔

ناانصافی ہوگی اگر مرشد کا بھی لگے ہاتھوں ناظرین سے تعارف نہ کرایا جائے۔

حاجی بلغ العلا اگر برق آور دتھے تو مرشد بھی کم و بیش بادآور دتھے۔ موصوف کے آنے سے پہلے لوگ کچھ سرمازدہ سے ہو رہے تھے کہ اتنے میں کمرہ کا کواڑ کھلا اور آپ اس طور پر ڈرتے

جھجکتے ہوئے داخل ہوئے اور داخل ہوتے ہی سارے مجمع پر چھا گئے جیسے کبھی انگریزوں کی آمد ہندوستان میں ہوئی ہوگی۔

فرمایا۔

''آپ لوگ بھی عجیب ہیں آج اسٹیشن پر نہ کوئی تانگہ ملا اور نہ یکہ، سردی اس بلا کی پڑ رہی ہے اور میرے پاس نہ چھتری نہ کمبل۔''

میں نے کہا۔

''آپ کے یہ اعتراضات بحیثیت ممبر کورٹ ہیں تو خیر سنگ آمد وسخت آمد۔ ورنہ جہاں تک میرے حافظہ یا ہمت کو دخل ہے ارباب کمیشن نے ہم پر کہیں یہ اعتراض نہیں کیا ہے کہ اسٹاف والے تانگہ نہیں چلاتے یا ان میں اس کی صلاحیت نہیں ہے یا موسم کو غیر معتدل رکھتے ہیں، یا مسکین اور ناداروں کو کمبل اور چھتری نہیں تقسیم کرتے۔''

طیش میں آ کر فرمایا۔

''یہ خوش فکری! اگر دہ نباشد کہ میڈیکل کالج کی نذر کر آئے۔ کمیشن کی رپورٹ میں ان باتوں کا صاف صاف تو بے شک کہیں تذکرہ نہیں ہے، لیکن ایک مد ایسی ضرور ہے کہ اگر بروئے کار لائی گئی تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تانگہ چلانے والے کی پوزیشن کافی قابلِ رشک ہے اور جاڑے میں بارش کا ہونا اور کمبل اور چھتری سے محروم رہنا کیا معنی رکھتا ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!''

تھوڑی دیر کے لیے میں بھی بھول گیا کہ وہ کہاں تھا اور عقل کہاں؟ میں نے کہا:

''چہ خانہ باشد، قبل از مرگ واویلا تو کچھ ان کو آپ پر بیتی کرتے ہوں گے۔ کمیشن کی جس مد یا سفارش کا آپ حوالہ یا دھمکی دیتے ہیں وہ رپورٹ میں اتنا واضح نہیں ہے جتنا ہمارے اردو کے ایک شعر میں ہے، جو کورس میں بھی داخل ہے۔

نہ اتنا برشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی[1]

---

1 غالب

آپ تو چشمِ بد دور اُس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جو ہمارے آقا ہیں اور ماشاءاللہ غالبؔ سے اتنی اُلفت رکھتے ہیں کہ دیوان غالبؔ کا بہترین پاکٹ ایڈیشن [1] نہایت اہتمام اور انہماک کے ساتھ کاویانی پریس برلن سے شائع کر چکے ہیں۔ کیا اتنا نہیں کر سکتے کہ صرف اس کا ایک شعر ذہن نشین فرمالیں، بجائے اس کے کہ پورا دیوان غالب پاکٹ میں ہو یہ کہیں بہتر ہے کہ اس کا صرف یہ شعر۔

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں

پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

دماغ میں ہو۔'' اتنا سننا تھا کہ قاضی صاحب نے لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ارے میاں خاموش نہ وقت دیکھتے ہو نہ آدمی، خطائے بزرگاں گرفتن خطاست۔''

حاجی بلغ العلا صاحب نے فرمایا۔

''ابھی تم بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئے، سنا تو ہوگا۔''

نصیحت گوش کن قاضی کہ از ماں دوست تر دارند

مریضانِ خلافت فنڈ پنڈ ''پیر'' و ''مرشد'' را

قاضی صاحب نے تیوری بدل کر فرمایا۔ ''میاں فاروق، تم بھی لونڈوں میں مل گئے۔ ذرا وقت کی نزاکت کا تو خیال کیا ہوتا۔ صورت دیکھیے تو سقراط اور حرکات دیکھیے تو ظہور وارڈ۔ لاحول ولاقوۃ (لہجہ بدلتے ہوئے) ارے میاں رشید، ڈاکٹر صاحب کی مخلصانہ نصیحت کو تم نے کچھ اور سمجھ لیا۔ ان کا مطلب بالکل وہ نہ تھا جو تم نے سمجھا۔ وہ بھلا کب ہم سے باہر ہو سکتے ہیں۔ اجی ڈاکٹر صاحب ان کو تو معاف ہی کر دیجیے وہ ابھی بیماری سے اُٹھے ہیں۔ آپ سے تو ہم سب آپ کے زمانۂ طالب علمی سے واقف ہیں آپ کی یونین کی وائس پریسیڈنسی آپ کی جادو بیانی اور آپ کی سینئر پریامٹیری پر اب تک ہم سب عش عش کرتے ہیں۔ آپ تو ایس ایس ایسٹ ہی میں رہتے تھے، شاید 28 نمبر کے کمرے میں۔ رشید صاحب وہی کمرہ جس میں انس صاحب رہتے تھے جس کا آج کل میں وارڈن ہوں۔''

1. ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم نے جرمنی کے دورانِ قیام دیوانِ غالبؔ 1925 میں شائع کرایا تھا۔

میں نے کہا۔

"جی جی بس اب رہنے دیجیے، آپ میرے بزرگ ہیں اور استاد بھی۔ اور یہ سبق بھی میں نے آپ ہی سے سیکھا ہے۔ آپ کو وہ مضمون بھی یاد ہے جو آپ نے انھیں بزرگ کے ہم قوم کے آرٹیکل کے جواب میں مدینہ[1] میں شائع کرایا تھا۔ آخر اس کی بنا کیا تھی؟

آپ تو ماشاءاللہ مجھ سے زیادہ مسن بھی ہیں اور تندرست بھی۔ پھر اگر مجھے حرارت آ گئی تو آپ ڈاکٹر صاحب کے کمالات پر خطبہ کیوں دینے لگیں اور پھر خطبہ کی کیا ضرورت ہے کیا محض ممبر کورٹ ہونا کافی سے زیادہ نہیں ہے؟"

ایک طرف سے آواز آئی۔ شاید حاذق صاحب[2] کی تھی۔

درود ے می تواں گفتن بجود ے می تواں کردن!

لیکن اگر حاذق صاحب کو اس سے انکار ہے تو پھر سمجھ لیجیے میرے ہی کان بج رہے تھے۔

قاضی صاحب گلا صاف کر کے کچھ فرمانے ہی والے تھے کہ مرشد نے پکارا۔

"کھیل ختم پیسہ ہضم!"

کوئلے منگائیے، چائے لائیے، بستر مہیا کیجیے، آئینہ کنگھا لائیے، ایک لوٹا گرم پانی، جگر صاحب کچھ ارشاد ہو۔ اقبال[3] وغیرہ کہاں ہیں؟ آپ کا زخم کیسا ہے؟ گھر میں سلام کہلا دیجیے، سالن زیادہ اور مرچیں کم ہوں۔ حاذق صاحب کی کچھ مقویات منگائیے، اصغر صاحب اپنے اشعار کی بیاض لائیے۔ زکام کھانسی کی دوا منگائیے۔ آپ لوگ مسز حمید سے واقف ہیں؟ عظمت صاحب سے کہیے ایجنڈا لائیں۔ خاں صاحب آپ کا موٹر تو ٹھیک ہے؟ آج کا اخبار بھی مل سکے گا؟ ایک لوٹا پانی فوراً لائیے۔ غسل خانہ کدھر ہے اور ہاں اس وقت خط بنوانے کا بھی سامان ہو سکتا ہے؟"..... سوالات اور فرمائشات کے اس ماگھ میلہ میں کس کو یارائے زباں درازی ہو سکتا تھا، چنانچہ مرشد نے غسل خانہ میں تخلیہ کیا اور تھوڑی دیر کے لیے ہر شخص ایک دوسرے کا منہ اس طور پر تکنے لگا گویا ہر ایک دوسرے کو بے وقوف سمجھتا تھا۔

---

1. ایک روزنامہ۔ 2. مرحوم حکیم عبداللطیف صاحب، پرنسپل طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

3. اقبال رشید صدیقی، رشید صاحب کے سب سے بڑے صاحب زادے، کراچی میں مستقل قیام ہے۔

غسل خانہ سے گنگنانے کی آواز آئی معاً دروازہ کھلا اور مرشد شاداں وفرحاں برآمد ہوئے، انگیٹھی اور چائے موجود تھی۔ قاضی صاحب نے فرمایا۔

''کہیے ڈاکٹر صاحب موسم غیر معمولی طور پر غیر معتدل ہو رہا ہے۔ سفر میں تو غیر معمولی زحمت ہوئی ہوگی۔

فرمایا۔

''جناب علی گڑھ اسٹیشن تک تو ٹھکانے ٹھکانے چلا آیا۔ یہاں آ کر البتہ معلوم ہوا کہ موسم قطب شمالی کا ہے اور یونیورسٹی مسلمانوں کی ہے۔ نہ تانگہ......'' اصغر صاحب بولے۔

''دیکھئے ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی اور تانگہ کا پھر خلط مبحث ہو رہا ہے......''

مرشد نے کہا۔

''اصغر صاحب، رشید صاحب کی عصبیت پر نہ جائیے آپ تو شاعر اور بفضلہٖ اُن چند شعرا میں سے ہیں جو بعض دوسرے شعرا کو اپنے سے بہتر مانتے ہیں یا مان سکتے ہیں سنا ہوگا۔

مقصد ہے ناز وغمزہ و لے گفتگو میں کام　　چلتا نہیں ہے دشنۂ و خنجر کہے بغیر [1]

رشید صاحب کا کیا وہ تو شروع سے سمجھ چکے ہیں کہ ذاکر حسین خاں اندوہ گینیاں چڑی گوئیاں گل چینیاں۔ پن پن زائیاں وغیرہ لکھنے پر قادر نہیں ہیں ان کی تعریف کیجیے تو ہنستے ہیں اور اس طور پر گویا تعریف کرنے والا احمق ہے نہ کیجیے تو مرض کی آڑ پکڑ کر جھلاتے ہیں۔ حالاں کہ دونوں حالتوں میں حماقت انھیں کی متیقن ہوتی ہے۔''

میں نے کہا۔

''اچھا میری حماقت تو متیقن اور اظہر من الشمس ہے اسٹیشن سے یہاں تک آنے میں جناب نے جس ذوق سلیم اور اصابت فکر کا ثبوت دیا ہو اس کا تذکرہ کیجیے۔''

کہنے لگے، ''ٹرین سے اُترا بیگ، کمبل و دو گوش، اوّل تو اس قلی سے سخت ندامت ہوئی جو بے تابانہ میرے کمپارٹمنٹ میں اسباب اُتارنے کی اُمید و نیت سے داخل ہوا۔ یہاں کیا دھرا تھا؟ کمبل ہم پر اور دونوں ہاتھ خالی جیبوں میں، لیکن اس نے جس انداز سے مجھے دیکھا یا گھورا

1 غالب۔

(جلدی میں یا مصلحتاً میں اس کو متعین نہ کر سکا) اس سے صاف پتہ لگتا تھا کہ اس کے نزدیک میرے پاس اسباب ممکن ہے رہا ہو یا نہ ہو ٹکٹ یقینی نہ تھا یا پھر جس بدحواسی سے میں ڈبہ سے باہر آیا اس سے تو قلی کو ضرور یقین ہو گیا ہوگا کہ ممکن ہے ٹکٹ ہو، لیکن اس درجہ کا کبھی نہ ہوگا جس میں سے برآمد ہوا۔ میں کسی قدر خجالت و خشونت کے ساتھ پھاٹک کی طرف روانہ ہوا۔ واپسی کا ٹکٹ تھا۔ مسافروں کا ہجوم، میں نے سوچا پھاٹک پر ٹھہر کر ٹکٹ بابو کو اپنے آپ کو اور سارے مسافروں کو زحمت دینے کے بجائے خود ہی ٹکٹ کو کیوں نہ دو حصوں میں تقسیم کر دوں آمد کا دے دوں گا، واپسی کا رکھ لوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، لیکن اس وقت غسل خانہ میں دوسرا ٹکڑا گر پڑا تھا، اُٹھا کر دیکھتا ہوں تو معلوم ہوا کہ آمد کا اپنے پاس ہی اور واپسی کا ٹکٹ بابو کے پاس۔"

حاضرین نے مختلف جذبہ کے ساتھ اس واقعہ کو سنا۔

اے ماشاء اللہ لاحول ولاقوۃ۔ چہ چہ چہ، قہ قہ قہ۔ ہی ہی ہی کسی نے کہا جلیل صاحب کو اطلاع دی جائے۔ کسی نے خلاف کمیٹی سے رجوع کرنے کی رائے دی، کسی نے پولیس کو اطلاع کرنے پر زور دیا۔ جگر صاحب نے کہا۔

"ابھی کوئی دوڑ جائے تو مل سکتا ہے۔"

مرشد نے کہا۔

"یہ کچھ علی گڑھ کے سفر ہی کا کرشمہ ہے اب تک تو یہ ہوتا تھا کہ واپسی کا ٹکٹ یا ویک اینڈ ٹکٹ لے کر آتا تھا اور جب یہاں سے گلوخلاصی ہوتی تھی تو معلوم ہوتا تھا، میعاد گزر چکی ہے۔ پہلے تو خیر دوسروں کی جان کو دعا دیتا تھا آج تو کیا کہوں از ماست کہ بر ماست کا مضمون ہے۔ حاذق صاحب نے بھی جگر صاحب کی تحریک کی تائید کی۔ میں نے ایک پوائنٹ آف آرڈر پیش کیا کہ اس وقت کمرہ سے باہر جانے کے لیے کون صاحب آمادہ ہیں......" قاضی صاحب نے جلدی سے فرمایا۔

"اجی جانے بھی دو جان کا صدقہ مال۔ قدم درویشاں رد بلا......"

خان صاحب بول اُٹھے،" کیوں نہ ہو قاضی صاحب۔ باہر نہ جانے ہی کا عذر نہیں بلکہ طعام و قیام کا بھی بند و بست کر لیا!"

مرشد نے کہا۔

''جانے کو تو میں تیار ہوں لیکن......''

لوگوں نے کہا۔

''نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب آپ کیوں زحمت گوارا فرمائیں۔اس تکلیف سے تو آپ کا آنا ہوا۔ پھر صحت بھی نادرست ہے۔''

مرشد نے فرمایا۔

''نہیں یہ سب کچھ نہیں، میں نہایت آسانی کے ساتھ جا سکتا ہوں......لیکن۔''

لوگوں نے کہا۔

''نہیں نہیں جناب کوئی بات بھی ہو آپ بالکل خستہ ہو رہے ہیں۔''

مرشد نے چمک کر کہا۔

''آپ صاحبان کو میرے ضعف یا پست ہمتی کا صرف مغالطہ ہے آپ فرمائیں تو میں اسی وقت وائس چانسلر کے ہاں تک چلا جاؤں۔''

سارے مجمع میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا اور ہر ایک لپک کر مرشد کے پاس آ گیا۔

''ڈاکٹر صاحب، ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ایسا نہ کیجیے گا کچھ ہو جائے،اس وقت ہم آپ کو وائس چانسلر کے پاس کبھی نہ جانے دیں گے۔''

قاضی صاحب بولے۔

''کیوں میاں رشید کہتا نہ تھا کہ مذاق کا وقت نہیں رہا دیکھا بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی،ٹھیک کہا ہے کسی نے۔

کہ بر من آنچہ کرد آں آشنا کرد!''

حاجی بلیغ العلا صاحب بھی کھلکھلائے،فرمایا۔

''قاضی یہ سارا فتنہ رشید ہی کا جگایا ہوا ہے اور یہ نہیں دیکھتے کس اطمینان اور بلاغت ادا کا اظہار فرما رہے ہیں،آپ کو وہ شعر نہیں تو مصرعہ تو یاد ہی ہوگا۔

کیسا بیٹھا ہے کبوتر مرا اُلو بن کر''

میں نے کہا۔

''مانا یہ سب میرا ہی کرا دھرا ہے، لیکن بات کیا ہوئی مرشد کا نہ پورا جملہ ختم ہونے دیتے ہیں اور نہ پورا ما فی الضمیر پھر معلوم کیسے ہو کہ کیا ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے۔''

لوگوں نے کہا۔

''تم ہی سوال و جواب کر لو۔ ذرا میدان میں تو اُتر آؤ۔''

میں نے کہا۔

''ذرا میدان ہی میرے سامنے کر دیجیے۔''

لوگوں نے چائے کی سینی کھینچی تو معلوم ہوا کہ مرشد بھی اسی کے ساتھ اسی رفتار سے قریب تر ہو رہے ہیں۔ اب میدان اور مرد میدان دونوں مریض کے مقابل تھے۔ میں نے کہا۔

''مرشد میں دیکھتا ہوں سینی اور سینی کے ظروف خالی ہوتے چلے جا رہے ہیں اور آپ ہیں کہ اُس مولوی کے بھی تیور کو شرما رہے ہیں جس نے جمعہ کے دن خط بنوایا ہو اور سنیچر کے دن بچوں کی روح قبض کرنے آیا ہو۔''

کہنے لگے۔

''بھئی میں کیا کروں۔ یہ لوگ خدا جانے کیا سمجھتے رہتے ہیں۔''

میں نے کہا۔

''تو پھر آخر صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔ بات کیا ہے؟''

کسی قدر جھنجھلا کر فرمایا۔

''مجھے آپ نے سمجھ کیا رکھا ہے۔ کیا میں خود اسٹیشن تک نہیں جا سکتا، اور کیا معلوم چائے پی کر میں چلا جاؤں، لیکن!''

لوگوں نے پھر کچھ پہلو بدلنا چاہا، لیکن میں نے کسی قدر ترش رو ہو کر کہا۔

''حضرات اس لیکن کو تو ذرا صاف ہو لینے دیجیے سارا فتنہ اسی ''لیکن'' نے برپا کر رکھا ہے ہاں مرشد لیکن؟ گرج کر جواب دیا، لیکن لیکن لیکن کیا......وہ ''قلی''!!102280

مجمع سے پھر کچھ صدائیں بلند ہوئیں۔

''یہ نہ کہیے۔''

کیوں نہ ہو!

''ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔''

ایک طرف سے آواز آئی۔

''اچھا تو آپ غریب اسٹاف والوں ہی پر شیر ہیں۔''

میں نے کہا۔

''مرشد یہ تو بڑی کرکری ہوئی۔ نان کوآپریشن کے زمانہ میں آپ نہ پولیس سے ڈرے نہ جیل خانہ سے، ایک زمانہ میں آپ ہیضہ اور پلیگ سے بھی نہیں ڈرتے تھے۔ بیوی کو تو آپ کبھی خاطر ہی میں نہ لائے۔ بیوی کا نام سننا تھا کہ چونکے۔''

فرمایا۔

''بھئی ایک بات کر سکتے ہیں؟''

میں نے کہا۔'وہ کیا؟'' کہنے لگے۔

''کل صبح بیوی بچے وطن جاتے ہوئے علی گڑھ سے گزریں گے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی کھانسی زکام کی دوا نہایت مفید اور سریع الاثر ہے۔''

میں نے کہا۔

''یہ کیا؟''

گھڑک کر فرمایا۔

''ذرا صبر تو کیجیے۔ بات ختم نہیں ہوئی اور بیچ میں کود پڑے، آخر یہ کہاں کی تہذیب ہے؟''

میں نے کہا۔

''اچھا اچھا معاف فرمایئے، آپ کے دونوں جملوں کے درمیان کوئی لفظ یا لہجہ یا انداز ایسا نہیں پایا جاتا جس سے دونوں میں کوئی ربط یا نسبت ظاہر ہوتی ہو۔ اس لیے مجھے لامحالہ جملہ معترضہ بننا پڑتا ہے۔''

فرمایا۔

''دیکھتے ہیں موسم کتنا خراب اور خطرناک ہو رہا ہے؟ بیوی بچوں میں سے کسی ایک کو یا سب کو راستہ میں نمونیا ہوگا۔ ایک بوتل اسی دوا کی اسٹیشن بھیج دیتے۔ سب پیتے ہوئے گھر پہنچ جائیں گے۔''

میں نے کہا۔

''اتنے عاقبت اندیش تو پہلے نہ تھے۔''

کہنے لگے۔

''یورپ سے آنے کے بعد کچھ ایسی ہی طبیعت ہوگئی ہے۔''

میں نے کہا۔

''مرشد یہ تو کچھ پروپیگنڈا معلوم ہوتا ہے۔ یورپ سے واپس آکر لوگ سب سے پہلے ہندستانی والدین اور ہندستانی بیوی ہی پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔''

کہنے لگے۔

''بھائی اپنا اپنا تجربہ۔ میرے لیے یورپ جا کر ہندستانی بیویوں کی قدر بڑھ گئی۔''

میں نے کہا۔

''مرشد یورپ جا کر آپ نے عورتوں کے بارے میں کیا رائے قائم کی؟''

''حاذق صاحب بھی ڈلائی اور حقہ کے ساتھ مرشد کے قریب آ گئے اور ہمہ تن اشتیاق نظر آنے لگے اور سارا مجمع اس طور پر ہمہ تن گوش ہوگیا یا ہم سے لے کر حاجی بلغ العلا تک تمام لوگ اسی مسئلہ کی تشریح کے بعد عازم یورپ ہوں گے، ہر طرف سے سوالات کی یورش ہوئی۔''

کسی نے کہا۔

''کیوں ذاکر صاحب وہاں اسلامی طریقۂ نکاح بھی جاری ہے۔''

ایک بزرگ نے فرمایا، ''کیوں صاحب سنا ہے وہاں سے بیوی لائیے تو ہندوستان میں کلکٹر صاحب ناراض ہو جاتے ہیں۔''

ایک دوسرے حضرت بولے۔

''اور کیوں ذاکر صاحب کیا یورپین بیوی پر خرچ زیادہ بیٹھتا ہے؟''

ایک طرف سے آواز آئی۔

"کیوں صاحب اگر کوئی انگریزی نہ جانتا ہو تو اس کی بھی شادی ہو سکتی ہے؟"

ایک صاحب نے خفیف سی سرد آہ کھینچ کر دریافت کیا۔

"کیوں جناب ذاکر صاحب وہاں شادی کے لیے عمر کی تو قید نہیں ہے؟"

ایک صاحب ذرا زیادہ محتاط تھے، بولے۔

"کیوں ذاکر صاحب اس قسم کی تحریک وہاں کیسے کی جا سکتی ہے؟ فرض کیجیے کوئی شخص آپ کا خط لے کر جائے۔"

مرشد گھبرا کر کوئی غیر ذمہ دارانہ فقرہ یا غیر شاعرانہ حرکت کرنے والے ہی تھے کہ مولانا ابوبکر صاحب [1] قبلہ تشریف لائے، سب لوگ کھڑے ہو گئے۔ مصافحہ اور مزاج پرسی میں بیت الغزل سے لوگ محروم رہ گئے۔

کچھ دیر کے بعد مولانا واپس تشریف لے گئے، حلقۂ مریداں پھر سے قائم ہوا۔ مرشد نے فرمایا۔

"اسٹیشن سے باہر آیا تو یکہ نہ پولیس نہ کوئی بھکارنی اور نہ کوئی خوانچہ والا۔ ایک طرف صرف ایک یکہ پر دو بزرگ مراقبہ میں تھے اور یہ مشکل سے پتہ لگایا جا سکتا تھا کہ ان میں سواری کون ہے اور یکہ بان کون۔ گھوڑے اور یکہ کی حالت بھی کچھ ایسی ہی غیر متیقن تھی، فی الفور اس کا تصفیہ کرنا ناممکن تھا کہ یکہ کو گھوڑا کھینچے گا یا گھوڑا کو یکہ۔ چنانچہ اس صورت حال سے فائدہ نہ اُٹھانا صریح حماقت تھی بغیر کسی مزید غور و فکر کے میں بھی یکہ پر جا کر اس طور پر بیٹھ گیا گویا ایک نامعلوم مدت تک کہیں جانے کا قصد نہیں تھا۔ اس دوران میں ایک موٹر زناٹے اور فراٹے کے ساتھ نکلی جس میں تین چار حوّا کی بیٹیاں اور یکے از پسران نوح اس طور پر بیٹھے ہوئے تھے گویا عورتیں ان کو

1۔ مولانا ابوبکر شیث جون پوری محلہ قاضیان میں 1880 میں پیدا ہوئے۔ گلے میں کینسر ہوا۔ 1940 میں انتقال ہوا۔ جون پور میں دفن ہوئے۔ ملاحظہ کیجیے مولانا ابوبکر شیث از صابر صبر حدی ناموران علی گڑھ تیسرا کارواں، جلد اوّل، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ رشید صاحب نے بے مثل خاکہ لکھا۔ ملاحظہ کیجیے، گنج ہائے گراں مایہ۔ حصہ اوّل، ص: 71، مطبوعہ فرینڈز پبلشرز، راول پنڈی 1951

بھگائے لیے جارہی تھیں اور چوں کہ تعلیم یافتہ تھے اس لیے اس اندیشہ سے ملول ہوتے تھے کہ تعزیراتِ ہند میں عورتوں کو لے بھاگنے یا بھگا لے جانے پر باز پرس کی جا سکتی تھی اور جب صورت حال یہ ہو کہ کسی تعلیم یافتہ اور روشن خیال مرد کو تعلیم یافتہ تر اور روشن خیال تر عورتیں لے بھاگیں یا بھگا لے جائیں تو اس بیسویں صدی اور انگریزی حکومت میں کوئی کیا کر سکتا ہے۔

اس درمیان میں دو بندروں میں جو درخت کے اوپر تھے کسی نازک مسئلہ پر اختلاف آرا ہوا۔ ایک کے سینہ سے کوئی ولی عہد چمٹے ہوئے تھے اور چہرہ تمتمایا ہوا تھا دوسرے بزرگ کا چہرہ سنجیدہ، لیکن بیک گراؤنڈ کے بارے میں غالب کا خیال تھا۔

مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلود یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

بہرحال چیخ اور شور کا وہ عالم تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے رعد و برق بھی ماند پڑ گئے۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہی شفق آلود بزرگ ہمارے یکہ کے قریب آ گئے اور اس رکھ رکھاؤ، لیکن ملتجی نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنے لگے کہ ایسا منظر بڑے بڑے ڈرائنگ روم میں بھی بہ مشکل نظر آتا تھا۔ موٹر اور بندر کے خلفشار نے ہماری آمد و رفت زد سے مل جل کر ہمارے دوستوں کو پیام بیداری دیا۔ اتفاق سے میں جن کا ہم دوش ہوا وہ مسافر نکلے، فرمایا۔

''کدھر کا قصد ہے؟''

میں نے کہا۔

''اتنا جلد تو کہیں کا ارادہ نہ تھا، لیکن اگر آپ کی رائے یہی ہے تو بسم اللہ۔''

کہنے لگے۔

''آخر کہاں جایئے گا؟''

(ایک جمائی کے ساتھ جو آدھے ہی راستہ پر ٹوٹ گئی) میں نے کہا۔

''جہاں اور جدھر یکہ لے جائے۔ اتنے میں یکہ بان بھی چونکا گھوڑے نے بھی اپنے غیر یکہ ہونے کا ثبوت دیا اور وہ بھی اس طور پر کہ حفظانِ صحت کی ساری تدابیر اور اصول تھوڑی دیر کے لیے معرضِ خطر میں پڑ گئے۔''

یکہ والے نے کہا۔

''میں تو شہر جاؤں گا۔''

میں نے کہا۔

''میں بھی وہیں چلوں گا۔''

میرے جیوٹ اور سکونِ خاطر کو یکہ والے نے مشتبہ نگاہ سے دیکھا اور کچھ ایسی حرکات کرنے لگا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ مجھ میں بعض جراثیم قابلِ دست اندازی پولیس پائے جاتے تھے، اس ناروا سلوک کا اثر میرے بزرگ ہم یکہ پر پڑا۔ یک لخت چونک پڑے اور کڑک کر فرمایا۔

''مردود ان کی شان میں یہ گستاخی؟ آنکھیں پھوٹ گئی ہیں؟ دیکھتا نہیں خلافت کمیٹی بیٹھے ہوئے ہیں۔ یکہ والے نے بڑے میاں کی اس پُر جوش، لیکن بے سروپا خطابت کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دی اور ایک ایسے لب و لہجہ اور انداز سے جس میں حقارت و حسرت دونوں شامل تھے، بولا۔

''میاں میں تو تمہارے خیال سے سوچ میں پڑ گیا تھا جب تم کو اس ضعیفی میں اپنی جان مال یا آبرو کا خیال نہیں ہے تو میرا کیا۔ چلو سردی پانی سے نہ مرے یوں ہی مرے۔''

میں نے رفع شر کے خیال سے چند آنے پیسے یکہ والے کو نذر کیے اور کہنے لگا۔

''بھائی چل اور جلدی چل۔ علی گڑھ کا خدا ہی مالک ہے جہاں کے یکہ والے بھی کسی ہستی سے ڈر سکتے ہیں۔''

بڑے میاں بولے۔

''مولوی صاحب یہاں کے یکہ بان نہیں پیش امام ذات شریف ہیں، میرے ہی محلہ کے پیش امام کو لے لیجیے، پیش امام کاہے کو ہے پورا تھانہ دار ہے۔ سوا نماز پڑھنے اور اذان دینے کے دنیا بھر کا کام کرتا ہے۔ نکاح پڑھانے نہیں آتا۔ اس کی کمی خود نکاح کر کے پوری کرتا ہے معلوم نہیں کتنی بیویاں اور لڑکے لڑکیاں ہیں جن کی وجہ سے گھروں میں روٹیاں نہیں پکتیں اور مسجد میں نمازیوں کے جوتے، کیوں مولوی صاحب گھروں میں روٹیاں اور مسجد میں نمازی نہ ہوں جب بھی سوراج مل سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔

''جناب والا، سوراج مل سکے یا نہیں یونیورسٹی ضرور مل جائے گی؟''

بہر حال ہمارے دوست انتہائی جوش اور انہاک کے ساتھ، لیکن رازدارانہ انداز سے گفتگو کرتے رہے۔ یکہ چلتا رہا (معہ تمام سامان اور اشخاص ضروریہ و غیر ضروریہ کے) ایسا ہی جیسا کہ مسلمانوں کی انجمن یا تعلیم گاہیں اور ملک چلتے رہتے ہیں یا جس طور پر عشاق کا بیان ہے کہ اکثر ان کے گلے پر خنجر پھرا کرتا ہے۔

شہر آ گیا اور ایک مقام پر ہمارے بزرگ نے یکہ رکوا دیا اور گلی میں ہو لیے یکہ والے نے دریافت کیا ''اور میاں آپ کدھر جائیں گے؟''

میں نے کہا۔

''کالج''

کہنے لگے۔

''تو اسٹیشن ہی پر کیوں نہ کہہ دیا؟''

میں نے کہا۔

''تمہارا کیا بگڑا؟ تم کو یہاں تک کے پیسے دے دیے، رہا کالج جانا اُس کے پیسے یہ لے لو۔''

یکہ والے نے کہا۔

''میں تو کالج نہیں جاؤں گا۔ آج دن بھر کی روٹی کمالی۔ سردی پانی میں جانور کو تکلیف ہوگی۔ گھر میں چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ان کی خبر لوں گا۔''

میں نے کہا۔

''تو پھر میں بھی تمہارے گھر چلوں گا۔''

اس نے کہا۔

''آپ جا کر کیا کریں گے؟''

میں نے کہا۔

''تم جا کر کیا کرو گے؟''

کہنے لگا۔

''میں تو بچوں کی خبر لوں گا۔ گھوڑے کو دانہ گھاس دوں گا اور پھر آرام کروں گا۔''

میں نے کہا۔

''میرا بھی یہی ارادہ ہے۔''

بڈھے نے سمجھا کہ قصہ طوالت بھی پکڑے گا اور دلچسپ بھی ہے۔ اس نے نہایت اطمینان سے اپنے میلے بوسیدہ لباس کے معلوم نہیں کس گوشہ سے ایک بیڑی نکالی اور سلگا کر پینے لگا، پھر کہا۔

''میاں آپ کو مجھ سے مطلب کیا؟''

میں نے کہا۔

''میں اپنا مطلب کیوں بتاؤں؟''

اس نے کہا۔

''تو پھر آپ میرے گھر کیوں جائیں؟''

میں نے کہا۔

''اور کیوں نہ جاؤں؟''

اس نے ایک دفعہ پھر مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا، اور مجھ کو کچھ ایسا معلوم ہوا کہ آج کئی دن کے بعد اُس نے اپنی آنکھوں کو پوری وسعت کے ساتھ کشادہ کیا تھا جس کو بیڑی کے دھوئیں نے پھر چھپا دیا۔ کہنے لگا۔

''تو پھر بیٹھ جاؤ۔''

تھوڑی دیر بعد ہم سب ایک تاریک نمناک اور غلیظ گلی میں پہنچے۔ آگے ایک چھوٹا سا احاطہ تھا جس میں کثرت سے ہر قسم کے درخت کھڑے تھے۔ کہیں کہیں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا جس کی وجہ سے موسم کی تاریکی اور ناخوشگواری اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ درختوں کے اوپر بندر اور کوّے درختوں کے نیچے مرغیاں اور بچے شور مچا رہے تھے۔ درختوں کی پتیوں سے چھن چھن کر بارش کے

قطرے گر رہے تھے جن کی آواز اس شور و ہنگامے سے مل جل کر ایک طرح کا عجیب سماں پیدا کرتی تھی جس کا صرف تصور کیا جا سکتا ہے اور شاید یہ مشکل۔

گھوڑا کھول دیا گیا جو خود آہستہ آہستہ کسی قدر لنگڑاتا ہوا ایک بوسیدہ سی جھونپڑی کی طرف چلا، لیکن اس کے ضعف اور آہستہ خرامی سے یہ پایا جاتا تھا کہ اسے اپنے ناکارہ یا ضعیف ہونے کا غم نہ تھا بلکہ دن بھر کا کام اپنے مالک کی مرضی کے مطابق انجام دینے پر ایک گونہ اطمینانی کیفیت طاری ہے۔ کوٹھری میں سے دو چھوٹی چھوٹی بچیاں یک لخت کلکاریاں لگاتی نیم برہنہ، بے حد لاغر، گھوڑے کی طرف دوڑیں۔ ایک نے گھوڑے کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھولنا شروع کیا۔ دوسری نے پیچھے سے دُم پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا۔ گھوڑا بھی کھڑا ہو گیا اور اس خاموشی اور انداز استغنا کے ساتھ گویا بچیوں کی اس لطف و تفریح میں شریک ہونا بھی اس کے فرائض میں تھا۔ وہ فرائض جن کی انجام یابی بجائے خود ایک انعام ہوتی ہے۔ یکہ درخت کے نیچے سر بہ سجود کر دیا گیا۔ یکہ والا مجھے جھونپڑی میں لے گیا ایک طرف کچھ گھاس پھیلی ہوئی تھی اس پر ایک میلی سی بالکل پھٹی پرانی توشک سی ڈال دی گئی۔

''میاں بیٹھ جاؤ، میں ذرا گھوڑے کو ٹھکانے لگا لوں۔''

کھونٹی پر سے توبڑا اُٹھایا کچھ گھاس سمیٹی۔ ایک درخت کے نیچے چھپر تھا، گھوڑا وہاں پہنچ کر رُک گیا تھا۔ یکہ والے نے گھوڑے کے سامنے گھاس ڈال دی اور توبڑا چڑھا دیا۔ بچیاں گھوڑے کو چھوڑ کر یکہ بان سے لپٹ گئیں۔ کبھی توبڑے میں سے مٹھی بھر کر چنے نکال لیتیں ان کو کھاتی جاتیں اور گھوڑے کی سامنے والی گھاس پر لوٹ جاتیں۔

گھوڑے کی خدمت سے فراغت پا کر یکہ بان بچیوں سمیت جھونپڑی میں آیا، مجھ کو دیکھ کر بچیاں یک لخت چونک پڑیں یکہ والے نے کہا۔

''ڈرو نہیں۔ ہمارے مہمان ہیں۔''

ان میں جو بڑی تھی سہم کر کہنے لگی۔

''ابا کیا تم پھر یکہ لے کر جاؤ گے؟''

میں نے فوراً جواب دیا۔

''نہیں، اب یہ رات بھر تمہارے ہی ساتھ رہیں گے۔''

یکہ بان نے یکہ پر سے بچھونا اُتار کر گھاس پر ڈال دیا۔ بچیاں اس پر بیٹھ گئیں۔ میں نے پوچھا۔

''اور کیوں میاں تمہارا نام کیا ہے؟''

اس نے کہا،''عیدو'' میں نے کہا۔

''کیوں عیدو ان بچیوں کی ماں کہاں ہے؟''

عیدو اس سوال کو ٹال گیا، اور اس طور پر گویا وہاں بچیوں کے سامنے اس کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کہنے لگا۔

''میاں ذرا دیر ہوگی، سالن دن کا رکھا ہوا ہے بس روٹیاں ڈالنی ہیں۔''

میں نے کہا۔

''انھیں اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔''

میں نے ایک نوٹ دیا اور کہا''یہ لو بازار جا کر کھانا کھاؤ۔ عمدہ عمدہ کھانے، کچھ پھل اور مٹھائیاں۔''

عیدو نے کہا۔''میاں یہ نہیں ہوسکتا اس وقت تو آپ کو ہمارے روکھے پھیکے ہی پر بسر کرنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''اچھا میں تمہارا کھانا کھاؤں گا، لیکن تم کو میرا کھانا، کھانا پڑے گا۔ تم فوراً جا کر سب چیزیں لاؤ۔ اس درمیان میں، میں تمہاری بچیوں کے ساتھ بات کروں گا۔''

عیدو کچھ سوچتا ہوا بازار چلا گیا۔ میں نے لڑکیوں سے بات کرنا شروع کیا، میں نے کہا۔

''تم کیا کھیلتی ہو؟''

بڑی نے کہا۔

''میرے پاس گڑیاں ہیں؟''

میں نے کہا۔

''مجھے لاکر دکھاؤ۔'' دونوں بچیاں جھپٹ کر ایک ہانڈی اُٹھا لائیں۔ ہانڈی کے اندر گھاس بھری ہوئی تھی۔ گھاس کے اوپر ایک صاف سا کپڑا بچھا ہوا تھا اس پر دو گڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ گڑیوں کے اوپر بطور چادر ایک ٹکڑا گرم اونی کپڑے کا تھا۔ بڑی لڑکی نے گڑیوں کو اس احتیاط اور احترام کے ساتھ باہر نکالا جس طور پر شاید رولس رائس کے اندر سے کوئی ڈیوک اپنی بیگم کو بھی نہ نکال سکتا، یا کوئی ماں اپنے سوتے ہوئے مریض بچے کو نہالچہ پر سے اُٹھاتی ہوگی۔ دونوں بچیوں کے چہرہ پر احتیاط، محبت اور تشویش کی جھلک تھی۔ جب تک کہ گڑیاں پورے طور پر ہانڈی سے نہ نکال لی گئیں، میں نے گڑیوں کو اسی احترام وعقیدت کے ساتھ لے کر اپنے دامن میں رکھ لیا۔ بچیوں کی تشویش مسرّت سے بدل گئی۔ اس میں شک نہیں یہ گڑیاں صرف ایک ماں ہی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہوسکتی تھیں۔ ماں کا وہ ہاتھ جو اپنی زندہ گڑیوں کو دنیا کی تمام پوشیدہ وآشکارا آفات سے محفوظ رکھنے پر آمادہ رہتا ہے۔ اضطراری اور غیر اضطراری دونوں طریق پر ان بچیوں کی ماں کو بہتر سے بہتر کپڑا جو عیدو کے گھر میں میسّر آسکا ہوگا، ان گڑیوں پر صَرف کیے گئے تھے۔ کہیں کہیں گوٹے ٹھپے کے ایک آدھ تار بھی نظر آجاتے تھے۔ ناک میں ایک چھوٹی سی نتھ تھی اور دونوں کانوں میں بالیاں۔ ہر چیز پر امتدادِ زمانہ کا اثر تھا لیکن باوجود اس کثافت اور خستگی کے جو گڑیوں پر مسلط تھی، ایک چیز سب سے زیادہ نمایاں تھی اور وہ ماں کی محبت اور شیفتگی تھی جو ان گڑیوں کے تار وپود میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ ان گڑیوں کو دیکھ کر ماں اور بچیاں دونوں نظر کے سامنے آجاتی تھیں۔ ہندوستان کی نیک مفلوک الحال شریف اور صابر وشاکر بیویوں کا یہ ایک حزیں نمونہ تھا۔ یہ نقشہ تھا ایک جاں نثار غریب بیوی کا، اور یہی نہیں بلکہ اس کی فلاکت زدہ پارہ ہائے جگر یعنی ان بچیوں کا جن کے لیے یہ بنائی گئی تھیں۔

میں نے پوچھا۔

''ان کی شادی کب ہوگی؟''

چھوٹی بولی۔

''ابا نے اس کا دولہا نمائش میں سے لانے کو کہا ہے۔''

میں نے کہا۔

''یہ کھاتی کیا ہیں؟''

بڑی بے اختیار ہنس پڑی گویا یہ سوال انتہائی ناواقفیت اور معصومیت کا تھا اور یہی نہیں بلکہ ان کے ہنسنے ہی کے لیے کیا بھی گیا ہے، لیکن چھوٹی پر اس کا اثر نہیں ہوا، اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''اس کی شادی ہو جائے گی تب کھائیں گے۔''

میں نے کہا۔

''تمھارے پاس اور کھلونے بھی ہیں؟''

انھوں نے کہا۔

''ہم اسی سے کھیلتے ہیں۔''

میں نے کہا۔

''یہ گھوڑا جو یکہ میں چلتا ہے کس کا کھلونا ہے؟''

دونوں کچھ حیرت زدہ ہوئیں اور پھر بڑی لڑکی نے مسکرا کر اور اس انداز سے گویا اس نے پہیلی بوجھ لی تھی کہا۔

''کھلونا! ارے وہ تو گھوڑا ہے۔''

لیکن چھوٹی کو اطمینان نہیں ہوا، اس نے کہا۔

''تم ہی بتاؤ کس کا کھلونا ہے؟''

دونوں نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔

''کس کا؟''

میں نے کہا۔

''تم ہی بتاؤ۔''

دونوں کچھ دیر تک سوچتی رہیں اور جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو فرطِ اشتیاق سے دونوں نے آ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک نے شانہ پر ہاتھ رکھا اور خوشامدانہ انداز سے جس میں والہانہ اشتیاق پورے طور پر جھلک رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس انداز سے گویا میری ہمت افزائی بھی مقصود ہے، پوچھا ''سچ بتاؤ کس کا کھلونا ہے؟''

میں نے کہا۔''اللہ میاں کا۔''

دونوں سہم گئیں۔ کہنے لگیں،''اللہ میاں اتنے بڑے کھلونے سے کھیلتے ہیں؟

اللہ میاں کتنے بڑے ہیں؟

''ابا کے برابر؟''

میں نے کہا۔

''ان سے بھی بڑے۔''

اتنے میں عیدو لدا پھندا آ گیا۔ کھانے پینے کے ہنگامے میں اللہ میاں کی وسعت و ضخامت آئی گئی ہوئی۔ بچیاں کھا پی کر سو گئیں۔ میں نے کہا۔

''عیدو اب میرے لیے ایک یکہ لاؤ۔''

عیدو یکہ لانے گیا میں نے جلدی سے اپنا کمبل بچیوں پر ڈالا اور آپ کے پاس چلا آیا...... سب لوگ دم بخود تھے۔

باہر بارش اور ہوا بھی شاید تھم گئی تھی

....

مڑ کے دیکھا ہی تھا تو حاجی بلغ العلا غائب ہیں پھر جب صدر موجود نہ ہو تو اصل موضوع پر کیسے بحث ہو سکتی تھی۔ چنانچہ لُر کی داستان شروع نہ کی جا سکی۔ بعض حضرات نے اعتراض کیا کہ مضمون میں تو لُر کا کہیں پتہ نہیں ہے دیکھا تو واقعی نہ تھا۔ حاجی صاحب سے رجوع کیا گیا تو فرمایا۔''سب کے سب اندھے ہیں دیکھتے نہیں شروع میں کتنا جلی لُر موجود ہے۔'' ایک طرف سے آواز آئی۔

''خفی بھی!''

(باقی کچھ نہیں)

(مطبوعہ: الناظر لکھنؤ، مارچ 1930، مشمولہ مضامین رشید، مکتبہ جامعہ، دہلی 1941)

نوٹ: جدید ایڈیشن مضامین رشید، مطبوعہ: انجمن ترقی اردو (ہند) سے یہ مضمون رشید صاحب نے نکال دیا تھا۔

●●●

چندا ماموں

چاند کے متعلق اب تک جتنی معلومات فراہم کی جا سکی ہیں اور جن کو قبولِ عام نصیب ہوا وہ صرف دو ہیں۔ یعنی ان بزرگ کا بچوں کا ماموں ہونا یا پھر ایک بڑھیا کا چاند میں بیٹھ کر چرخا کاتنا پہلی تحقیق تو شاید کسی ایسی ماں کی ہے جس کا بچہ ضدی اور رونے والا تھا اور دوسری یقیناً مہاتما گاندھی کی ہے، لیکن اگر غور کیجیے تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ چاند کے بارے میں جس نے جو کچھ تحقیق کی وہ محض ضدی اور رونے والوں کی اشک شوئی کے لیے کی ہے بچوں کے لیے چندا ماموں اور ہندستانیوں کے لیے چرخا۔

فکر ہر کس بہ قدر ہمت اُوست

لیکن اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی بات تھی جس سے کسی نے تو چاند کو چندا ماموں قرار دیا اور کسی کو چندا ماموں کی والدہ چرخا کاتتے ہوئے نظر آئیں۔ ممکن ہے کوئی چندا ماموں کے بہنوئی فوراً بول اُٹھیں۔ یہ سب جنونِ قمری ہے اس میں شک نہیں اگر چندا ماموں کے بہنوئی شاعر نہیں ہیں تو پھر ان کی تشخیص یقیناً صحیح ہے اور وہ لبرل ہی نہیں بلکہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک ہونے کے حق دار ہیں۔ گو اسمبلی کے ایک بھاری بھرکم مولوی صاحب بھی اُن کے ایک باوقعت حریف ہیں۔

چاند کے بارے میں چندا ماموں کے بعض جید والدین[1] (یہ صرف والد کی جمع ہے) کا خیال ہے کہ وہاں دریا، پہاڑ، وادیاں، غبار، آتش فشاں وغیرہ سب کچھ ہے۔ صرف حیات نہیں گویا چندا ماموں نہ ہوئے سوراج ہوئے۔ بہر حال چندا ماموں کے سوراج ہونے نہ ہونے کا تو کوئی غم نہیں اور ہے بھی تو اس حد تک تو یقیناً نہیں ہے جس حد تک مہاراجہ صاحب بہادر پٹیالہ کو ہے۔ جب وہ رونے والے بچوں کے ماموں ہو سکتے ہیں تو پھر ان کو حق نہیں حاصل ہے کہ وہ سوراج سے مخاطب کیے جانے پر بے فکروں سے بگڑ بیٹھیں۔ سوال صرف یہ ہے کہ ان میں ماموں بننے کی کہاں تک صلاحیت ہے محض کسی کے کہہ دینے سے وہ یہ یا وہ کیوں ہونے لگیں۔ یہ کوئی عدم تشدد کا مسئلہ تو ہے نہیں کہ محض عدم تشدد کر دینے سے وہ عدم تشدد ہو جائے، لیکن، بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو کسی سبب سے مسبب بننے کا امتیاز حاصل نہیں ہوتا ایک مسخرہ بے فکری کے کسی لمحہ میں کچھ کہہ بیٹھتا ہے اور دس سنجیدہ حضرات اُسے تسلیم کرتے ہیں اور وہ چیز متعین ہو جاتی ہے۔ گورنمنٹ کو مائی باپ یا مس میو کو مادر ہند کہنے والا یقیناً کوئی مسخرا ہی ہوگا۔ ورنہ گورنمنٹ کو تعزیرات ہند سے کب فرصت ملی ہوگی کہ وہ مائی باپ ہونے کے عجیب وغریب مسئلہ پر غور کر سکے، اور مس میو کو مادر ہند سے کیا نسبت ہو سکتی ہے، لیکن اس کو کیا کیجیے جب تک خطابات بٹتے رہیں گے۔ گورنمنٹ کو مائی باپ بننے سے مفر نہیں ہے اور جب تک ماگھ میلا اور غازی میاں کا میلا موجود ہیں۔ مس میو کو ہند سے نجات نہیں۔

یہ سب کچھ چندا ماموں ہی سے تعلق نہیں رکھتا۔ ہندوستان کی سرزمین اس قسم کے رشتہ ناتوں کے لیے بہت زرخیز ہے، اور اس قسم کی انوکھی باتیں یہاں کی عورتوں ہی کے دماغ کا نتیجہ ہیں مثلاً سانپ کو ماموں کہنا، دن کو قصہ نہ کہنا چاہیے ورنہ ماموں راستہ بھول جائیں گے۔ میرٹھ اور اس کے نواح میں جنات کو ماموں اللہ بخش کہتے ہیں غرض جناب ماموں نہ ہوئے، قومی خدمت، ہوئے۔ نان کوآپریشن، خان بہادری، بم بازی، خودکشی، گاؤکشی، مشاعرہ، افطاری وسحری، پولیس سے پٹنا، عورت کو بھگا لے جانا، بواسیر میں مبتلا ہونا، اور فن پرداز پر ووٹ دینا، یہ سب ''قومی خدمت'' ہے۔

---

[1] جو صاحب اپنے بیٹے کو علی گڑھ میں داخلہ دلانے آتے انھیں وہاں کے طلبا ''والدین'' کہتے تھے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان بزرگ کو سارے خاندان میں اتنی اہمیت کیوں حاصل ہے اس کا پتہ اس وقت سے چلتا ہے جب ان حضرت کے بہن اور بہنوئی جنت میں براجمان تھے۔ سانپ نے حوا سے بہناپا جوڑا اور آدم کو ایسے کام پر آمادہ کیا جو آج تک رالی برادرس اور چوپائی یا دونوں کے مجموعے ہمارے ڈائننگ ہال کی چپاتی کی شکل میں موجود ہے۔ اس سازش اور لغزش کی پاداش میں تینوں اس دنیا میں بھیج دیے گئے یا یوں سمجھ لیجیے ان لوگوں نے جنت کو اس دنیا میں متشکل اور منتقل کر دیا۔ سانپ اور حوا کی سازش نے حوا کی اولاد کو سانپ کا بھانجا قرار دے دیا۔ عورت کی طبیعت بالعموم انتہا پسند ہوتی ہے اس لیے اس کے خوف نفرت یا محبت سب کا نتیجہ یکساں ہوتا ہے۔ گورنمنٹ نے خطابات کی تقسیم بھی شاید اسی بنا پر رکھی ہے۔ عورت، سانپ اور جنات سے ڈرتی، مسافر اور چاند کو عزیز رکھتی ہے اس لیے سب کو بچہ کا ماموں قرار دے دیتی ہے۔

ہندوستان کلیتہً ارض عفت اور عقیدت ہے جس کا مظہر جمیل عورت ہے اب سے اور ناظرین کی جان سے دور، جس زمانے میں ہندوستان مس میو اور جان بل کا نہیں سیتا اور کرشن کا ہندوستان تھا، جس وقت یہاں صرف عفت اور محبت کی کارفرمائی تھی۔ شانتی اور بھگتی اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ ہندوستان ایک شیشۂ عفت [1] تھا جس کی ترجمان موسیقی تھی۔ مہابھارت اور رامائن کو غلطی سے ایک (رزمیہ نظم) کی حیثیت دی جاتی ہے اصطلاح عام میں یہ رزمیہ ہو سکتی ہیں لیکن ان کی اسپرٹ (روح) کلیتہً عقیدت اور عفت ہے جس کے قالب کرشن اور سیتا ہیں۔

ہندوستان کی عورت زائیدہ فطرت ہے یورپ کی آوردۂ معاشرت، ہندستانی عورت کے خمیر میں اخلاص اور پرستش ہے وہ اس لیے محبت نہیں کرتی کہ محبت کرنا ایک فن ہے یا ضرورت زمانہ۔ وہ اس لیے محبت کرتی ہے کہ وہ بحیثیت عورت اس کے سوا کچھ اور نہیں کر سکتی، اس کی دوستی اور دشمنی دونوں بر بنائے محبت ہوگی۔ یورپ کی عورت محبت کرنا تکمیل فن سمجھتی ہے وہ اسے فطرت کا نہیں سوسائٹی کا مطالبہ سمجھتی ہے۔ اس کی محبت تقاضائے نسوانیت نہیں بلکہ تقاضائے معاشرت ہے۔ ہندستانی عورت خاموشی پسند ہے، وہ سرشاری چاہتی ہے، لیکن سکوت و سکون کے ساتھ۔ وہ محبت کو خدمت سمجھتی ہے اور خدمت اس کے نزدیک عبادت ہے۔ یورپ کی عورت ہنگامہ چاہتی ہے۔

---

1. Symbol of womanhood.

''نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی''

برخلاف ہندستانی عورت اس کا مذہب شوہر نہیں سوسائٹی ہے۔ محبت کرنا اس کے نزدیک تکمیلِ سوسائٹی کا ایک زینہ ہے۔ ہندستانی عورت کا شوہر انسان نہیں بلکہ آئیڈیل ہے۔ یورپ کی عورت کا شوہر سوسائٹی کا ایک قانون ہے۔ یورپ کی عورت آزادی کی دل دادہ ہے وہ افعال و خیالات دونوں کی آزادی چاہتی ہے۔ ہندوستان کی عورت آزادی نہیں پرستش چاہتی ہے۔ اس کے یہاں حصولِ محبت حصولِ آزادی کا نام ہے۔ یورپ کی عورت آزادی کے اعتبار سے مرو ہی نہیں ہر اُس چیز کی آزادی کے درجہ پر پہنچنا چاہتی ہے جس پر کسی نہ کسی طور پر آزادی کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ ہندستانی عورت کے یہاں آزادی کے اقسام ہیں۔ وہ حفظِ مراتب کو آزادی سمجھتی ہے، وہ اس کو آزادی نہیں سمجھتی کہ اگر مرد فوج اور پارلیمنٹ میں شریک ہوتے ہیں تو عورت کو بھی فوج اور پارلیمنٹ میں شریک ہونا چاہیے۔ وہ اپنا حق اور فرض یہ سمجھتی ہے کہ پارلیمنٹ اور فوج کے لیے بہترین اولاد فراہم کرے۔ پارلیمنٹ یا فوج کی رکن بننے کے بجائے بہترین فوج یا پارلیمنٹ کے بہترین رکن کی ماں بننا چاہتی ہے وہ دنیا کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل خدمت سے کرنا چاہتی ہے نہ کہ مسابقت سے ہندستانی عورت کا آئیڈیل تفوق نہیں بلکہ جوازِ تفوق ہے۔

ناظرین معاف فرمائیں۔ آخری بند ذرا رقت انگیز ہوگیا، اور اس سلسلہ میں ایک شعر بھی بھول گیا جس کو کہیں نہ کہیں رکھ دینا چاہتا تھا۔ بہر حال یہ زیادہ بہتر ہے کہ شعر لکھ دیا جائے۔ اس بند کے رقت انگیز ہونے نہ ہونے سے نفسِ مضمون میں کوئی فرق نہیں آتا۔ شعر نہ لکھا جائے تو اردو مضمون نگاری نامکمل رہ جائے گی اور آپ جانتے ہیں دونوں میں اہم کون ہے۔

طریقِ عشق و محبت رہِ ہوا و ہوس
وہ راہ بر کی ہدایت یہ رہ گزر کا فریب

(چاند، الٰہ آباد۔ اپریل 1930، مشمولہ ''مضامینِ رشید'' مطبوعہ مکتبہ جامعہ 1940)

نوٹ: مضامینِ رشید، مطبوعہ: انجمن ترقی اردو (ہند) 1961 کے ایڈیشن مضامین شامل نہیں ہیں۔

●●●

مضمون

بے کاری اور بیماری دو حالتیں ایسی ہیں جن میں انسان اپنے آپ کو کچھ غیر معمولی طریقے پر احمق یا شاعر محسوس کرنے لگتا ہے۔ ممکن ہے کسی شخص کا تجربہ اس سے زیادہ صحیح اس لیے عبرت ناک ہو، اس کا ہندستانی سبب میرے نزدیک یہ ہے کہ دونوں حالتوں میں دو چیزوں سے زیادہ سابقہ پڑتا ہے۔ یعنی بیوی اور بھوک! ان کی بھی دو قسمیں ہیں ''گھریلو'' اور ''غیر گھریلو'' ان اقسام کو جن الفاظ کا جامہ پہنایا گیا ہے، بظاہر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی تعلیم یافتہ شخص کے پردۂ دماغ سے نہیں نکلے ہیں بلکہ کوئی اود بلاؤ ہے جو غیر متوقع طور پر اور کسی غیر متوقع ہی گوشہ سے یک لخت برآمد ہو گیا ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے اس قسم کی ''اود بلاویت'' کم سے کم ایک ادبی رسالہ میں ناقابلِ عفو ہے، لیکن حفیظ صاحب[1] باوجود مصنف ''شاہنامۂ اسلام'' ہونے کے اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ انسانی دماغ میں اس قسم کے خانے موجود ضرور ہیں یہ اور بات ہے کہ آپ اسے فلسفہ، تصوف، آرٹ، یا قلندری، کرنل لارنس یا ''ایرین شا'' قرار دے کر گول کر جائیں۔ بہر حال میں اور حکومت ہند دونوں اس قسم کی ''اود بلاویت'' کے قائل ہیں۔ اگر آپ معتقد نہیں ہیں تو پھر آپ سے حکومت ہند سمجھے یا — بچہ سقہ!

اچھا تو یہ بات کا بتنگڑ گھریلو اور غیر گھریلو سے شروع ہوا تھا، اور بچہ سقہ پر ختم ہوا۔ اب سوال یہ ہے کہ بھوک اور بیوی کو گھر سے کیا نسبت ہے، بات یہ ہے کہ بھوک اور بیوی دونوں پر یہ

---

1. حفیظ جالندھری، ابوالاثر محمد حفیظ، پیدائش 14 رجنوری 1900 جالندھر۔ وفات 21 ردسمبر 1982 لاہور۔

صفات صادق آتی ہیں۔ بھوک کے بارے میں تو میرا ذاتی عقیدہ یہ ہے کہ جب طبیعت میں وحشت یا فلسفیت پیدا ہونے لگتی ہے تو میں فوراً سوچنے لگتا ہوں کہیں بھوک تو نہیں لگی ہے۔ یہ تشخیص سو فیصدی صحیح ہوتی ہے، لیکن اس کا علاج اتنا آسان ہے نہیں جتنی اس کی تشخیص۔ ملیریا اور بھوک ایک ہی قسم کے امراض ہیں۔ دونوں کا علاج اور ازالہ یقینی ہے لیکن گورنمنٹ ہند کی مانند مریضانِ گرسنگی بھی عدم استطاعت کی بنا پر اس کے علاج سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس 'عدم استطاعت' اور ''عدم مداخلت'' نے ہندوستان میں ''نوحۂ غم'' اور ''نغمۂ شادی'' دونوں کا لطف پیدا کر دیا ہے۔ کسی زمانہ میں بنگال کی مانند بلجیم بھی ملیریا کی گرفت میں تھا، لیکن حکومت بلجیم اس آشوب کے دفاع میں اصول مداخلت کو پوری تندہی اور سرگرمی کے ساتھ بر سر کار لائی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس مرض کا ہمیشہ کے لیے قلع قمع ہو گیا۔ حکومت ہند کے ''عدم استطاعت'' کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ پوسٹ کارڈ کی قیمت میں تخفیف کرنے کے مسئلہ پر مسٹر کرار لرزہ براندام ہو گئے، رہا عدم مداخلت کا سوال وہ مسلّم ہے، جب تک افغانستان کی فضا پورے طور پر صاف نہ ہو جائے حکومت ''مداخلت'' اور ''عدم مداخلت'' کے لفظ اور مفہوم سے بھی دامن بچانا چاہتی ہے۔ اس اعتبار سے بچہ سقہ اور ملیریا دونوں ایک سطح پر ہیں۔

اگر میں کبھی کونسل کا ممبر ہوا اور کسی کمیٹی یا کمیشن کا ممبر نہ ہو سکا یا دفعہ 124 الف کی زد میں آیا اور مالوی جی کی طرح بچ گیا تو میں فرصت اور گرسنگی کے اوّلین لمحہ میں یہ سوال پیش کروں گا کہ کیا گورنمنٹ کو اس کی خبر ہے کہ بچہ سقہ اور انجمن بین الاقوام کے ارباب قضا و قدر، اولاد ایک خاندان میں اور روزی دوسرے خاندان میں بھیجنے کے عادی ہو گئے ہیں اور کیا روس میں سوویت حکومت کا قیام قضا و قدر کے موجودہ ستم ظریفانہ رویّہ کی بنا پر نہیں ہے؟ کیا حکومت وثوق کے ساتھ بتا سکتی ہے کہ انجمن قضا و قدر کی جماعت میں کوئی سوویت ممبر خفیہ ریشہ دوانیاں نہیں کر رہا ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو کیا حکومت کوئی ایسی کمیٹی (باستثنائے محرک) مقرر کرے گی جو ارباب قضا و قدران کے کسی نمائندہ سے اس معاملہ میں گفت و شنید کر سکے؟ بہر حال گھریلو بھوک تو وہ ہے جو اپنے آپ کو ہر اس وقت پر محسوس کرادے جب کھانا مل سکتا ہو یا مل رہا ہو اسے اشتہائے جاریہ کہتے ہیں، اطبا اسے اشتہا اور صوفیا طلب صادق قرار دیتے ہیں۔ یہ اکثر کاب سے

شروع ہوتی ہے اور ہضمِ سوم سے گزرتی ہوئی......الخ! دوسری غیر گھریلو بھوک ہے، یہ اس خاک دانِ عالم کی طرح ایک طلسمِ تعینات ہے کھانے کا وقت آ گیا اب خواہ کالج کا گھنٹہ بج رہا ہو، خواہ بیوی ضرورت سے زیادہ دلکش یا خشم ناک نظر آتی ہو، گو اوّل الذکر صفت اتنا ہی ناممکن ہے جتنا مؤخر الذکر ناگزیر۔ قصہ مختصر خواہ مہاتما گاندھی کلکتہ میں گرفتار ہو رہے ہوں یا مالویہ جی امرتسر میں گاما کے نقرئی گرز کا خواب دیکھ رہے ہوں بہرنوع کھانا کھایا جائے گا، اس طبقہ کے نزدیک کھانا کھانے کے لیے معدہ کی بدنصیبی سے زیادہ خود کھانے کی بدنصیبی اہم اور قابلِ توجہ ہے اس کے نزدیک بھوک کی وہی حیثیت ہے جو حکومت کے نزدیک ہندوستان کی وفاداری کی ہے اگر وفادار ہو، اپنے فرائض طبعی بجالاتے ہو اگر وفادار نہیں ہو ہم کو اپنے فرائضِ تادیبی بجالانے پڑیں گے اگر بھوک معلوم ہوتی ہے تو یہ معدہ، جگر کا فعل طبعی تھا اگر نہیں معلوم ہوتی، ہم فرائضِ تادیبی سے رجوع کریں گے۔ مثلاً ورزش کی جائے گی بھٹکے ہوئے آسیب کی مانند چار میل کا چکر لگایا جائے گا، گپ لڑائی جائے گی نماز روزے زیادہ خشوع وخضوع سے نہیں تو زیادہ جفاکشی کے ساتھ ادا کیے جائیں گے اور......

دوسری طرف ''گھریلو'' اور ''غیر گھریلو'' بیوی، گھریلو بیوی ہندستانی بیوی ہے جس کو فریقین کے والدین بیاہتے ہیں، جسے فریقین نباہتے ہیں اور ملک وملت سراہتے ہیں، دوسری طرف تعلیم یافتہ روشن خیال ''گھریلو'' بیوی ہے جس کو فریقین کے احباب بیاہتے ہیں، احباب ہی نباہتے اور سوسائٹی سراہتی ہے۔ اب اسے آرٹ کہہ لیجیے یا مصطفیٰ کمال، نتیجہ ایک ہی ہے وہی — اور بلا دقت!

....

اب صرف ایک بات اور رہ جاتی ہے جو آغاز ہی میں ظاہر کردی گئی تھی اور اب نئے سرے سے شروع کی جاتی ہے یعنی حماقت اور شاعری، لیکن دقت یہ ہے کہ ابتدا سے کی جائے کیوں کہ ان دونوں کا چولی دامن کا تعلق نہیں ہے بلکہ مرغی اور انڈے کا جس نے ایک مدت سے جب مرغی اور انڈے دونوں ناپید تھے فلسفیوں کے دماغ کو پراگندہ کر رکھا ہے۔ بہرحال اس ''مرغنڈا'' سے (جس کی ترکیب کی داد دینا اندیشہ سے خالی نہیں ہے) عہدہ برآ ہونے کی

''مرغنذ ئین'' نے صرف یہ صورت نکالی ہے کہ دونوں کو بہ یک وقت ایک ہی مفہوم میں لے لیا جائے، لیکن ایک اندیشہ بھی ہے کہ اس رعایت سے کوئی احمق اپنے آپ کو شاعر نہ تصور کر لے یا کوئی شاعر اپنے آپ کو احمق۔ گو اس آفت اور دقت کا روشن ترین پہلو یہ ہے کہ اس سے ''حماقت'' مُتیقّن ہو جائے گی، اس لیے حماقت ہی سے اس کی ابتدا کرنا چاہیے۔ فھو المراد۔ وھو الھٰذا!

حماقت نہ کسبی ہے اور نہ وہبی بلکہ یہ صرف متعدی ہے جو کسی نااہل کی خوش نصیبی کی طرح اُڑ کر لگتی ہے دنیا میں کوئی شخص مستقل احمق نہیں ہے یعنی وہ شخص بھی نہیں جو اپنے آپ یا دوسروں کو احمق سمجھتا ہے۔ حماقت یا بعض امراض کے صرف دورے ہوا کرتے ہیں، جن کی کم وبیش مقررہ میعادیں ہوتی ہیں جیسے ٹائیفائڈ یا کونسل اور اسمبلی کی میعادیں اس دوران میں وہ سب کچھ کر گزرتا ہے شادی کر لیتا ہے، قرض ادا کر دیتا ہے، تقریریں کرنے لگتا ہے، مضامین لکھتا ہے، خطاب حاصل کر لیتا ہے اور اکثر اسے......واپس بھی کر دیتا ہے۔

اچھا، خوب یاد آیا۔ آپ بیمار ہیں سوچتے ہیں، بیمار کیوں ہوئے۔ اس کی ضرورت ہی کیا تھی، طبیب نے مرض نہیں سمجھا، بیوی کو امور خانہ داری کا سلیقہ نہیں ہے۔ میں اچھا ہوتا اور اک ذرا باہر نکلتا تو دنیا کا نقشہ بدل جاتا۔ کتنوں کو میرے فضل وکمال پر عش عش کرنے کا موقع ملتا۔ کتنی عورتیں جن کے مضامین باتصویر اخباروں میں چھپتے ہیں، اور مصطفیٰ کمال کی نادیدہ عاشق ہیں، مجھے دیکھ کر غزلیں کہنا شروع کر دیتیں۔ گم نام خطوط بھیجنے لگتیں اور اپنے خرچ پر مجھ کو یورپ اور شاید اپنے شوہروں کے خرچ پر پاگل خانے بھجوا دیتیں۔ کچھ اور نہیں تو بہت سے لوگ میری اس شجاعت اور بطالت پر متحیر ہو جاتے کہ بیمار بھی ہوا اور زندہ بھی رہا۔ اکثر ایسی حالت میں داد یوں دی جاتی ہے کہ ہم تو آپ کی خبر بد بھی سن چکے تھے، کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو ہر وقت اس کے منتظر تھے اور کچھ کہیں گے اس حالت میں کسی کا تندرست ہو جانا آج تک تو سنا نہیں گیا۔ آپ پر خدا کی خاص مہربانی تھی۔ گویا خدا کی ایک مہربانی یہ بھی ہے کہ وہ ملک الموت کو ہمارا دوست اور دوسروں کو جانی دشمن بنا دے، اور یہ سب کچھ محض اس لیے کہ مراسم تعزیت یا بیمار پُرسی یا اخلاق نمائی کا تقاضا یہی تھا۔

بیماری میں گھریلو بیوی کی بیمارداری اور اس کا طور طریقہ اور بیمارداری کی وہ فضا جو اس کے چاروں طرف اسی طور پر محیط ہوتی ہے جس طور پر کہ وہ کبھی ردائے عروسی میں ملفوف تھی

اس کا ہروقت ہرموقع پر ہر بہانہ سے موجود رہنا یا عدم موجودگی میں اپنی حزیں شگفتگی کا ایک غیر مرئی، لیکن عافیت آگیں اور راحت زا لمس چھوڑ جانا ایسے حالات اور کیفیات ہیں کہ اکثر مریض اپنے آپ سے زیادہ اپنی بیوی کو مریض یا بے وقوف خیال کرنے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں نسوانی فطرت یا مشرقی تہذیب کا ایک عجیب کرشمہ نظر آتا ہے۔ بد مزاج سے بد مزاج بیوی کیوں نہ ہو، شوہر کی علالت میں وہ شوہر کی ناجائز سے ناجائز زجر و توبیخ کو بھی برداشت کر لیتی ہے اور وہ بھی اس طور پر گویا یہ اس کی دلی تمنا تھی۔ اس کا نفسیاتی تجزیہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ مرض کی تکلیف کے علاوہ شوہر کے ہر فعل کو اُمید افزا اور روح پرور سمجھتی ہے اور اس کی متمنی بھی رہتی ہے۔ وہ مریض شوہر میں ضم ہو جانا چاہتی ہے اور محض اس لیے کہ وہ شوہر کے جسم و جاں سے علاحدہ رہ کر اس کی تکلیف کو محسوس نہ کر سکے، وہ اس کو اپنی نسوانی جبلت کی توہین سمجھتی ہے کہ وہ اپنی جداگانہ تندرستی، اپنی جداگانہ راحت اور اپنی جداگانہ انفرادیت کے ساتھ شوہر کی تکلیف کا اندازہ یا احساس کرے وہ صرف یہ چاہتی ہے کہ اپنے جداگانہ وجود کو شوہر کے وجود میں ضم کر دے اور اس طور پر شوہر کا جسم و جان بن کر شوہر کی تکالیف اور مصائب کی شریک غالب بن جائے.........!

یا مظہر العجائب، یہ میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا! کہاں ''اود بلاؤیت'' اور کہاں یہ ''مناجات بیوہ'' حفیظ صاحب بس آپ نے مزید اصرار کیا تو سمجھ لیجیے ان ناظرین یا ناظرات کے ہاتھوں آپ کا اور میرا کیا حشر ہوگا، جن کی اس اود بلاؤیت سے سابقہ پڑنے والا ہے۔ لیکن دیکھیے گھبرائیے گا نہیں، ملہم شیراز کا پیام سُنیے۔

زہدت بچہ کار آید گر راندۂ درگاہی
کفرت چہ زیاں دارد گر نیک سرانجامی [1]

(مشمولہ مضامین رشید۔ پہلا ایڈیشن، مکتبہ جامعہ، دہلی 1941)

نوٹ: جدید ایڈیشن مطبوعہ 1968 میں یہ مضمون شامل نہیں ہے۔

●●●

---

1 تمھارا زہد کیا کام آئے گا اگر تم راندۂ درگاہ ہو، اور تمہارا کفر تمھیں کیا نقصان پہنچائے گا اگر تم نیک کام سرانجام دیتے ہو۔

شادی کی سال گرہ کی تاریخ

اس دنیا میں ٹپی پھاندتے رہنے کا جو کھیل ہم آپ کھیل رہے ہیں نہ ہمارے لیے نیا ہے نہ ہمارے اسلاف یا اولاد کے لیے، کوئی خوشی سے پھاندتا ہے کوئی رو رو کر پھاندتا ہے۔ اس کود پھاند میں شادی وہ جست ہے، جس کے بعد جست کا صرف ایک حادثہ اور رہ جاتا ہے اور وہ خاتمہ بالخیر کا ہے۔ شادی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اندھیرے میں جست لگاتا ہے مرنا بھی ایک سے اندھیرے ہی میں جست لگانا ہے۔ البتہ شادی اور موت میں ایک فرق یہ ہے کہ شادی میں ہم جست لگاتے ہیں۔ موت میں ہم جست کم لگاتے ہیں دھکیل زیادہ دیے جاتے ہیں۔ شادی کے بعد ٹپیوں [1] کی تعداد زیادہ کودنے کا حوصلہ کم اور سکت پست ہو جاتی ہے۔ اس کا علاج بعضوں نے یہ نکالا ہے کہ بار بار شادی کرتے رہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے امتحان کا نتیجہ شائع ہو جاتا ہے تو بعض بعض ناکام اُمیدوار دوسرا تیسرا اخبار اس نیت سے خریدتے ہیں کہ شاید پہلے میں نام چھپنے سے رہ گیا ہو تو دوسرے تیسرے میں مل جائے، جو لوگ شادی کے زیادہ عادی ہو جاتے ہیں وہ آخر میں ٹپیوں ہی سے شادی کرنے پر اُتر آتے ہیں۔ جب فتح ناممکن ہو تو مصالحت میں کیا ہرج!

---

1. میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ لفظ یہاں پہنچ کر کیا گل کھلائے گا، اور اس سے زیادہ عبرت کی بات یہ ہے کہ باوجود کوشش کرتے رہنے کے اس کا جانشین دریافت نہ ہو سکا۔ (رشید احمد صدیقی)

سال گرہ کہیے یا سال گرہ بات ایک ہی ہے۔ گرہ کے معنی نحوست ادبار اور شامت کے ہیں اور گرہ کے معنی وہی گرہ گانٹھ جیسے ''گانٹھ کا پورا'' یا ''گرہ میں دام کہاں!'' آج کی گفتگو میں سال گرہ کسی کی ہو معنی لغت ہی کے رہیں گے۔ یعنی نحوست اور شامت کا ایک سال کٹ گیا یا اُن میں ایک سال کا اضافہ ہوا۔ جیل خانے کے قیدیوں کو اس کی خوشی ہوتی ہے کہ سزا بھگتنے کی جو میعاد مقرر کی گئی تھی اس میں ایک سال کم ہو گیا۔ جنم قیدی، میاں بیوی کو اس موقع پر مبارک باد دی جاتی ہے کہ اپنی رہائی میں نہ انھوں نے حصہ لیا نہ قضا وقدر نے دلچسپی لی اور اُمید کی جاتی ہے کہ آئندہ سال ہا سال ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ اور اس طرح کی گرہوں یا گرہوں کا اضافہ ہوتا رہے گا۔

بعض میاں بیوی اس پر خوش ہو سکتے ہیں کہ ایسا ایک سال اور گزر گیا، جس میں ایک کو بہتر میاں یا دوسرے کو بہتر بیوی نہ مل سکی۔ ممکن ہے اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوں کہ اُن سے بدتر رفیق زندگی ملی ہوتی تو کیا کرتے۔ ممکن ہے دونوں کو اس پر فخر بھی ہو کہ بدترین حالات کے ہوتے ہوئے انھوں نے جس طرح ایک دوسرے کے ساتھ نباہا اس کا اجر آخرت میں ان کو اس طرح دیا جائے کہ جنت میں ایک ساتھ رہنے کی سزا ملے۔ جنت کے بارے میں، میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہاں شوہر اور بیوی اپنی اس دنیا کے تجربات یا پہلی جنت کی روایات ساتھ لے جا سکیں گے یا نہیں!

ایک دوست کا ارشاد ہے کہ شادی کی سال گرہ کی ایجاد کرنے والے کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ ایک ہی شادی کی یاد ہر سال منائی جائے۔ ایک ہی شادی کی بار بار یاد منانا خوشی منانا نہیں ہے، دعائے مغفرت مانگنا ہے۔ خوشی اور فخر کی سال گرہ تو وہ ہے جو ہر سال نئی شادی پر منائی جائے۔ پرانی شادی پر نئی سال گرہ منانا اور ہر سال منانا جہل مرکب ہے۔ شادی کے بہت سے فوائد بتائے جاتے ہیں۔ اس سلسلے کی دواؤں کے فوائد بھی کچھ کم نہیں۔ ان دونوں سے کہیں زیادہ اُن سزاؤں کے فوائد بتائے گئے ہیں جو تن بہ تقدیر شادیوں اور تیر بہدف دواؤں کے سلسلے میں تجربہ میں آئی ہیں۔ شادی کے فوائد کے سلسلے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اس سے نسل بڑھتی ہے اور عقل گھٹتی ہے گو یہ بتانا مشکل ہے کہ شادی کے بعد گھٹی یا عقل ماری گئی تھی اس لیے شادی کر لی۔

مجھے نہ شادی سے بیر ہے نہ اُس کی سال گرہ منانے سے دشمنی، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ شادی اور اُس کی سال گرہ کی دیکھا دیکھی بے شمار ایسی سال گرہیں نکل آئی ہیں جن کو میں نہیں مناتا بلکہ وہ مجھے مناتی رہتی ہیں۔ مثلاً اسی کو لے لیجیے شادی کی ہر سال گرہ جب ایک اولاد یا اولاد کی پیدائش سے شروع یا اس پر ختم ہوتی ہو۔ آپ مجھے کیا کہیں گے یا نفسِ سال گرہ پر کیا حکم لگا لیں گے والدین کی شادی کی سال گرہ اولاد کی پیدائش کی سال گرہ سے رشتہ جوڑے اور اولاد کی اولاد سے منتقل ہوتی والدین کی زندگی میں وقت علی الاولاد بن جائے تو آپ کیا کہیں گے۔

میری زندگی ایک مسلسل سال گرہ بن کر رہ گئی ہے۔ اپنی پیدائش اور شادی کی سال گرہ اولاد کی پیدائش اور شادی کی سال گرہ، اُن کی اولاد کی پیدائش کی سال گرہ، اسی طرح اعزا، احباب، اولیا اللہ کی پیدائش یا وفات کی سال گرہ اس کے بعد حشرت الارض کی سال گرہ، چرند، پرند، درند کی سال گرہ اور دوسرے موذیوں کی سال گرہ! آپ نے ایک مشہور تصویر دیکھی ہوگی جس میں ایک نہایت بلند بالا، توانا اور تندرست آدمی ہے جس کے گرد سانپ لپٹا ہوا ہے۔ سانپ کی گرفت اتنی سخت ہے کہ بدنصیب شخص کی نس نس چُر چُراتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور چہرے سے کرب کا جو عالم نمایاں ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ آپ نے تصویر نہ بھی دیکھی ہو تو اس کا اندازہ کسی نہ کسی حد تک ضرور کر سکتے ہوں گے۔ اب یہ کیجیے کہ جن سال گرہوں کا میں نے تذکرہ کیا ہے ان کو سانپ کی شکل دے کر میرے جسم کے چاروں طرف جکڑ دیجیے۔ پھر تماشا دیکھئے۔ البتہ اس میں تھوڑی سی ترمیم کرنی ہوگی۔ یعنی تصویر میں مرد کے جسم کو جتنا متناسب و مضبوط دکھایا گیا ہے میرا جسم اتنا ہی کمزور کا واک ہوگا اور بشرہ میرا پہلے ہی سے ویسا ہے جیسا تصویر کا بعد میں ہوا ہے۔ اس لیے ممکن ہے آپ کو میرے سانپ کے بشرے میں وہ کرب جھلکتا ہوا ملے جو تصویر میں مرد کے بشرے میں نظر آتا ہے۔

سال گرہ کے اس دل بادل میں میری شادی کی سال گرہ کی وہی حیثیت رہ گئی ہے جو قوم کے لیڈروں میں عافیت جوئی اور صلح پسندی کی ہوتی ہے۔ سال تو درکنار میرا تو ہر روز کسی نہ کسی سال گرہ سے سابقہ رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں کبھی کبھی سوچنے لگتا ہوں کہ دنیا کا سارا چکر

ہی سال گرہ کا چکر ہے۔ ہر انقلاب کی مادی توجیہہ کی جاسکتی ہو یا نہیں ہر تہذیب کی توجیہہ سال گرہ سے کی جاسکتی ہے۔

لیکن یہاں پہنچ میں شاید بہکنے لگا ہوں یہ مہینہ رمضان شریف کا ہے، اس میں بہکنے سے بچنا چاہیے اور بہکانے سے بھی باز رہنا چاہیے۔

اچھا تو یہ دیکھیے۔ میرے مکان میں بڑے اُونچے اُونچے درخت ہیں۔ خوش نما بھی اور پھل دار بھی۔ گنجان پھل دار جھاڑیاں ہیں۔ ہموار سرسبز گھاس کا ایک مختصر ہموار تختہ بھی اور اس قبیل کے کچھ اور پھول پتے! ان سب کو میں نے اپنے ہاتھ سے لگایا ہے اور ان کی خدمت کرنے میں دن رات اور سال ہا سال مشقت اور زیرباری اُٹھائی ہے۔ لوگوں کی پھبتیاں اور طعنے سنے ہیں۔ کبھی کبھی اس سلسلے میں بے ایمانی بھی کی ہے۔ اس لیے عافیت بھی خاصی مجروح ہوئی ہے۔ قاعدہ یہ چاہتا تھا کہ اس کے بعد قوم بھی مجھے زیادہ سے زیادہ شادی کرنے اور اتنی ہی سال گرہ منانے کا موقع دیتی رہتی، لیکن انجام یہ ہے کہ بستی ہی نہیں آس پاس کے تمام کوّے جنھوں نے شادی کہیں کی ہو، سال گرہ منانے میرے درختوں پر آجاتے ہیں۔ گھونسلے بناتے اور انڈے بچّے دیتے ہیں۔ چنانچہ دن رات وہ چیخ و پکار مچی رہتی ہے جیسے کسی بدتمیز دولت مند یا بدنصیب مفلس کے ہاں کوئی تقریب ہو اور لاؤڈ سپیکر سے کوا گو ہار کا اعلان کیا جارہا ہو۔

میں نے ان سے نجات پانے کے لیے ایک کوا اسکواڈ رکھا جس کا سردار مالی کو مقرر کیا گیا، لیکن سارے کوّوں نے اس کی کھوپڑی کو نشانہ بنالیا۔ وہ درخت کے قریب پہنچا نہیں کہ اس سب میرین یا مین آف وار کے اوپر کوّوں کے جٹ پلینز (Jet Planes) منڈلانے اور جھپٹنے لگے اور اس کے سر اور کاندھوں پر اس طرح ٹوٹ کر گرنے لگے کہ اس نے استعفیٰ داخل کردیا۔ پھر یہ کوّے ایسے لاگو ہوئے کہ باورچی خانے سے کھانا اور باہر سے معزز خواتین کا آنا بند ہوگیا۔ اس دُہری مار کی تاب نہ کوئی شریف لاسکتا تھا نہ کوئی شہدا! آپ ہی بتایئے کہ جس کو روزے میں روزی نہ میسّر آئے اور خواتین منہ نہ لگائیں وہ کیا منہ دکھائے اور کیوں کر جیے۔

میں نے مایوس ہو کر محلّے کے تمام لڑکوں کو دعوت دی کہ وہ میرے ہاں آکر اپنی پیدائش یا اپنے والدین کی سال گرہ منائیں۔ اس لیے کہ میں نے مہارشی ٹیگور کے بارے میں سنا تھا کہ

وہ بچوں کو دیکھتے تو یہ رائے قائم کرتے کہ اللہ تعالیٰ ابھی اپنی مخلوق سے مایوس نہیں ہوا ہے اور مہارشی سے کم تر درجہ کے لوگوں سے سنا تھا کہ لڑکوں سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔ انجام یہ ہوا کہ مہارشی کے یہ تمام چہیتے کوؤں سے مل گئے اور میرے میٹھے موتی، مالٹے اور پپیتے کے درختوں پر ٹوٹ پڑے اور پھول ترکاری کی کیاریوں پر دھاوا بول دیا، اور سارے کوّے درختوں اور منڈیروں پر بیٹھے شہ دیتے رہے۔ دیکھتے دیکھتے سارا باغ تاراج ہوگیا اور یہ کمینے کوّے میرے درختوں ہی پر نہیں میرے مکان کے چپہ چپہ پر شادی کی سال گرہ در کنار ہنی مون منانے لگے۔

چند ہی دنوں بعد کالے پیلے چیونٹے اپنی اپنی شادی یا شادی کی سال گرہ منانے کے لیے نکلنا شروع ہوں گے۔ اخباروں میں موسم کے بارے میں کچھ ہی خبر کیوں نہ ہو کہ موسیو مانسون کہاں چہل فرما رہے ہیں، یا کہاں جھک مار رہے ہیں۔ میں برسات کا یقین ہی نہیں کرتا یہاں تک کہ ایک دن دفعتاً معلوم ہوگا کہ خاکسار کے کھانے کی تبا کو پینے کی تبا کو میں خلل ہونے لگی ہے اور فدوی کا غریب خانہ جگہ جگہ سے چیونٹے اُگلنے لگا ہے۔ پھر مجھے یقین ہو جائے گا کہ برسات نازل ہوگئی۔ ٹھیک جس طرح انگلستان میں سرما کے آخری دور میں کسی صبح کو اُٹھ کر دیکھیں گے کہ وہ تمام درخت جو برف کی گرفت میں آکر سب کچھ کھو بیٹھے تھے، دفعتاً ایک صبح کونپلوں سے مرصع و مزین ہو گئے اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ بہار کا موسم آ گیا۔

کالے چیونٹے تو درو دیوار پر رینگنے لگیں گے۔ جیسے موزیک کے فرش کے کالے والے زندہ اور بیدار ہو کر صلح کا جلوس نکال رہے ہوں اور پیلے چیونٹے جہاں تہاں اسی طور پر نمودار ہوں گے۔ جیسے گذشتہ عالمی جنگ میں غنیم کی افواج کا کسی پوائنٹ پر اُبھار شروع ہوتا تھا اور یہ اُبھار پھٹ کر کسی طرف ٹوٹ پڑتا۔ ابھی یہ قصہ ختم نہ ہوتا کہ خبر آتی کہ دیمکوں نے میرے اچھے سے اچھے گلابوں سے کورٹ شپ شروع کر دی۔ آج اس درخت کا وصال ہوگیا اور کل اس کی نسل ماری گئی، اور یہ سب اس لیے کہ آس پاس کے جتنے حشرات الارض ہیں ان سب نے کورٹ شپ، ہنی مون، سال گرہ منانے اور وصیت نامے مرتب کرنے کے لیے مجھ غریب کے بیت الحزن کو منتخب کر لیا ہے۔ خدا جانے اس گھر کی کیا خاصیت ہے، اور یہ زمین و آسمان کے کس پاکٹ میں

آ گیا ہے کہ چاہے جو ہو شادی کی سال گرہ منانے کے لیے یہیں قدم رنجہ فرمائے گا۔ جیسے کسی زمانے میں ہمارے اس ملک کو دوسرے ملک والوں نے بنا رکھا تھا۔

اس کے بعد طوطے اپنی سال گرہ یا اپنا کوئی قومی تہوار منانے کے لیے میرے گھر کا رُخ کریں گے، اور ان پرے کا پرا اپنے قومی نعرے لگاتا ہوا میرے امرود اور شریفہ کے درختوں پر چھاپا مارے گا، اور ان کا کوئی علاج نہیں۔ اردو کے ایک شاعر نے زاہد سے شکایت کی ہے کہ میں نماز کیوں کر پڑھوں، اس لیے کہ جو تیری نماز کا وقت ہے وہی میری مے نوشی کا وقت ہے۔ شاعر کو اس شوخی اور شامت کی جو سزا دی جائے مجھے اس سے کوئی سر دکار نہیں، وہ تو یوں بھی حق بخشوائے رہتا ہے، لیکن میں کیا کروں ٹھیک جس وقت کہ میں صبح کے وقت خدا کے حضور میں گڑگڑاتا ہوں کہ وہ مجھ پر اور طوطے میرے پھل دار درختوں پر رحم فرمائیں، طوطوں کی سال گرہ پارٹی گلے پھاڑ پھاڑ کر پھلوں کو غارت کرتی رہتی ہے اور مجھے اپنی ہی نہیں سارے جہاں کی مخلوقات اور موجودات کی پیدائش، شادی کی سال گرہ یا وفات کی برسی پر لعنت بھیجنے پر اُکساتی رہتی ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ جہاں تک جشنِ زریں باری کا تعلق ہے شادی اور غمی کی تقریبات کا نتیجہ ہمارے ہاں یکساں ہے۔ شادی کے بعد ورثا اور وفات کے بعد وکلا! بچپن میں اپنے دیار میں اکثر ایک گانا سنا کرتا تھا۔ ''سکنا بولے رے اٹریا راما'' اس میں جو روایت اور حلاوت سموئی ہوئی ہے ان سے مدتوں لطف اندوز ہوا ہوں اور اب بھی جب اپنے آپے میں ہوتا ہوں یعنی طوطے آس پاس نہیں ہوتے تو اس سے بعض ترقی پسند خیالات و جذبات بیدار ہونے لگتے ہیں۔ مومن کا مشہور شعر آپ نے سنا ہوگا۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا! [1]

تو یہ کم بخت طوطے میرے آس پاس ہوتے ہیں چنانچہ میرے لیے مومن کا یہ شعر بھی غارت ہو گیا!

ہر تاریخ کا خاصا ہے کہ آ کر رہتی ہے، اور اس کا بڑا احسان ہے کہ وہ گزر بھی جاتی ہے۔ مجھے اپنی شادی کی سال گرہ سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی شادی کے عواقب، جن میں سال گرہ کی تقریب کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ میں خود اپنی شادی کی سال گرہ نہیں مناتا کوئی اور میری شادی کی

---

1 مومن

سال گرہ منائے تو میں اسے قتل بھی نہیں کر سکتا۔ اس کا سبب کچھ یہ بھی ہے کہ میں خود قتل ہونا پسند نہیں کرتا۔ اس کا قتل کیا جانا بڑی ذمہ داری کی بات ہے۔ بالخصوص مجھ ایسے شخص کے لیے جس پر نہ قوم کو فخر ہو نہ قاتل کو۔ اپنی شادی کی سال گرہ نہ منانے کے باوجود مجھے برابر معلوم ہوتا رہتا ہے کہ میری شادی کب ہوئی تھی۔ اس کے لیے تھوڑے سے حساب کتاب کی واقفیت کی ضرورت ہے۔ میں حساب میں کچا ہوں۔ آج سے نہیں عمر بھر سے، لیکن زندگی کے حساب کتاب اتنے دیکھے اور برتے ہیں کہ جتنے مکتبی یا مہاجنی حسابات ہیں وہ مجھ پر آئینہ کی طرح روشن ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ میں کتابی ہندسوں سے کام نہیں لیتا، اپنے انجام سے حساب لگاتا ہوں۔ مثلاً روپے پیسے کا حساب ہوا تو میں یقین سے بتا سکتا ہوں کہ بقایا میرے ذمہ نکلے گا۔ کسی سے لڑائی جھگڑا ہو تو قصور میرا نکلے گا۔ شادی کسی کی ہو سال گرہ کے اخراجات میرے ذمہ آئیں گے۔

خواتین کے بارے میں میرا ناچیز عقیدہ ہے کہ وہ کسی تقریب میں شرکت کی دعوت رد نہیں کر سکتیں۔ اپنی فضیلت اور دوسروں کے فضیحتے کو مشتہر کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں ہوتا۔ ممکن ہے یہی سبب ہو کہ وہ اپنے اپنے گھر والوں ہی کی نہیں بلکہ پاس پڑوس، احباب و اعزا سبھی کی سال گرہ یا سالِ تمام وغیرہ قسم کی تاریخیں بھی نہیں بھولتیں۔ تاریخیں نہ بھولنے کا انھوں نے ایک عجیب گر نکالا ہے وہ ہر واقعہ کی یاد کو اپنے کسی کارنامے سے ربط دے لیتی ہیں۔ مثلاً وہ بیاہ کر آئیں تو کس کا کون سا بچہ کس عمر کا تھا یا کوئی دوسرا بیاہ کر آیا تو اُن کا کون سا بچہ کہاں اور کس حال میں تھا۔ وہ اپنی شادی ورنہ کسی نہ کسی بچے کی عمر سے دنیا کے ہر واقعہ کو کہیں نہ کہیں سے جوڑ دیں گی۔ آپ ہی بتایئے جس کے بے شمار اولاد ہو اس کے یہاں سال گرہوں کے منانے اور پتہ لگانے کی کیسی کیسی سہولتیں فراہم ہوں گی۔

میں حساب ہی نہیں حافظہ کا بھی کچا ہوں۔ مجھے واقعات تو کبھی کبھی یاد رہتے ہیں، لیکن سنہ وقوع یا تو بالکل یاد نہیں رہتا یا یقیناً غلط یاد آتا ہے۔ مثلاً تاج محل کے بارے میں مجھ سے کوئی شریف آدمی پوچھے کہ کیا ہے تو میں بے تکلف کہہ دوں گا کہ تاج محل اہرام مصر نہیں ہے، لیکن اگر کوئی مفسد یہ پوچھے کہ ان میں کس کی تعمیر پہلے ہوئی تو کوئی تعجب نہیں اگر میں یہ کہہ دوں کہ میں اس جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا اور یہ محض اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ یہ بتانے میں مجھ سے

ضرور چوک ہوگی اور پوچھنے والا میرے جواب سے اس بدتمیزی سے لطف اُٹھائے گا کہ مجھے تاج محل اور اہرام مصر دونوں سے للّھی ہو جائے گی۔

خواتین کی مانند نہیں تو اُن کے احترام میں، میں کوئی ایسی تاریخ نہیں بتا سکتا جس سے میرے یا اُن کے بارے میں ناخوش گوار نتائج نکالے جا سکتے ہوں۔ شادی کی سال گرہ کے بارے میں کچھ کہنا یا اس کی تاریخ کا پتہ دینا بعض سنجیدہ اور وقیع مصالح کے خلاف پڑتا ہے۔ میں تو صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری شادی ضرور ہوئی اور بے شمار سال گرہوں کے مواقع آئے، لیکن دوسری بے شمار سال گرہوں میں تاریخوں کا ایسا تصادم ہوتا رہا کہ مجھے اپنی سال گرہ سے ہمیشہ دست بردار ہونا پڑا۔ جہاں کہیں اور جب کبھی کسی حق سے دست بردار ہونے کا سوال اُٹھا ہر شخص کی نظر میری طرف اُٹھی ہے! اور نہ بھی اُٹھے تو ایسے مواقع پر میرا ضمیر اُٹھ کھڑا ہوا ہے اور میں بیٹھ گیا ہوں۔ جس شخص کا ضمیر اس درجہ خود پسند اور مصلحت ناآشنا ہو اس کی شادی کی سال گرہ کو کون خاطر میں لائے گا۔

کچھ دن ہوئے ایک نہایت معمر، مشہور اور معزز میاں بیوی کی سال گرہ کی تقریب کا حال ایک اخبار میں پڑھا تھا۔ بتایا یہ گیا تھا کہ عین جشن کے موقع پر بجلی کی روشنی بند ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب روشنی واپس آئی تو لوگوں نے دیکھا کہ میاں بیوی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے بت بنے بیٹھے تھے! اس واقعہ کو میں نے اپنے ایک عزیز دوست کو سنایا تو بولے اگر یہ واقعہ میری شادی کی سال گرہ پر پیش آتا تو کچھ تعجب نہیں میں بھی کچھ اس قسم کی حرکت کرتا۔ یہ اور بات ہے کہ "ہم دونوں کا ہاتھ اپنے اپنے کانوں پر دھرا ہوا ہوتا۔"

(نشریہ)

●●●

قہرِ درویش

بہرِ تسکیں دل نے لے لی ہے غنیمت جان کر
وہ جو وقتِ ناز کچھ جنبش ترے ابرو میں ہے

آج میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ میگزین کے لیے کوئی مضمون تیار کرلوں، کچھ دیر میز کے سامنے بیٹھا رہا، قلم اُٹھایا، کاغذ سامنے رکھا اور پھر سوچنے لگا۔ دماغ تو موضوع کی تلاش میں تھا، لیکن قلم نے روشنائی اُٹھا کر کاغذ کے کسی گوشہ میں ایک نقطہ بنایا، نقطہ نے بڑھ کر سطر کی صورت اختیار کی، سطر نے اطراف و جوانب میں بڑھنا شروع کیا، کچھ خطوطِ منحنی نیچے اوپر کھینچ دیے گئے، کچھ بیضاوی مخروطی اور ناہموار دائرے نمایاں ہوئے تھوڑی ہی دیر میں مثلث اور مستطیل شکلیں ظاہر ہونے لگیں، اس کے بعد خود بخود کچھ گل بوٹے بننے لگے۔ غرض کہ دیکھتے دیکھتے تمام صفحہ طبیعات کا وہ نقشہ بن گیا جس میں موسمی بحری ہواؤں کا رُخ پیش کیا جاتا ہے، اور جس کی ساتھ ساتھ سیدھے ترچھے خطوط میں کسی ملک کی آبادی یا وہاں کی پیداوار کا تناسب پیش کیا جاتا ہے، لیکن اس میں صرف اس قدر تصرف کیا گیا تھا اور جو کسی حد تک ایک اضطراری فعل تھا کہ خواہ کوئی کتنا ہی غور کرے یہ ظاہر نہ ہو سکے کہ بحری ہوائیں کہاں سے اُٹھتی ہیں اور بری آبادی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد چونکا، اور اس کی ذمہ دار ایک خوانچہ والے کی مسیحا نفسی تھی، تو معلوم ہوا کہ تصوراتِ ذہنی کا ہو بہو نقشہ پیشِ نظر ہے!

دوسرا صفحہ اُٹھایا، لیکن دماغ کا رجحان تھا یا ڈائننگ ہال کے کھانے کا ذائقہ، ہزار سر مارے تبدیلی ناپید، گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا کہ کوئی بہانہ مل جائے تو اُٹھ کھڑا ہوں، لیکن ہر چہار طرف سناٹا تھا، سامنے کتابیں تھیں، دیوار پر تصویر آویزاں تھی، ایک طرف ٹینس ریکٹ رکھا ہوا تھا، مایوسی کا عام تسلط تھا کہ میری نظر یک بہ یک چارپائی پر جا پڑی۔ پھر کیا تھا عضلات میں ایک خوش گوار تکان محسوس ہونے لگی، اعضا میں ایک خفیف سا تشنج پیدا ہوا۔ میں نے بھی خیال کیا کہ پھر ایسے بہانہ کی کب توفیق ہوگی، قلم پھینک دیا، کاغذ میز کے نیچے گیا اور میں چارپائی پر بہ خطِ مستقیم متوازی تھا، خدا کا شکر بجالایا۔

رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گزشت!

....

شام ہوئی، ٹینس کھیل کر کمرہ پر واپس آیا، تو پھر وہی خیال آنے لگا جس سے کن دقتوں سے دن میں نجات ملی تھی، لیکن اب دفع الوقتی کے بہت سے مواقع تھے۔ میں یہ سمجھ چکا تھا کہ آج مقابلہ کی بہت گنجائش ہے، کھانا کھایا، اس کے بعد بات چیت کا آغاز ہوا۔ میں اس فکر میں تھا کہ یہ سلسلہ دیر تک قائم رہے تاکہ اگر میں پھر کام کرنے سے اغماض کروں تو کوئی شریف شخص (خاص علی گڑھ کے معنوں میں) مجھے مورد الزام نہ ٹھہرائے۔ لیکن میرے کوفت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ لوگ رحلت کی تیاریاں کرنے لگے ہیں۔ ایک صاحب نے جن کو کھانسنے کا خاص ملکہ ہے اور جسے انھوں نے ایک مستقل فن بنا رکھا ہے فرمانے لگے: ''اب میں جاؤں گا... سردی زیادہ ہے.... بہت دیر ہوگئی..... میں صرف پندرہ منٹ کے لیے آیا تھا.... کیا بتاؤں کیسے اتنی دیر لگادی۔'' (نقطوں سے کھانسنے کا زیر و بم ظاہر ہوگا) اتنے عرصہ میں وہ کتنی ضربیں لگا گئے اس کا بہ مشکل اندازہ ہوسکتا ہے۔ دوسرے صاحب نے ایک مختصری انگڑائی لی اور کھڑے ہوکر اس شاعرانہ ورزش (اگر یہ دونوں الفاظ ساتھ ساتھ استعمال کیے جاسکتے ہیں) کو شاعرانہ ہی طریقہ سے نباہتے ہوئے فرمایا: ''تخفیف تصدیعہ کروں گا رات زیادہ آئی'' غرض کہ یہ بھی جاتے رہے۔ اب لے دے کر ہمارے خان صاحب رہ گئے تھے جنھوں نے فوراً لحاف پوش ہوکر ایک نہایت غیر ذمہ دار کروٹ لی اور چلتے چلتے یہ کہہ گئے: ''جناب لیمپ گل کر دیجیے گا، ذرا دیکھئے گا

دیاسلائی کہاں ہے، میرے سرہانے رکھ دیجیے گا۔'' مجھے پہلے ہی سے یہ توقع نہ تھی کہ خاں صاحب حقِ رفاقت ادا کرسکیں گے۔ ان کو تو ایک بجے شب سے بارگاہِ یونیورسٹی میں فریضہ تہجد ادا کرنے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے اور شام ہی سے پیٹ بھر بھر کر جمائیاں لیتے رہتے ہیں۔ غرض کہ اب میں تھا اور شب کی تنہائی، اپنے کمرہ میں واپس آیا اور اس خیال پر سخت پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ آخر دنیا کی حماقت گاہ میں لوگ اوقات اور سوم کی پابندیوں سے اپنی زندگی کیوں تباہ کر رہے ہیں، یہ کیا ضروری ہے کہ چوں کہ رات زیادہ گزر چکی ہے اس لیے دنیا کے تمام مشاغل ملتوی کر دیے جائیں اور صرف سونے کی فکر کی جائے۔ چوں کہ دوپہر ہے اس لیے کھانا کھا لینا ضروری ہے، حالاں کہ کھانے کے لیے صرف کھانے کی ضرورت ہے وقت کا اس میں کیا دخل؟ مجھ پر اکثر لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ میں وقت بے وقت کبھی کھانے میں تامل نہیں کرتا، جو آتا ہے کھا لیتا ہوں اور جس طریقہ سے چاہتا ہوں کھاتا ہوں۔ کوئی ان بزرگوں سے پوچھے کہ کھانے کے لیے وقت کی قید کیسی، اس کے لیے تو محض موقع چاہیے۔

میرا خیال ہے کہ انسان کی تمام کلفتوں کا سبب واحد محض یہ ہے کہ وہ اوقات کا پابند ہے اور اس نے 'وقت' کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رکھی ہے، کیا اچھا ہوتا اگر انسان کوئی ایسی ترکیب نکال سکتا یا کسی ایسی دنیا کا مالک بن بیٹھتا جہاں 'وقت' کا احساس تک نہ ہوتا اسی بنا پر میں گھڑی کو انسان کا دشمن سمجھتا ہوں۔ مجھے اس کی خاموش رفتار اور غیر ذمہ دار ٹِک ٹِک، کی آواز سے سخت اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔ یہ مسلّمہ ہے کہ ہماری زندگی ہمارے سر پر خواہ مخواہ تھوپی گئی ہے، کیوں کہ مجھے اس کا یقین ہے کہ اس مسئلہ میں اگر میری رائے لی جاتی تو میں اسے قبول کرنے سے پہلے اربابِ قضا و قدر سے اس بات کا وعدہ لے لیتا اتنے بڑے، لیکن ناگزیر ایثار کے بعد میں اس سرمایۂ جہالت کا تنہا مالک بنوں گا، لیکن اس کا کیا علاج وہاں حکومتِ آئینی کا کسی نے خواب ہی نہیں دیکھا ہے اور بیسویں صدی کے دورِ حرّیت میں بھی وہاں شخصی حکومت کا دور دورہ ہے۔ اس حکومت کا اقتضا ہی یہ ہے کہ محکوم کے دل سے اجتہادِ فکر فنا ہو جائے۔ آج دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟ محض ایک رقصِ پیہم، ہر شخص متحرک ہے، کسی کو ٹھہر کر غور و فکر کرنے کی مہلت ہی نہیں، مہد سے لحد تک بس اضطراری حرکات کا سلسلہ ہے۔ میں کہتا ہوں، اگر دنیا کے بیش تر لوگ تھوڑی

دیر کے لیے رُک کر اپنی اپنی حالتوں پر غور کر لیں تو اُن کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں محض حماقت ہے۔ ان میں صلاحیت اور باتوں کی ہے جس میں وہ زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں، لیکن انھوں نے اپنے آپ کو خواہ مخواہ مجبور تصور کر کے اور محض خودکشی کے ارادہ سے ''گزرگاہِ سیل'' پر ڈال دیا ہے۔ پھر ستم ظریفی یہ کہ سیلاب کی تیز و تند رو کو اپنے دست و بازو کا رہینِ منت بھی سمجھتے ہیں، اور یہ نہیں خیال کرتے کہ اُن کا ہاتھ پاؤں مارنا محض سیلاب کی بے پناہ رفتار کو بڑھاتا ہے، کاش ان کو اس کا یقین ہوتا۔

دریا بوجودِ خویش موجے دارد
خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست [1]

ہم میں سے تقریباً ہر ایک کے سامنے کوئی مقصد ہوگا، کسی کو روپیہ کمانے کی فکر ہے، کسی کو نام و نمود کی تمنا ہے، کسی کو حسن و عشق کی خلش ہے، کوئی مسلم یونیورسٹی میں شریک ہونا چاہتا ہے، کوئی الٰہ آباد یونیورسٹی کا شیدائی ہے، کوئی مانیٹر بننا چاہتا ہے تو کسی کے سر میں پریسیڈنٹی کا سودا ہے اور بالفرض کوئی ایسا بھی ہے، جسے ان میں سے کسی ایک کی بھی تمنا نہیں ہے تو پھر مارک کی قیمت گھٹ جانے سے جرمنی جانے کا خیال تو شاید سب سے زیادہ معصوم تفریحِ ذہنی ہے۔ اس کے تسلیم کرنے میں تو اسے محض ایک شاعرانہ تبسّم کی ضرورت ہوگی خواہ اس کی اس میں اہلیت ہو یا نہ ہو، لیکن میں دعوے سے کہتا ہوں (دعویٰ) کا لفظ یہاں محض اضطراری طور پر سبیلِ تذکرہ آ گیا ہے ورنہ میں اسے ان مہملات میں شمار کرتا ہوں جو ''شرمندۂ معنی نہ ہوئے'' اگر اصحاب متذکرہ اپنے اپنے موجودہ مشاغل کا جائزہ لیں اور ان کو اس بات کا یقین دلا دیا جائے کہ کسی انسان کا تو کیا ذکر ان کی غور و فکر کی اطلاع اسے بھی نہ ہوگی جس کے وجود کے وہ قائل ہیں، صرف اس کی صفات کے منکر ہیں، تو ان کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ جو کچھ خیال کر رہے ہیں وہ ہے غلط اور کس قدر غلط!!

میں اسی اُدھیڑ بن میں تھا، لیکن کم بخت گھڑی تھی کہ اپنے اسی فلسفیانہ استغنا کے ساتھ ٹک ٹک کرتی جاتی تھی جس کے خلاف ''ورک'' (یونین کے زمانۂ انتخاب کا عجیب المعنی لفظ)

---

[1] دریا اپنے وجود کے ساتھ موج بھی رکھتا ہے غرور و تمکنت کا تنکا اس کی کش مکش میں رہتا ہے۔

کرنا میری زندگی کے مقاصدِ عالیہ میں سے ہوگیا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں متواتر گھنٹوں کی آواز آنے لگی، پہلے تو میں نے خیال کیا کہ اسی کم بخت گھڑی کے پرانے گرد گھنٹال کلاک ٹاور سے حسبِ معمول بے ہنگام ضربیں لگا رہے ہیں، لیکن معاً خیال آیا کہ آج دسمبر کی 31/تاریخ ہے۔ مولانا 1921ء کا وصال ہو رہا ہے۔ حضرت اس وقت سنبھالا لے رہے ہیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں 1922 کا سرکاری طور پر داخلہ ہوگا۔ اب وہ ساعت آگئی تھی جس میں مجھے خواہ مخواہ کے لیے سیریس (سنجیدہ) بننا پڑا اور 1921 کو الوداع کہتے ہوئے مجھے ان کے ایک ایک کارنامے یاد آنے لگے۔

1921 کے عہدِ قہر میں ہم نے بڑی بڑی پامالیاں دیکھیں، سینکڑوں رسوائیاں جھیلیں اور ہزاروں آفتیں اُٹھائیں پھر اگر اُن ارمانوں کا ماتم کریں جن کا گہوارہ اور تابوت

مزارِ کشتۂ صد آرزو، معاذ اللہ!

خود ہمارا قلب رہ چکا ہے تو ہم کو کون موردِ عتاب بنا سکتا ہے؟

1921 سے قبل جنگِ یورپ کے شعلے بھڑک چکے تھے، خون کے فوارے چھوٹ چکے تھے۔ بیواؤں، یتیموں، بوڑھوں اور جاں بہ لب زخمیوں کے کراہنے کی آواز آنے لگی تھی، لیکن ہاں شعلے کام کر چکے اب سوز و گداز کا وقت ہے۔ خون کے چھینٹے قاتل کی آستین و دامن پر ہیں اور کراہنے کی آواز عرش کے پایوں کو چھونے والی ہے۔

اے رخصت ہونے والے مہمان، جانے کو تو تُو جا رہا ہے، لیکن تجھے کچھ معلوم بھی ہے ان لوگوں کا کیا حشر ہوا جن کا تو اتنے دنوں تک مہمان رہ چکا ہے۔ تجھے معلوم ہے طرابلس کے شہیدوں کا خون، جس میں کبھی تازگی اور حرارت بھی تھی کن ذرّات میں پیوست ہوگیا اور وہ ذرّات ساکت ہیں یا مضطرب، سیّال ہیں یا منجمد کسی دامن پر ہیں یا منتظم حقیقی کی جستجو میں صحرائے اعظم کی شربا رسوم کی لپیٹ میں، قسطنطنیہ کی شانِ امارت باسفورس کی کن لہروں میں دفن ہے۔ جزیرۃ العرب اور بیت المقدس کی امانت جن سینوں میں ودیعت تھی ان کا پتا تو بتلا، گنبدِ خضریٰ کے نام لیوا کہاں گئے، کعبہ کی حرمت پر کٹ جانے والوں کا کیا حشر ہوا، پنجاب کے کن کن دریاؤں میں خونی کفن بہائے جا چکے ہیں، ہندوستان کے کون کون محبس زندانِ یوسف بن چکے ہیں۔ تیرے اعمال کا ہر صفحہ مرقعِ عبرت ہے تو نے روس کی جبروتیت کو خاک میں ملا دیا، وہ زار کہاں ہے

جس کی شانِ قہاری سے بڑے بڑے سورماؤں کا زہرہ آب ہوتا تھا، اس کے وہ عالی شان قصر و محل کہاں ہیں جن کے اندر شبستانِ عشرت بھی تھا اور فنا کے تاریک غاروں کا نزدیک ترین راستہ، جرمنی کی فلک شکن توپیں اور خون آشام اسلحہ اب انسانی بھینٹ کے لیے صدائے ھل من یزید کیوں نہیں بلند کرتے۔ قیصر کی قیصری کہاں ہے تجھے معلوم ہے اشرف المخلوقات انسان اب کہاں پہنچ گیا ہے۔ اس کی زبان اس کے قلب کی کہاں تک ترجمانی کرتی ہے اور اس کے قلب کی حرکت ذاتی منفعت سے کہاں تک وابستہ ہے۔ اعلائے کلمۃ الحق کب تک گناہ سمجھا جائے گا، اور اب کون وقت آئے گا جب ہم یہ سمجھیں گے کہ دنیا میں زندگی سے بھی زیادہ عزیز چیزیں پیدا کی گئی ہیں کیا وہ لمحات اس وقت آئیں گے جب نہ لمحات باقی رہیں گے اور نہ ان کے اثرات!

لیکن گزرنے والے مہمان کا تذکرہ ہمیشہ اچھے الفاظ میں کرنا چاہیے۔ اس لیے نہیں کہ وہ اوصاف حمیدہ کا مجسمہ ہوتا ہے بلکہ محض اس خیال سے کہ وہ اس دنیا کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنے پر مجبور کیا جا رہا ہے جس کی دائمی مفارقت کا خیال ہر متنفس کو ایک لمحہ کے لیے لرزہ براندام کر دیتا ہے۔ موت ایسی چیز ہے جو دشمن کے لیے بھی گوارا نہیں کی جا سکتی، اچھا الوداع۔ خدا حافظ!

گھنٹہ کی ماتمی آواز بلند ہوئی۔ منٹ اور گھنٹہ کی سوئیاں 12 کے ہندسہ پر پہنچ چکی ہیں اور ہم اپنے نئے مہمان 1922 کو "خوش آمدید" کہتے ہیں!

....

حدیثِ دل کشِ من خواب بُرد از چشمِ خاصاں را
شب آخر گشت و افسانہ از افسانہ می خیزد [1]

یہاں تک تو جگ بیتی تھی، اب "میری باری آئی۔"

میگزین کا کام سنبھالتے ہوئے آج کم و بیش تین سال ہوتے ہیں، لیکن 1921 میں جیسے کچھ سوانح سر سے گزر گئے۔ اس کا تذکرہ شروع کروں تو کلکتہ یونیورسٹی کمیشن رپورٹ کو ہمارے ناظرین یک قلم فراموش کر دیں گے۔

1۔ میری دلچسپ داستان خاص لوگوں کی آنکھوں سے بھی نیند غائب کر گئی۔ رات کا آخری پہر آ گیا اور افسانے میں سے افسانہ نکلتا چلا جا رہا ہے۔

خدا جانے کیسی نا فرجام ساعت تھی جب میں نے میگزین کے چندہ بڑھانے کی تحریک کی، کتنے اہل یا نااہلوں کی ناز برداری کی، ان کی مشاعت کی، ان کی صحبت میں بیٹھا، ان کی معقول سی نامعقول باتوں کو پی کر رہ گیا۔ ان کے بھونڈے مذاق یا پھیکے اور بھدّے جملوں پر ان کے مزاج کے مطابق صدائے تحسین یا نفرین بلند کی۔ وہ مسکرائے تو میں ہنس پڑا، وہ ہنسے تو مجھے قہقہہ لگانے کی فکر ہوئی۔ غرض کہ کوئی ایسی بات اُٹھا نہ رکھی جس کے امرا اور رؤسا کے مصاحبین سے توقع کی جا سکتی ہے! کسی نہ کسی طور پر 4/ر کی بجائے میگزین کا چندہ 8/ر مقرر ہوا۔ برسات کی تعطیل ختم کر کے وسط اکتوبر میں واپس آیا تو لڑکوں کی تعداد میں معتد بہ کمی نظر آئی۔ کچھ اور ناگزیر دقتیں پیش آئیں، نتیجہ یہ ہوا کہ تعطیل نمبر جولائی لغایتہ اکتوبر، نومبر کے آخر ہفتہ میں شائع ہوا، ناظرین کو شاید یہ نہیں معلوم ہے کہ تعطیلوں میں ماہ بہ ماہ میگزین نہیں شائع ہوتا، کالج کھلنے پر مجموعی نمبر شائع کیا جاتا ہے۔ صرف پانسو کاپیاں تیار ہوئیں، کچھ خریداروں اور نامہ نگاروں کے پاس بھیجی گئیں کچھ تبادلہ میں دینی پڑیں جو بچ رہیں وہ طلبا میں تقسیم کی گئیں۔ وہ بھی اس طور پر کہ فرداً فرداً کاپیاں تقسیم کرنے کی بجائے فی کمرہ ایک کاپی حوالہ کی گئی، اور جن کمروں میں تین یا اس سے زیادہ لڑکے تھے اس میں دو دو کاپیاں دی گئیں۔ میں ڈے اسکالرس کا خصوصیت کے ساتھ زیر بار احسان ہوں کہ انھوں نے محض اس شرط کو قبول کر لیا کہ دو دو چار چار کاپیاں مختلف کتب خانوں اور دار المطالعہ میں رکھ دی جائیں۔ بورڈنگ ہاؤس میں کاپیاں تقسیم کرنے میں جو دقتیں پیش آئیں ان کا تذکرہ تکلیف دہ اور ناخوش گوار ہے۔ ہر صاحب سے فرداً فرداً اور مجموعی طور پر اپنی دشواری بیان کی اور ان کی شانِ عفو و کرم کو شفیع بنایا، لیکن ایک پیش نہ گئی۔

تعطیل نمبر شائع ہو جانے کے بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ کالج اور یونیورسٹی میں قریب قریب ہر متنفس شاعر، نثار یا نقاد ہے۔ اس معاملہ میں ممتاز ہاؤس کو ایک نمایاں خصوصیت حاصل ہے۔ جتنی نظمیں، یا نثر کے حصے مجھے یہاں سے موصول ہوئے ہیں وہ تقریباً سب کے سب سائنس کے طلبا کے فشار دماغی کا نتیجہ تھے۔ اگر ان کی جھنڈیاں بنائی جائیں تو اس بورڈنگ ہاؤس کے احاطہ کی بیرونی آہنی کٹھرے کی ہر سلاخ پر ایک ایک جھنڈی نصب کی جا سکتی ہے۔ غرض کہ نظم و نثر کے مضامین کا ایک سیلاب اُمنڈ آیا، نجات کا دروازہ ہر طرف سے بند تھا۔ کہیں پناہ نہیں

ملتی تھی، جدھر بھولے سے بھی نظر جا پڑتی وہیں سے کوئی نہ کوئی صاحب جھپٹے چلے آتے تھے۔ ہاتھ میں کاغذ کا ایک پلندہ ہے، جیب میں بیاض رکھی ہوئی ہے۔

''السلام علیکم''

''وعلیکم السلام''

''یہ مضمون لے لیجیے اور اسے جلد شائع کر دیجیے، میں میگزین کی خدمت کے لیے تیار ہوں اور کیوں صاحب فی کرہ ایک کاپی کے کیا معنی؟ اب تو میگزین کے آٹھ آنے ہو گئے ہیں۔''

جس تیور اور لب و لہجہ سے یہ حضرت گفتگو کر رہے تھے اس سے مجھے جائز طور پر یہ اندیشہ پیدا ہو چلا تھا کہ دیکھیے ان کے دست و بازو سے میرا نحیف جثہ کیسے عہدہ برآ ہوتا ہے۔ لیکن وہ جس بلا کی رفتار سے آئے تھے ویسے ہی غائب بھی ہو گئے ہیں، میں نے خدا کا شکر کیا۔

تھوڑی ہی دیر میں کمرہ پر ایک دوسرے بزرگ تشریف لائے، نہایت قرأت سے سلام علیک ہوئی۔ اگر کوئی نو آموز اس قرأت کو دو ایک بار دہرائے تو معدہ میں یقیناً نفخ یا قراقر پیدا ہونے لگے۔ اس جرِ ثقیل کا متحمل صرف عربی دانوں کا معدہ ہو سکتا ہے، مولانا وارِ مصافحہ کیا۔ معانقہ کی دُھن میں تھے، لیکن میں نے کسی قدر جرأت سے کام لیا اور اس بے تکے پن کا موقع نہیں دیا۔ کچھ ''علمی، تمدنی، معاشرتی، سیاسی'' مباحث پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد فرمایا ''یہ ایک مضمون حاضر ہے ہندوستان کے دیگر رسائل اس کے حاصل کرنے کے متمنی ہیں ان کے خطوط پر خطوط آ رہے ہیں، لیکن میں نے خیال کیا کہ اپنے ہی کالج کے رسالہ کی خدمت کرنی چاہیے۔ میگزین میں جگہ تو ہو گی، اب تو آپ کو آٹھ آنے ملنے لگے ہیں......

بہرحال ان سے بھی گلو خلاصی ہوئی۔

کچھ عرصہ کے بعد ایک تیسرے حضرت نازل ہوئے۔

''جبیں پر سادگی، نیچی نگاہیں، بات میں نرمی''

گفتگو کا سلسلہ چھڑا۔ آپ آدم جی پیر بھائی منزل سے کب اُٹھ آئے، گیسٹ ہاؤس میں کب سے قیام کیا؟ ...... یہ ایک غزل ہے، ذرا اصلاح دے کر شائع کر دیجیے۔ دیکھیے میرا نام نہ ظاہر ہو..... آٹھ آنے تو میگزین کے لیے کافی ہیں۔.......

ابھی زیادہ مدت نہیں گزرنے پائی تھی کہ ایک اور صاحب تشریف لائے۔ کچھ دیر تک تو ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں تو سمجھ گیا تھا کہ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ دیکھنا یہ رہ گیا تھا کہ آٹھ آنہ کا سوال یہ ابتدائے کلام میں اُٹھاتے ہیں یا ان کا بھی یہ ٹیپ کا بند آخر ہی میں ہوگا۔ فرمانے لگے، ''میگزین کب نکلے گا؟..... آخر آپ خود کالج کے موجودہ طلبا کے مضامین کیوں نہیں شائع کرتے؟ انھیں کیسے مشق ہوگی، آپ باہر والوں کے مضامین کیوں منظور کرتے ہیں؟.... اور کیوں..... صاحب یہ جب سے آپ یونیورسٹی کے نمک خوار ہوگئے ہیں، انگریزی کے نوٹس میں آپ کا لہجہ کیوں بدل گیا ہے؟ کالج میں کیا کیا ہوتا رہتا ہے پہلے تو آپ سب کے خیالات کی ترجمانی کرتے تھے، اور اب یہ حال ہے کہ آپ نے لب ولہجہ ہی نہیں بدل دیا، بلکہ بڑے بڑے معاملات گول کر جاتے ہیں۔''

غرض کہ

یہ زندگی ہماری ہے۔

....

ناظرینِ کرام نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ اس وقت ہم پر کیا گزر رہی ہے، نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ اچھا اب ہماری بھی سن لیجیے۔

میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ مضامین معلومہ کا کوئی ذکر چھیڑوں، لیکن آخر کیا کروں۔

می گزشتم زغم آسودہ کہ ناکہ زکمیں
عالم آشوب نگاہے سر را ہم بگرفت

معاملات طوالت پذیر ہیں اور ایسی حالت میں بہتر بھی ہے کہ میں اپنے ذاتی خیالات کا بے کم وکاست اظہار کردوں۔

مجھے کالج سے جو مضامین ملتے ہیں ان کو میں اگر شائع کرنے میں تامل کرتا ہوں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مجھے خدانخواستہ مضمون نگاروں سے کوئی کاوش ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یونیورسٹی میگزین کے معیار میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ مضامین کی مشق کے لیے میگزین کے

صفحات معذور سمجھے جائیں۔ مجھے کسی شخص کی دل شکنی منظور نہیں اور اس میں کالج کی یا کالج سے باہر والوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے، مجھے اپنے کالج کی عظمت کا احساس ہے۔ میں اس کے واحد ادبی رسالہ کے معیار کو کسی حالت میں پست نہیں کر سکتا۔ اب رہا یہ کہ اُن مضامین کی اشاعت سے اس نقص کا احتمال ہے یا نہیں، اس مسئلہ کا فیصلہ میں اس وسعت تک تنہا اپنے ہاتھوں میں رکھوں گا جب تک اس کی کامیابی کا بار میرے شانوں پر ہے۔ میں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا مذاق کسی عالم گیر ضابطہ واصول کا پابند نہیں ہے۔ میں مضامین کی اشاعت میں اپنے ''ذاتی مذاق'' کو اصلی معیار خیال کرتا ہوں۔ میں بذاتِ خود جس مضمون کو اچھا سمجھتا ہوں اسے شائع کرتا ہوں، ورنہ نہیں۔ ذوق کو میں ایک وجدانی چیز سمجھتا ہوں، اور اس میں صلاح مشورہ یا کسی انجمن کے فیصلہ کو نہیں مانتا۔ مجھے اپنی کمزوریوں کا بھی احساس ہے۔ اکثر میں نے ایسے مضامین بھی شائع کر دیے ہیں جن کو کسی حد تک میں اپنے مذاق کے منافی سمجھتا تھا، لیکن یہ محض کمزوری تھی۔ یہ کلیتہً نہیں بنایا جا سکتا، اور نہ اس سے فائدہ اُٹھانے کا جائز طور پر کسی کو حق حاصل ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے میں اپنے موجودہ طلبا یا اولڈ بوائز کے مضامین شائع کرتا ہوں، لیکن ہندوستان کے بلند پایہ ادیبوں کا اگر کوئی مضمون مل جاتا ہے، تو اسے اس خیال سے شائع کرتا ہوں کہ ہمارے سامنے یہ ادبی نمونے بھی موجود رہیں۔ میں شکایت کرنے والوں سے خود انصاف کا طالب ہوں، آج اُن کے یہ ارمان ہیں کہ اُن کے مضامین بھی شائع کیے جائیں۔ اگر میں نے ایسا کیا اور میگزین کا معیار پست ہو گیا تو کیا وہ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آئندہ بھی ان کی آرزوئیں ایسی ہی بے تاب ہوں گی!

ناظرین معاف فرمائیں مجھے مجبور ہو کر وہ باتیں کہنی پڑیں جن کو میں کہنا نہیں چاہتا تھا اب ذرا ''مشتے نمونہ از خروارے'' کا بھی لطف اُٹھالیں!

ایک کرامت نامہ کے ساتھ ایک مختصری نظم ڈاک سے موصول ہوتی ہے۔ لفافہ پر علی گڑھ ہی کی مہر ہے، اور مضمون نگار صاحب بھی طالب علم ہی ہیں۔

''جناب ایڈیٹر صاحب، تسلیم، مزاج شریف
آپ کے میگزین کے واسطے چند اشعار حاضر ہیں۔ اُمید کہ زیورِ اجابت سے متحلّی فرمائے جاویں گے۔

نیازمند
.... متعلم تھرڈ ایر

غیروں نے ستایا مجھے بیگانہ سمجھ کر — اپنوں نے مٹایا مجھے اپنا نہ سمجھ کر
آرام جگر، راحتِ جاں وسکونِ قلب — پہلو میں بٹھایا تمہیں کیا کیا نہ سمجھ کر
ساقی نے مجھ غریب پہ جادو سا کر دیا — اک لیب میں پہنچا اسے میخانہ سمجھ کر

....

دو چار اشعار اور ہیں۔ لیب کو پہلے میں نے سمجھا کہ شاید دو ایک لفظوں کی کمی رہ گئی ہے ورنہ لیپ (جست) ہو جاتا، لیکن آخر میں مضمون نگار صاحب نے اس کی وضاحت یوں کر دی، ''لیب سے لیبورٹری مفہوم ہے۔''

دوسرا نمونہ:

تمہارے غلّہ کی یوں غیر کو خبر نہ ہوئی — کہ بال بھر کی کوئی بات بانس بھر نہ ہوئی
ہمارے کہنے کو ہر وقت ٹالتے ہی رہے — عدو کے ساتھ تمہیں کچھ اگر مگر نہ ہوئی
صدا یہ ماہِ محترم کسی کے گھر میں رہا — ہلالِ عید کی رویت کبھی ادھر نہ ہوئی

'صدا' یہاں تخلص نہ سمجھ لیا جائے۔

تیسرا نمونہ:

کم ظرف ہے جب کاسۂ چشم اس کی نظر سے — شکوہ ہے مجھے کوزۂ ادراک بصر سے
پُتلی ہے میرے آنکھ کی اُسے روح تو جس طرح — مجھ کو یہی نسبت ہے حقیقت کی نظر سے
خنجر میں تیرے مخفی ہے اے شوخ، میری جاں — قاتل مجھے مت گھور تو سفاک نظر سے

....

یہ حالت تو نظم کی تھی، نثر کا اسی سے اندازہ کر لیجیے، محض بخوفِ طوالت میں اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں۔ برسبیل تذکرہ اتنا عرض کروں گا کہ نثر چوں کہ نظم کی بعض قیود سے آزاد ہے اس لیے ہمارے دوستوں نے اس میں خوب خوب دادِ شجاعت دی ہے۔ ''شہد کی مکھی'' سے لے کر ''فلسفۂ محبت'' تک مضامین کے عنوان رکھے گئے ہیں، لیکن ان میں ایک خاص خوبی یہ ضرور تھی جس کا مجھے اعتراف ہے کہ محض کاغذ کی شکل، سوادِ خط اور صرف دو چار سطروں کو سرسری طور پر دیکھ لینے سے آپ یقینی طور پر ایک ہی صحیح نتیجہ استنباط کر سکتے ہیں!!

....

مجھ پر الزام لگایا گیا ہے کہ میرا لب ولہجہ بدلا ہوا ہے، لیکن ناظرین غور وفکر سے کام لیں گے تو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اب میرا لب ولہجہ ہی باقی نہیں رہا۔ بدلنے کا سوال تو اس کے بعد پیش آنا چاہیے۔ تعطیلوں سے ٹھیک قبل میگزین کا جو نمبر شائع ہوا تھا اس میں میرے نوٹس کالج کے اربابِ حل وعقد کے نزدیک قابلِ اعتراض سمجھے گئے۔ مجھے یہاں تفصیلات پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی، میں صرف نتائج کا اظہار کروں گا۔ طے یہ کیا گیا کہ آئندہ سے میں جو اڈیٹوریل نوٹس لکھوں وہ پہلے منظوری کے لیے پیش کیے جائیں، اس کے بعد ان کی اشاعت ہو۔ اب میرے سامنے صرف دو راہیں کھلی تھیں یا تو میں اس عافیت سوز تجویز کو قبول کر لیتا یا پھر عطائے تو بہ لقائے، کہہ کر میگزین کو ان کے حوالہ کر دیتا۔ ناظرین کو نہیں معلوم کہ اس تجویز نے میرے احساسِ خودداری اور عزتِ نفس کو کیسا مجروح کیا۔ غیرت کا یہی تقاضا تھا کہ اب پیانہ لبریز ہو چکا ہے، الوداع کہو۔ اُلفت کا اصرار تھا امتحان کا وقت ہے، پاؤں کو لغزش نہ ہو۔ میں اس کش مکش میں عرصہ تک رہا اور بالآخر یہی فیصلہ کر سکا کہ جس نخل کو اتنے دنوں تک خونِ جگر سے سیراب کیا ہے اسے کچھ تو پھلتے پھولتے دیکھ لوں۔ مجھے اس کا یقین تھا کہ کالج میں ایسے لوگ ہیں جن کے تبحرِ علمی کے سامنے میری کوئی حقیقت نہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میرے ایسا دیوانہ کوئی نہیں ہے۔ کم سے کم کچھ دنوں کے لیے تو میگزین کی ترقی رُک جائے گی، جس کا میں متحمل نہ ہو سکوں گا۔ میں نے آخر کار پہلی تجویز کو قبول کر لیا۔ اب میں انگریزی کے نوٹس جو کچھ لکھتا ہوں اس کی منظوری حاصل کرتا ہوں۔ اس لیے براہِ کرم آپ میرے لب ولہجہ کو

متہم نہ کیجیے۔ میری اس وارفتگی کو البتہ ہدفِ ملامت بنائیے جو مجھے میگزین کے ساتھ ہے اور جس کی بدولت آپ کو عتاب کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ہاں، ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی ضرور ہے، ناظرین خیال کرتے ہوں گے۔ مجھے میگزین کے ذریعہ سے کوئی مالی نفع حاصل ہوتا ہے، اس کا جواب صرف یہ ہے کہ کچھ نہیں! مجھ سے قبل یہ سب کچھ تھا، ایڈیٹر کو معاوضہ ملتا تھا۔ ایک منشی تھا ایک چپراسی، اردو کا ایڈیٹر الگ تھا انگریزی کا الگ۔ اب صرف میں ہوں اور تین سال سے سر کھپا رہا ہوں۔ اس سال سے ایک چپراسی البتہ رکھ لیا گیا ہے۔ ناظرین خیال فرمائیں اس میں کون سی قابلِ رشک بات ہے! جس کی بنا پر میری نیت مورد الزام ٹھہر سکتی ہے!!

....

جس وقت یہ میگزین ناظرین کرام کی خدمت میں باریاب ہوگا سالِ نو کا آغاز ہوگا۔ میں میگزین کی جانب سے اپنے کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی توجہ اور عاطفت میرے مساعی کی معین رہی اور جن کے قابلِ قدر مشوروں نے مجھے میرے ارادوں میں کامیاب کیا۔ خدا سے دعا ہے کہ ان کو

سالِ نو مبارک ہو

اور وہ اس مجموعی نمبر کو ملاحظہ فرما کر آٹھ آنے کا سوال بالکل غیر شاعرانہ طریقہ سے نہ اُٹھائیں۔

(علی گڑھ میگزین۔ نومبر/دسمبر 1921)

●●●

سگ گزیدہ

علی گڑھ میں حاجی بلغ العلیٰ کا نزولِ اجلال فرماتا تھا کہ مجھے ایک کتے نے کاٹ کھایا۔ یہ حادثہ بذاتِ میرے لیے کیسا ہی کچھ نہ ہو، حاجی صاحب کی توہین ضرور ہوئی۔ لوگ دوڑے کتا پہلے جا چکا تھا۔ انھوں نے کہا ''سگ نہیں سنگ گزیدہ ہی سہی۔''

اپنی آنکھوں کو تماشا چاہیے

کوئی دور سے اس منظر کو دیکھتا تو یقیناً اس نتیجہ پر پہنچتا کہ کتے نے مجھے نہیں بلکہ میں نے کتے کو کاٹ کھایا ہے۔ بہ یک وقت اور بہ یک زبان پوچھ رہے ہیں ''کیسے کاٹا؟ کس نے کاٹا؟ کیوں کاٹا؟ کیسا تھا؟ کدھر گیا؟ پاگل تھا؟ بھونکتا تھا؟ دُم کیسی تھی؟ توبہ توبہ.....لاحول ولاقوۃ...الخ۔''

میں حیران کہ سنجیدگی سے جواب دوں تو اُس کا کوئی موقع نہیں دیتا۔ بگڑتا ہوں تو کتے کے پاگل ہونے سے زیادہ اپنے پاگل ہونے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ عجیب شش و پنج میں تھا کہ لوگوں نے کہا ''ایک نعرۂ حیدری، یاحسین'' چلو اسپتال لے چلو۔ اب حلیہ یہ ہے جیسے کسی ہندو مسلم فساد کے مضروب کو پولیس والے لے جاتے ہوں یا دن میں کوئی چور پکڑا گیا ہو، پھر کسی کانفرنس کے پریسیڈنٹ صدارت کرنے جا رہے ہوں اسپتال لایا گیا۔ کاربولک ایسڈ سے روشناس ہوا۔ سگ گزیدگی کا سارٹیفکٹ اور کسولی کا پروانہ راہ داری لایا۔ ڈاکٹر صاحب پوچھتے ہیں ''کتا کیوں نہیں پکڑا گیا؟'' لوگوں نے کہا۔ ''وہ کہیں چلا گیا فی الحال یہ حاضر ہیں۔'' ڈاکٹر صاحب فرماتے

ہیں ''کتے کو پکڑ کر دس دن نگرانی میں رکھنا چاہیے ورنہ اس کا ایک چچہ بھیجا کسولی بھیجنا چاہیے تا کہ معلوم کیا جا سکے گا کہ پاگل تھا یا نہیں'' میں نے سوچا کہیں ہمارے رفقا یہاں بھی مجھے کتے ہی کی بجائے پیش نہ کردیں۔ میں نے عرض کیا کہ جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ کہیں سگ گزیدگی کا مرض تو متعدی نہیں ہے۔ فرمایا ''نہیں'' بارے اطمینان ہوا۔ مکان واپس آیا۔ یہاں بیوی بچے ماما وغیرہ وغیرہ کی ایگزیکیٹو کونسل قائم تھی۔ سوال ہوا تم تو اچھے خاصے بیٹھے تھے۔ کتے سے کیسے اُلجھ پڑے۔ تمام دنیا کو تو منع کرتے پھرتے ہو کہ کتے کو نہ مارو، بلّی کو نہ ستاؤ۔ آج اس کتے سے کیسے بھڑ گئے؟'' میں نے کہا میں باہر دروازہ پر کھڑا تھا۔ یہ کتا بھاگا بھاگا آیا۔ دروازہ پر مجھے دیکھ کر رُکا۔ میں نے سمجھا واپس چلا جائے گا، لیکن رُکنے کے بعد بھی وہ مکان میں گھس آیا مجھے اس کی جرأت پر ہنسی آئی اور میں بھی مکان میں چلا آیا اور دروازہ پر کھڑا ہو گیا۔ وہ نکلنے پر آمادہ ہوا تو میں نے اپنے سلیپر سے تفریحاً تنبیہ کرنی چاہی۔ اُس نے بدمذاقی کی اور مجھ سے اُلجھ پڑا۔ صدر (بیوی) نے فرمایا ''بھلا اس تفریح کا کیا موقع تھا۔'' میں نے کہا محض اتفاق۔ فرمایا اچھا اتفاق رہا۔ اتفاق کس جانور کا نام ہے؟ میں نے کہا یہ وہی جانور ہے جس نے ہمارے اور تمہارے والدین کے اصرار و آرزو پر آج چار سال ہوئے مجھے اور تمہیں دونوں کو کاٹ کھایا تھا۔ بہر حال کونسل برخاست ہو گئی۔

اب سوال یہ پیش تھا کہ کتا پاگل تھا یا نہیں اور مجھے کسولی جانا چاہیے یا نہیں۔ دیوانوں اور فرزانوں میں اس کے متعلق سخت اختلاف آرا تھا۔ بالآخر یہ مسئلہ حاجی بلغ العلیٰ صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ انھوں نے فرمایا ''جانا بھی چاہیے اور نہ جانا بھی چاہیے۔'' میں نے کہا یہ کیوں کر فرمایا تم چیلاں کے کوچہ چلے جاؤ اور میرے سجادہ نشین حاجی مجذوب سے ملو۔ وہ سگ گزیدہ کا علاج بالمثل کرتے ہیں اور آج کل ''ہمدرد'' میں اُن کے متعدد مجرب، لیکن طویل نسخے نکل رہے ہیں اگر یہ راس نہ آئے وہ ''کریڈ'' کے دورِ جدید کے چند نسخے حوالے کر دیں گے اگر تم کو یقین نہ آئے تو لالہ پال سے دریافت کر لینا۔ وہ براسو کا ایک نقش بھی دیں گے۔'' میں نے کہا، ''پھر اسی سلسلہ میں قرول باغ میں اپنے مرشد [1] سے بھی کیوں نہ ملتا آؤں۔'' کہنے لگے ''ہاں ان کو جو جلسو کا عمل آتا ہے، کیوں کہ جرمنی سے آنے کے بعد وہ دوڑ میں اتنے مشاق ہو گئے ہیں کہ مولانا جے راج پوری

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم کی طرف اشارہ ہے۔

اور مولانا ٹونکی بھی اُن سے پیچھے رہ گئے۔ میں نے کہا کہ "جوجلسو اور دوڑ میں کیا نسبت ہے۔" کہنے لگے "کوئی نسبت نہ ہوتو ان دونوں صبارفتار مولاناؤں کو نیچا کیوں کر دکھا سکتے تھے؟" میں نے عرض کیا "سگ گزیدگی کا بھی اُن کے پاس کوئی چارہ ہے؟" فرمایا "اگر وہ معیشتِ زرعی کا کوئی نسخہ زعفران سے لکھ کر دے دیں گے تو تمہاری سگ گزیدگی دور نہ ہو جائے گی بلکہ حکومت اُس کو اپنے جیب خرچ سے چھپوا کر کمبل اور گرم کپڑے کے ساتھ کسولی میں مفت تقسیم کرائے گی۔"

غرض کہ شب میں میل سے روانہ ہوا۔ ایک دوست عزیز کی وساطت سے نوکر بھی ملا نہایت سنجیدہ۔ نہایت خاموش، نہایت پستہ قد اور ـــــ کو بڑھ! جس پر نوتر دام کے کو بڑھ اور وکٹر ہیوگو دونوں کو رشک آ سکتا تھا۔ راستہ میں ممکن ہے دہلی کا اسٹیشن رہا ہو۔ کوئی ٹکٹ کلکٹر نما صاحب آئے۔ ٹکٹ دیکھ کر چل دیے۔ انبالہ پہنچ کر دیکھتا ہوں تو بٹوے سے ساری نقدی غائب صرف ٹکٹ اور سگ گزیدگی سارٹیفکٹ موجود تھا۔ یا مظہر العجائب! میں اپنے ڈبہ میں تنہا تھا۔ اور یہ پورا سفر تنہائی میں کٹا تھا۔ اس لیے رہ رہ کر ذہن صرف ٹکٹ کلکٹر صاحب کی طرف منتقل ہوتا تھا۔ بہر حال اب یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح اس نقصان کی تلافی کی جائے۔ جن لوگوں کو کتے نے نہیں کاٹ کھایا ہے وہ قرض لینے دینے کی مخالفت کرتے ہیں، لیکن چوں کہ میں اس معاملۂ خاص میں ماہرِ خصوصی کی حیثیت رکھتا ہوں، اس لیے مجھے مطلق تشویش نہیں ہوئی۔ کالکا پہنچتے پہنچتے میں پھر روپے والا تھا۔ قرض فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھتا ہے اس کو برتنے کے لیے ذوقِ سلیم اور طبعِ رسا کی ضرورت ہے۔ مجھے یہ فن نہ آتا ہوتا تو اور کچھ نہیں "سہیل"[1] تو کب کا بیٹھ چکا ہوتا اور یونیورسٹی ٹینس کلب میں بجائے بہترین ساز و سامان اور کھیلنے والوں کے صرف قل اور قوالی ہوا کرتی۔ قرض لینے والے کے لیے ضروری ہے وہ بہ یک وقت نپولین، ہولائڈ جارج اور چارلی چیپ لین ہو۔ قرض لینے میں تو کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ یہ تو لینے والے کی ہمت و ہنر پر منحصر ہے۔ اصل خوبی اس کی واپسی میں ہے اور یہ ایک راز ہے جو نہ "دار" پر بتایا جا سکتا ہے اور نہ "ممبر"[2] پر۔ میرے مرشد کو اس فن میں کمال تھا وہ سو میں صرف پچانوے روپے واپس کرتے تھے اور پانچ روپے سود میں کاٹ لیتے تھے!

---

1 رسالہ جو رشید صاحب اور آل احمد سرور صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔

2 آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است ‌ ‌ ‌ بر دار تواں گفت و بہ ممبر نہ تواں گفت (غالب)

لوگوں نے اس رمز کو دریافت کرنے کی ہزار کوشش کی، مرشد نے اسے کبھی نہیں بتایا اور ہمیشہ کہہ دیا کرتے تھے کہ اگر اس شرط پر لین دین کرنا منظور نہیں ہے تو اپنا راستہ لو، مرشد کا قول تھا کہ قرض اور بیوی کے مہر میں ایک خاص نسبت ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اپنی بیوی سے قرض لینا چاہیے کیوں کہ اس کی ادائیگی کی میعاد نہایت آسانی کے ساتھ صرف بعض لطائف وظرائف سے بڑھائی جاسکتی ہے، اگر کسی وجہ سے لطائف وظرائف کی استطاعت باقی نہ رہ گئی ہو تو پھر اس قرض کے ڈانڈے دین مہر سے ملانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیوں کہ آج کل کے مسلمان خود اپنی یا اپنی بیوی کی وفات کے وقت کلمہ یا توبہ استغفار کے بجائے مہر معاف کرانا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں!

بہر حال کالکا پہنچا۔ عام خیال یہ ہے کہ کالکا اُترنے والے صرف دو قسم کے مسافر ہوتے ہیں ایک کسولی دوسرے شملہ جانے والے۔ لیکن میرے نزدیک نوعیت دونوں کی یکساں ہے یعنی گزیدگی۔ اسٹیشن سے باہر آیا تو ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ شملہ جایئے گا کوئی کسولی کی ہانک لگا رہا تھا۔ اپنے گرد میں نے صرف چابک والوں کا مجمع دیکھا۔ کوئی موٹر والا شملہ کے لیے نہیں بلاتا تھا بلکہ صرف ٹٹو اور تانگہ والے اپنے حصہ میں آئے تھے۔ انھوں نے میرے حلیہ ہی سے پہچان لیا تھا کہ میں کسولی کا عازم ہوں۔ میں نے جی کڑا کر کے اس موٹر کی طرف رُخ کیا جو کسولی جانے والا تھا، لیکن وہ پُر ہو چکا تھا۔ اتنے میں کسی ٹٹو والے نے آواز کسا۔ صاحب گھوڑے کی سواری سے ڈرتے ہیں۔ اُن کا خیال صحیح بھی تھا۔ کیوں کہ ایک ہندستانی کو زیادہ تر صرف دو موقعے سواری کے ملتے ہیں ایک تو عہد طفولیت میں کسی پڑوسی یکہ بان کا گھوڑا پانی پلانے کے لیے مل جاتا ہے یا پھر شادی کے موقع پر یہ سعادت نصیب ہوتی ہے، اور گھوڑے کی سواری بھی سنن شادی میں شمار کی جاتی ہے۔ یہاں ان میں سے کسی ایک کا موقع نہیں ملا تھا۔ بارے خدا کا شکر ہے سگ گزیدگی نے اس کی بھی تلافی کر دی۔ ٹٹو والے کا آوازہ ڈان کوئکزوٹ سے برداشت نہ ہو سکا۔ سانکو پنیز ابھی مہمیز کی بالآخر ایک روزی لانٹی پر خود سوار ہوا دوسری پر سانکو کو بٹھایا اور کسولی فتح کرنے چل کھڑا ہوا۔

کالکا سے کسولی کا فاصلہ (بہ سواری ٹٹو) نو میل ہے جسے ہماری موکبِ جلال نے ساڑھے چار گھنٹہ میں طے کیا۔ کچھ دور تک تو ٹٹو والوں نے ساتھ دیا۔ اُس کے بعد انھوں نے

ہمارے ہاتھ میں چھی دی اور خود کسی طرف ہو رہے۔ ممکن ہے سودا کو بھی کسی کتے نے کاٹا ہو اور کسولی ہی کے راستہ میں گھوڑے کی ہجو لکھی ہو۔ غرض کہ یہاں وہ سب کچھ پیش آیا جو شاید صرف سودا کے گھوڑے ہی کو پیش آیا تھا۔ راستہ میں ہمارے ہم سفر "سلسلۂ فاتحانِ ہند" کے ایک "ایڈیشن" گورے صاحب بھی تھے۔ اُن کے گھوڑے کا بھی سلسلۂ نسب روزی لانٹی ہی سے ملتا تھا۔ میری چھی تو بہت جلد ختم ہو چکی تھی اُن کا بید بھی تھوڑی دیر رفاقت کر کے جاں بحق ہوا۔ ایک جگہ نہیں رہا گیا تو اُتر کر گھوڑے کو دفعہ 323 تعزیراتِ ہند سمجھانے لگے اور اس سلسلہ میں گھوڑے اور گھوڑے کے خاندان سے اُن کے جتنے جائز ناجائز تعلقات ہو سکتے تھے سب دُہرا گئے۔ اس سے بھی عاجز ہو گئے تو میری طرف ہوئے میرے اوسان خطا ہونے والے ہی تھے کہ کہنے لگے "مارنے سے چلتا نہیں تو مرتا کیوں نہیں۔" میں نے کہا اس سے زیادہ سزا کا مستوجب اس کا مالک ہے کیا اُس نے آپ کو اس کی حرکات سے باخبر نہیں کیا تھا؟ کہنے لگے مجھے بالکل نہیں بتایا۔ ورنہ ٹھوکروں سے خبر لیتا۔ میں نے کہا مجھے بھی اسی سے شکایت ہے۔ فرمایا ممکن ہے آگے ملے۔ تم پہچانتے ہو؟ میں نے کہا خوب پہچانتا ہوں۔ سب سے بڑی شناخت تو یہ ہے کہ اُس کی تلی نہایت اطمینان بخش حد تک بڑھی ہوئی ہے۔

غرض کہ گرتے پڑتے کسولی کے ہسپتال تک پہنچا۔ قسم قسم کے سگ گزیدہ دیکھنے میں آئے۔ شکم میں دو ٹیکے لیے دو ہی کمرے ملے۔ جس میں ایک غسل خانہ مع تین کموڈ کے موجود تھا۔ کمرے ہر قسم کے فرنیچر سے آراستہ ہیں۔ تھوڑی دیر میں اطمینان ہوا تو سوچنے لگا آخر اس قید تنہائی میں دو ہفتے کیسے گزریں گے؟ شام کے قریب ایک صاحب سے ملاقات ہوئی کہنے لگے، آرام سے ہیں۔ میں نے کہا صرف تنہائی کی تکلیف ہے۔ کہنے لگے یہ خوب کہی وہ دیکھیے دور سے شملہ کی روشنی نظر آ رہی ہے۔ میں نے کہا جی ہاں وہ دیکھیے کا چاند کے قریب زہرہ بھی جگمگا رہا ہے۔

ایک دن شام کو ایسے مقام پر گزر رہا جہاں نہایت نفاست کے ساتھ ٹینس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کچھ اور نہیں "دور ہی کا جلوہ" سہی، لیکن تھوڑی ہی دیر میں معلوم ہوا کہ ٹینس کے ساتھ صرف کورٹ شپ کی جا رہی ہے۔ یہ ٹینس کی عجیب محرومی ہے اچھے کھیلنے والے ہوتے ہیں تو ساز و سامان اچھا نہیں ہوتا اور ساز و سامان مکمل ہوتا ہے تو کھیلنے والے بُرے ہوتے ہیں۔ اس

وقت طبیعت میں عجیب جذبہ پیدا ہوا کہ ان کھیلنے والوں کو نکال کر خود کھیلنے لگوں۔ خواہ دوسری طرف بھی مجھی کو گیند واپس کرنی پڑے، لیکن خیال آیا کہ کہیں یہ سگ گزیدگی کے سلسلہ میں نہ آ جائے۔ وہاں سے آگے بڑھا۔ ایک مقام پر گورے فٹ بال کھیل رہے تھے سامنے ''بلیرڈز'' کا ''سیلون'' تھا۔ پاس ہی خورد ونوش کی چیزیں سلیقہ سے آراستہ تھیں۔ مے خانہ تھا، حوا کی بیٹیاں تھیں۔ کہیں کہیں حوا کے شوہر بھی نظر آ جاتے تھے۔ بیش تر ہابیل قابیل بھی تھے۔ بعض ایسے مناظر بھی پیشِ نظر ہوئے جن کو قیامت کی علامت بتایا جاتا ہے۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ شام کی تاریکی کسوٹی کے نشیب وفراز کو دھندلا بنا رہی تھی۔ انجام یہ ہوا کہ سگ گزیدہ گھر کا راستہ بھول گیا۔

(نیرنگ خیال۔ لاہور، دسمبر 1926)

●●●

کوبڑ

کیچ اور کیچڑ کی بحث میں سنتے ہیں، دلّی اور لکھنؤ والوں میں سے کسی ستم ظریف نے ایسے مقام پر تان توڑی کہ ؂

نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن

کی صورت پیدا ہوگئی۔ کُب، کُوب یا کوبڑ میں بھی ایک حرف ایسا آیا ہے جس کے ترک یا قبول کا مسئلہ عبرت ناک حد تک دلچسپ یا دلچسپ حد تک عبرت ناک بنایا جا سکتا ہے، لیکن میں ایک خالص ادبی بحث کو مقامی رنگ یا روایات سے ملوث نہیں کرنا چاہتا۔ سوال یہ ہے کہ صحیح لفظ کُب ہے یا کُوبڑ۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا ارادہ مطلق یہ نہ تھا کہ میں صحتِ اخلاق کی مانند صحتِ الفاظ کے سلسلے میں بھی ناظرینِ سہیل کے لیے عذابِ جاں بن جاؤں، لیکن بعض حلقوں میں اس لفظ کے بارے میں عجب خلطِ مبحث ہو رہا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ کُب ہے، بعض کا بیان ہے کہ کُوب ہو تو بہتر ہے، پورب کے ساکنوں کو اس پر اصرار ہے کہ ہونا کوبڑ چاہیے۔

لیکن بات صرف اتنی ہے کہ اس لفظ کا مدار تمام تر کُب یا کُوبڑ کی نوعیت، سائز یا شدت پر ہے۔ کُب، کُوب یا کوبڑ میرے نزدیک اپنی اپنی جگہ پر سب صحیح ہیں اور ان کا مدار ہمارے آپ کے فیصلہ پر اتنا نہیں ہے جتنا خود کبڑوں کی ذہنیت پر ہے۔ ہمارے مکرم بزرگ قاضی جلال الدین صاحب[1]

---

1. سابق صدر شعبۂ جغرافیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ملاحظہ ہو: فکر و نظر، علی گڑھ۔ جولائی 1922 ص: 62 تا 67

فرماتے تھے کہ زبان کا ذخیرہ الفاظ سے نہیں بلکہ تلفظ سے بڑھانا چاہیے اور کسی زبان کی ترقی یا وسعت کا معیار بھی یہی ہونا چاہیے کہ اس میں تلفظ کے تنوعات سے مفہوم کے تنوعات کا کہاں تک امکان ہے۔ اس بارۂ خاص میں ان کا خیال ہے کہ کوئی دوسری زبان اردو کا مقابلہ نہیں کر سکتی مثلاً مختلف سائز اور نوعیت کے ہوائی جہاز ہوتے ہیں۔ انگریزی میں ان کے مختلف نام ہیں اردو میں یوں کہہ سکتے ہیں معمولی چھوٹے موٹے جہاز کو صرف ہوائی جہاز۔ اس سے بڑے کو حوائی جہاز، اس سے بڑا ہو تو ہوائی ۔ جحاز۔ اس سے بڑا ہو تو حوائی ۔ جحاز اور سب سے بڑا ہو تو پھر حوائی ۔ جحاض۔ نوعیت میں اختلاف ہو تو جہاز کو مختلف اعراب دے دینا چاہیے جہاز ، جُہاز۔ اسی طرح اور بہت سی ترمیمیں ہو سکتی ہیں۔ عورتوں کی اقسام کی مانند مردوں کی بھی اقسام ہو سکتی ہیں مثلاً : مَر د ، مِر د ، مُر د ، مَرَ د ، مُرُ د ، مِرِ د ، مَر دُ وغیرہ۔ اسی طرح عورت کی بھی گردان ہو سکتی ہے، لیکن مرد کی آخری قسم کی طرف اشارہ کرنے کے بعد عورتوں کو بحث میں لانا دلاوری کے خلاف ہے اور میں چاہتا بھی نہیں کہ گبوے کی بحث میں ناظرین سہیل عورتوں کے ساتھ کھنچے کھنچے پھریں!

بہرحال گب ، گوب یا کوبڑ کا مدار اس پر ہے کہ گب گوب یا کوبڑ کس قسم کا ہے، کس سائز کا اور کس شدت یا قوت کا ہے۔ شدت یا قوت کا یہاں وہی مفہوم ہے جو علم کیمیا میں ٹنکچر، الکوہل وغیرہ کا ہوتا ہے۔ گب کے معنی یہی چھوٹا منا سا گب ، گوب اس سے ذرا بڑا، کوبڑ سبھوں کا قبلہ گاہ۔

اب میں ذرا فلسفہ قسم کے علوم وغیرہ کی مدد سے کوبڑ یا گب پر اظہار خیال کروں گا۔ کیوں کہ بقول میرے ہی جب تک اس قسم کی چیزوں کا حوالہ یا واسطہ دلایئے نہ اپنا نفس موٹا ہوتا ہے اور نہ دوسروں پر رعب پڑتا ہے۔

....

ایک دن میں اور میرا ٹوٹا ہوا مونڈھا دیوار سے لگے ہوئے اس مسئلہ پر غور کر رہے تھے کہ حالی سنٹنری میں شرکت کرنی چاہیے یا جگن جشن میں۔ سوچتے سوچتے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے مونڈھے نے میری اور میں نے مونڈھے کی جگہ لے لی ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی واقعہ بھی نہیں تھا یوں بھی آپ کبھی اچانک دیکھیں تو یہ معلوم کرنا دشوار ہوگا کہ میں مونڈھے پر بیٹھا ہوں یا مونڈھا

مجھ پر رونق افروز ہے۔ یہ بہت معمولی سی بات ہے۔ آپ کا حسنِ ظن یا میری اور مونڈھے کی شباہتِ تام، لیکن اتنی سی بات فلسفہ کی بدتوفیقی سے خدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ بہر حال میں نہیں چاہتا کہ اس مسئلہ کو طوالت دے کر مونڈھے یا فلسفی کی حق تلفی کروں۔

مونڈھے نے کہا ''کیوں میاں کہاں ہو؟'' میں نے کہا ''ہوں تو جہاں کا تہاں، لیکن سوچتا یہ ہوں کہ اگر ساری دنیا مونڈھا ہو جائے تو مجھے کیا کرنا پڑے گا۔'' مونڈھے نے قہقہہ لگایا۔ بس اسی طرح جیسے ایک ٹوٹا ہوا مونڈھا قہقہہ لگا سکتا تھا۔ اُس نے کہا ''تم اتنے دنوں مونڈھے پر بیٹھے، لیکن تم کو یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ ساری دنیا مونڈھا نہیں بن سکتی بلکہ مونڈھا خود ساری دنیا ہے۔ ساری دنیا مونڈھا بن جائے تو کُمہڑے کہاں سمائیں اور جس دن سارے کُمہڑے دنیا میں سما گئے بس تم جانو اُسی دن پورن راج ہے۔'' میں بولا ''کامریڈ مونڈھے، میں کُوبڑ کے مسئلے پر اکثر غور کرتا رہا ہوں،'' بات کاٹ کر مونڈھا بولا ''اور میں اُسے جھیلتا بھی رہا ہوں۔'' میں نے کہا ''دیکھو بات کاٹنا بڑی نازیبا حرکت ہے نظامِ اجتماعی میں انفرادی مداخلت ممنوع ہے، دنیا نے اس لعنت سے ابھی نجات پائی ہے، لیکن تم بہر حال مونڈھے ہو اس لیے مجبور ہو۔'' مونڈھا بولا، ''میری عادت بیچ میں بولنے کی نہیں ہے، لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آپ نظامِ اجتماعی کب سے ہو گئے پھر یہ بتایئے کہ جس چیز کو آپ نظامِ اجتماعی بتاتے ہیں وہ خود انفرادیت کی عیوب سے کب پاک ہے، نظامِ اجتماعی بجائے خود ایک انفرادیت ہے۔'' ایسی انفرادیت جو نامعقول حد تک سرد، ساکن، غیرنامی اور لایعقل ہوتی ہے۔ دنیا کا پُرانا قاعدہ ہے کہ وہ لعنتوں سے پاک نہیں ہوتی۔ وہ صرف لعنتوں کی شکل محل یا موقع بدل دیا کرتی ہے دنیا صرف ایک چالاک قسم کی دُوکان داری ہے۔ اچھی انگریزی دُوکانوں پر آپ نے دیکھا ہوگا، ایک ہی چیز کو تھوڑے تھوڑے وقفہ سے مختلف مقامات پر مختلف زاویہ سے اور مختلف دوسری چیزوں کے ساتھ رکھتے رہتے ہیں خریدار اسے محسوس نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ نئی چیز آگئی اور پرانی غائب ہوگئی۔ دُوکان کی شان وشوکت اور حسین بیچنے والی کے اندازِ تکلم وتبسم سے آپ اتنے مرعوب اور متاثر ہوتے ہیں کہ تمام عمر اپنی غلط فہمی سے آگاہ نہیں ہو پاتے۔'' میں نے کہا ''دوست تم مراق میں مبتلا ہو اور حقائق سے بے خبر۔ تم صرف مونڈھے ہو، جدت اور ترقی کے منکر بھی اور اس سے محروم بھی، مجھے تم پر ترس آتا ہے۔''

موونڈھے نے کہا ''تم مجھ پر ترس کھاتے ہو تو خیر میں بھی تمھارا مضحکہ نہیں اُڑاؤں گا، لیکن اس سے مسئلہ کی نوعیت اور اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ تم کو شاید یہ نہیں معلوم ہے کہ مجھ میں تم میں من تو شدم تو من شدی کا تعلق ہے۔ جو کچھ میں کہتا ہوں اصل میں وہ تمھارے ہی وساوس اور خطرات ہیں، لیکن اس چیز کو تم کبھی نہ سمجھو گے اور محض اس لیے کہ تم اسے سمجھنا پسند نہیں کرتے یا اس کا سمجھنا برداشت نہیں کر سکتے۔''

میں نے کہا ''موجودہ نظام میں مساوات کو اُن حدود تک پہنچا دیا گیا ہے جن تک انسانی عقل کی رسائی ہو سکتی تھی اور اُمید بھی کی جاتی ہے کہ جمہور نے جمہوریت کے لیے جو کچھ نافذ کیا ہے وہ مفید ہوگا۔'' معلوم ہوتا ہے کہ میری بات کو بندھی ٹکی سمجھ کر موونڈھا کچھ بے صبر سا ہو رہا تھا۔ اس لیے اس نے فوراً جواب دینا شروع کر دیا اور وہ بھی اس طور پر گویا اُس نے میری گفتگو کو قابلِ اعتنا نہیں خیال کیا۔ اُس نے کہا ''مساوات کا تمہارا تصور قطعاً غلط ہے بے سروپا بھی۔ تمھاری مساوات صرف ایک تقسیم ہے اقتصادی نقطۂ نظر سے تمھاری سب سے بڑی کامیابی یہ ہو سکتی ہے کہ دنیا میں امیر اور غریب کی تفریق قائم نہ رہے۔ بالفاظِ دیگر ہر شخص امیر ہو جائے یا ہر شخص غریب ہو جائے یا اُن کے بین بین رہے تم بدی اور گناہ کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے اور سمجھتے ہو کہ معاشرتی جرائم نتیجہ ہیں فطری ضروریات کی تکمیل کا۔ امیروں کی دولت غریبوں کو انتقام پر مائل کرتی ہے اور یہی ذرائع انتقام معاشرتی برائیاں ہیں۔'' اب مجھ سے نہ رہا گیا اور میں بول اُٹھا۔ ''مسٹر موونڈھے تم ساری معاشرتی خرابیوں کا حل یہی پیش کرتے آئے ہو کہ امیر خیرات کریں اور غریب متوکل ہو جائیں!'' موونڈھے نے کسی قدر آزردہ ہو کر کہا۔ ''نہیں جناب میں وہ نہیں کہنا چاہتا تھا جو آپ نے میرے سر تھوپنے کی کوشش کی ہے میں نہ بدعقل ہوں اور نہ بزدل۔ میں خیرات اور توکل دونوں کو بے معنی سمجھتا ہوں اگر دولت ایمان داری، محنت اور سچائی کے ساتھ جمع کی گئی ہے تو خیرات کیوں اور کس مد میں؟ خیرات کو انفرادی حیثیت نہ دینا چاہیے۔ یہ حکومت کا فرض ہے کہ ایک طرف وہ غیر مستطیع کی مدد کرے اور دوسری طرف اس کا احتساب کرتی ہے کہ کوئی شخص بے ایمانی، ناخداترسی یا محض اتفاقیہ طور پر دولت مند نہ بننے پائے۔ آپ تمام معاشرتی امراض کی اصلاح اقتصادی نسخہ سے کرنا چاہتے ہیں اور ثبوت میں تاریخ اور تاریخی واقعات پیش کرتے ہیں۔''

میں نے جلدی سے کہا "اور کیا؟" موبڑھے نے کہا "تو مبارک ہو کہ آپ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں میں سمجھتا تھا کہ آپ بڑی مشکل سے لائے جاسکیں گے۔ میں یہ کب کہتا ہوں کہ اقتصادی مطالبات کی خلاف ورزی کی جائے، لیکن اقتصادی داعیات کے سمجھنے میں آپ غلطی کرتے ہیں۔ زندگی اتنی سادہ اور سہل نہیں ہے جتنا آپ اُسے سمجھتے ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی دقت یا محرومی یہ نہیں ہے کہ کوئی امیر ہے یا غریب ہے جس کے لیے آپ کا اقتصادی نسخہ موثر ہو سکے۔ ممکن ہے آپ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوں کہ ذہنی اور اخلاقی پیچیدگیاں بھی اقتصادی ہی داعیات یا مطالبات کی رہینِ منت ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے۔ اقتصادی غیر مساوات بجائے خود مرض نہیں بلکہ علامت مرض ہے۔ اس سلسلہ میں آپ تاریخ اور تاریخی واقعات پر زور دیتے ہیں۔ اقتصادی حالات وحوادث تاریخی ہو سکتے ہیں اُن کو زیادہ سے زیادہ حالات وحوادث کہا جاسکتا ہے نہ کہ نتائج حالات وحوادث۔ اس لیے تاریخ پر اعتماد کرنا میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ زندگی مجموعہ ہے بہت سی ذہنی، اخلاقی، معاشرتی، طبعی، کیمیاوی داعیات اُن کے متعلقات اور اُن کے کسر وانکسار کا۔ جب تک اُن پر بحیثیت مجموعی نظر نہ رکھی جائے گی اور اُن پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنا اور صحیح نتیجہ پر پہنچنا آسان نہیں ہے اُس وقت تک محض اقتصادی محور پر گردش کرنے سے مطلب برآری نہیں ہوسکتی۔ صرف معیشت کی تقسیم زندگی کے توازن کو نہ تو متعین کر سکتی ہے اور نہ اُسے برقرار رکھ سکتی ہے۔

موبڑھے کے تیور سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس قسم کی بحث سے تھکنے کے بجائے "لپکنے" پر آمادہ ہے اور میں اسے اپنی توہین اور موبڑھے کی زیادتی سمجھتا تھا اس لیے بول اُٹھا، کامریڈ موبڑھے میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی بحث سے تمھاری فرسودہ صحت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور جس قسم کی بحث تم نے چھیڑی ہے وہ تمھاری موبڑھیت کے منافی ہے اور کسی حد تک دوسروں کے لیے مخلِ عافیت بھی ہو سکتی ہے اس لیے میں اس بحث کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔"

موبڑھا بولا۔ "دیکھو میں طعن وتمسخر، وعظ وتلقین، تسبیح وتہلیل کسی سے متاثر نہیں ہو سکتا اس لیے کہ موبڑھا نتیجہ ہے، اس لیے حقیقت اور انسان محض ایک حادثہ ہے اور حادثہ بھی ایسا جس کا کوئی انجام نہیں اس لیے ناقابلِ اعتنا۔ تم کہتے ہو دنیا سے تفریق مٹائی جاچکی ہے، لیکن تم کو نہیں معلوم تفریق اگر واقعی ہے تو کبھی مٹائی نہیں جاسکتی۔ تمھارا خیال ہے کہ آئندہ کی نسل تمھارے

مسلک پر چل کر نجات حاصل کرے گی اور پچھلی عادتیں بھول جائے گی، لیکن تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ آئندہ، بہت ممکن ہے موئڑھا انسان بن جائے، لیکن یہ اُسی وقت ممکن ہے جب انسان موئڑھا بن جائے۔" میں نے کہا "لیکن تفریق کو کم کیا جاسکتا ہے یہاں تک کہ وہ نہ ہونے کے برابر ہو جائے۔" موئڑھا بولا "جس چیز میں کم ہونے کا امکان ہے اس میں بڑھنے کی بھی صلاحیت ہوسکتی ہے آپ اس فریب میں مبتلا ہیں کہ آپ انسان کو موئڑھا بنا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کی یہ زیادتی ہے کہ آپ موئڑھے کو انسان بنانا نہیں چاہتے اور یہ سب محض اس لیے کہ آپ مرض کا علاج نہ تو کرتے ہیں اور نہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ صرف یہ چاہتے ہیں کہ صحت کا نظریہ بدل دیا جائے یہاں تک کہ لوگ مرض کو بھی صحت سمجھنے لگیں۔" میں نے موئڑھے پر ترس کھا کر کہا۔ "کامریڈ میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ تم الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنس گئے ہو اور چاہتے ہو کہ دوسرے بھی اسی میں مبتلا ہو جائیں مجھے تم سے ہمدردی ہے، لیکن میں تمھاری دلیل کا قائل نہیں ہوں۔"

موئڑھے نے نہایت روکھے پھیکے انداز میں جواب دیا۔ "میں تو صرف موئڑھا ہوں، انسان نہیں اس لیے میں صرف وہی کہہ سکتا ہوں جو میرے ذہن و دماغ میں ہے۔ انسانی مصالح کو حقائق پر ترجیح دینا انسانوں کا کام ہے۔ موئڑھے کو یہ تعیش حاصل نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ آپ مرض کا ازالہ نہیں کرتے صرف صحت کا تصوّر بدلنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ مریض ذہنی صحت کے تصوّر کا متحمل ہی نہ ہوسکتا ہو۔" میں نے کسی قدر تند و ترش ہو کر یہ کہا کہ "ایک فرسودہ موئڑھے کا فیصلہ کسی نوجوان کے نزدیک قابلِ قبول نہ ہونا، دنیا کے لیے بہت بڑا حادثہ ہوگا۔" موئڑھے نے سنی اَن سنی کردی۔ کہنے لگا۔ "اگر کسی کی بینائی کمزور ہو تو آپ کے نزدیک اُس کا بہترین علاج یہ ہے کہ دوسروں کی بینائی کے اعتدال کا معیار ہی یہی ہے جس کو شفا تک کا صحیح تصوّر نہ ہو وہ صحت کی پیغمبری کیوں کرے!"

....

کچھ عرصہ تک میں جمائیاں لیتا رہا جس کا جواب چرچرا چرچرا کر موئڑھا دیتا رہا، میں نے کہا "بھائی موئڑھے طبیعت کچھ یوں ہی سی ہو رہی ہے۔ تھوڑا بہت نشہ پانی ہو جائے تو ہم

دونوں ایک دوسرے کو صحیح فضا میں صحیح زاویہ سے دیکھ اور سمجھ سکیں گے۔ پھر تم جانو کبڑوں کی بحث جہاں کی تہاں رہی جاتی ہے۔ لوگ کہیں گے کبڑے کو موںڈھے کے سر تھوپ کر نکل گیا۔ تمھارا کیا موںڈھے اور کبڑے میں اوّل تو تمیز کرنا دشوار ہے دوسرے یہ کہ تمیز کر ہی کے تمہارا کیا کرلیں گے۔ تمھیں کسی کی پروا تو ہے نہیں، ہم تم پر بیٹھنا چھوڑ دیں گے تو بچے تم سے کھیلنا شروع کردیں گے اور تم اُس حالت کو پہنچ چکے ہو کہ لڑکے تم کو لڑھکاتے رہتے ہیں یا اُلٹا کر کے بیٹھ جاتے ہیں تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اب تمھارا یہی مصرف ٹھیک ہے، لیکن ہوشیار رہنا ایک دن بڑی بی کی نظر بھی تم پر پڑ رہی تھی، اُن کو ایندھن کی طرف سے بھی اطمینان نہیں رہتا اور واقعہ یہ ہے کہ تمھاری وجہ سے مجھے بھی بعض دفعہ نہایت درجہ شرم سار ہونا پڑا ہے اکثر مہمان یا ملاقاتی آئے ہیں تو میں نے اُن سے تمھارا تعارف نہایت خلوص اور گرم جوشی سے کرایا، لیکن تم نے کسی کو نچلا بیٹھنے نہیں دیا۔ ذرا تم سے غافل ہوا اور تم نے اُسے چت کردیا، یہی سبب ہے کہ لوگ آتے ہیں اور کھڑے کھڑے واپس جاتے ہیں۔ شکایت کرنے پر کہتے ہیں کہ "جناب آپ کے ہاں بیٹھنے کی کوئی چیز نہیں ہے اور زمین پر لیٹنے کے لیے کچھ آپ ہی کا مکان مقرر نہیں ہے۔ اللہ کی زمین یوں بھی دور دور تک پھیلی ہوئی ہے!"

موںڈھا بولا: "جناب اس میں میرا کیا قصور ہے، بچوں سے تو مجھے اُلفت ہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہی میری مختلف النوع حیثیات سے واقف ہیں اور اس کی داد دیتے ہیں۔ بڑی بی کی نظر مجھ پر جب بھی پڑی ہے آپ اس خاکسار پر رونق افروز رہے ہیں۔ بہت ممکن ہے آپ لوگ ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنے اگلے پچھلے گناہوں کو یاد کرتے ہوں اور ایک دوسرے سے شرمندہ ہوتے ہوں، رہے آپ کے ملاقاتی اور مہمان، آپ ہی بتائیے وہ کس قماش کے ہوتے ہیں اور اُن کے ساتھ کیسا سلوک ہونا چاہیے۔ اوّل تو یہ 'خانۂ انوری' سرِ راہ واقع ہے اور دروازہ کھلا رہتا ہے میں تو ہر وقت دیکھتا رہتا ہوں سامنے سے اچھے خاصے چلے جارہے ہیں دروازہ کھلا دیکھا اور رُخ بدل دیا۔ کتا، بکری، گدھا، خچر، بیل ہوا تو ایک آدھ ہڈی، دو چار ڈھیلے، پان سات گالیاں یا تھوڑی بہت پتیاں اور پودے کھا کر چل دیا۔ اُن کے علاوہ کوئی اور بزرگ ہوئے تو میرا کان پکڑا اور بیٹھ رہے۔ بچوں کے ساتھ تفریح شروع کردی میرے ٹکڑے توڑ توڑ کر کان یا دانت کریدنے لگے۔ پان ملا تو وقتاً فوقتاً پیڑ پودوں کو رنگتے رہے آپ نہ ہوئے تو ما بخیر شما سلامت ورنہ لعنت ہے میری

زندگی پر اور تُف ہے آپ کی اوقات پر۔ سوائے مہمل اور لایعنی گفتگو کے میں نے کبھی کوئی معقول بات نہ سنی۔ شعروشاعری، مضمون نویسی، معافی فیس، غدار سول، اشتراکیت وشیطنت، اسلام کے سپاہی اور ملت کی تباہی، یونیورسٹی، خورجہ کا اچار، گلاب کی اقسام، امتحان کے سوالات، ممتحن کے جوابات، مسلمانوں کا افلاس، قرضہ کا سوال، آپ کی بدحواسی اور میری.....قلابازی!''

بات کرنے اور پان کھانے کی کوئی حد ہوتی ہے، آپ دونوں کو سوچنا چاہیے کہ میں یونیورسٹی کا ایک مونڈھا ہوں، میرے اپنے بھی فرائض ہیں جن کے لیے مجھے اطمینان، فراغت، یک سوئی، کبھی نہ کبھی ضرور نصیب ہونا چاہیے۔ یونیورسٹی کی صلاح وفلاح اسی میں ہے کہ وہ اپنے مونڈھوں کے حقوق، عزّت و آسائش کی نگہ داشت کرے ورنہ آپ جانتے ہیں مونڈھوں کی قلابازی''.....الخ۔

مونڈھے کی ہزیان سرائی نے مجھے کچھ ایسا گومگو میں رکھا کہ باوجود اس کے کہ اُس کا لب ولہجہ اکثر 'باغیانہ' رہا میں مسلسل گول رہا۔ بالآخر میں نے کہا ''میرے معزز دوست مونڈھے، میں تمھارے جذبات کا احترام کرتا ہوں اور اسے سلام کرتا ہوں۔'' مونڈھے نے یک لخت چلاّ کر کہا۔ ''تم چالاک ہو یا نہ ہو نالائق یقینی ہو، یہ سلام کرتا ہوں کیا ہے؟'' میں نے سہم کر کہا کہ ''اکثر لوگوں کو میں نے تقریر کے دوران میں اپنے ممدوح کی تعریف میں یہ کہتے سنا ہے کہ میں آپ کو یا آپ کی فلاں فلاں چیز کو سلام کرتا ہوں۔'' مونڈھے نے جھنجھلا کر کہا ''انگریزی کی تقریر سنی ہوگی، اس میں سلام کرنا ٹھیک ہے اردو میں ایسے مقام پر سرنیاز یا سرعقیدت خم کرنا کہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میرے پیارے دوست، مجھے معاف کرو'' مونڈھا سنتے سنتے پھر بھڑ گیا۔ گرج کر بولا۔ ''کیوں جی بے حیائی کی کوئی انتہا بھی ہے۔ میں کوئی آپ کی معشوقہ ہوں یا نورچشمی قسم کی کوئی چیز جو آپ پیارے کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ آپ کو ابھی اتنی تمیز نہیں آئی کہ ہر لفظ کا مترادف ہر بھلے مانس یا ہر موقع کے لیے موزوں نہیں ہوتا۔ یہ پیاری، پیار یا پیارے کا لفظ کبھی اپنے بزرگوں سے بھی سنا ہے کہ انھوں نے بے تکلف کسی معقول مجمع یا اشخاص کے سامنے استعمال کیا ہو۔ یہ چھوکرے چھوکریاں جن کے مہملات یا فواحش سے آج کل کے رسائل بھرے ہوتے ہیں جو چاہیں لکھ جائیں آپ کو اس بڑھاپے میں کیا سوجھا ہے کہ گندگیوں کے طومار میں اضافہ کررہے ہیں'' میں نے کسی قدر

مربیانہ انداز میں کہا ''جناب آپ معاف فرمائیں۔ آپ کی ترکیب بیٹھے سے ہوئی ہے غالباً اسی سبب سے آپ سٹھیا سے گئے ہیں۔'' موبڑھے نے غرا کر کہا ''تم پر اور تمھاری رعایت لفظی دونوں پر خدا کی پھٹکار۔ یہ ظرافت نہیں ہیضہ ہے۔'' میں نے کسی قدر خجل اور بہت کچھ سہم کر کہا۔ ''بھائی دیکھو بات میں بات نکل آتی ہے اور اصل بات نظر انداز ہوتی جارہی ہے میں چاہتا تھا کہ کبڑوں کا ساتھ نہ چھوٹنے پاتا ادھر تم نے ہیضہ کا نام لیا تو مجھے طب کا تشابہ لگا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ طبی نقطۂ نظر سے کُب یا کوبڑ پر ایک محاکمہ ہو جائے۔''

....

موبڑھا بولا، ''دیکھو تشابہ لگنا بھی کوئی معقول بات نہیں ہے۔ ایسے آدمی کو خفیف الحرکت کہتے ہیں۔ تشابہ اکثر الفاظ اور خیال ہی میں نہیں لگتا بلکہ یہ پیش خیمہ ہے اُس حالت کا جب تمھارے ایسے لوگ اُس مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس کا اب تک صحیح نام متعین نہیں ہوا ہے۔ یعنی جب انسان کو الفاظ اور اقوال ہی میں نہیں بلکہ اعمال میں بھی تشابہ لگنے لگتا ہے۔ ایک ہندی مثل میں اس کی ترجمانی یوں کی گئی ہے:

گئے تھے ہر بھجن، بیٹن لگے کپاس

تمھارے بڑے بڑے ماہرین، وظائف الاعضا یا تشریح اَبدان بتاتے ہیں کہ انسان کا جسم نہایت چھوٹے چھوٹے خُلیات یا غدود پر مشتمل ہے انھیں کی باہمی ترکیب و تحلیل کا نام زندگی ہے اور زندگی کا اعتدال یا انحراف انھیں سے وابستہ ہے، لیکن یہ جسم و جسمانیت کے اعتبار سے زندگی کا تصوّر ہے روح، ذہن اور عقل دوسری چیزیں ہیں جن کے بارے میں بعضوں کا عقیدہ ہے کہ ان کا نظام بجائے خود جداگانہ ہے، لیکن موبڑھوں کی تحقیقات یہ ہے کہ روح، ذہن، عقل یا اس قبیل کی دوسری چیزیں بجائے خود جداگانہ حیثیت نہیں رکھتیں بلکہ ان کا تعلق اس نظام سے وابستہ ہے جس سے یہ خلیات اور غدود مرکب و ممزوج ہیں۔ انسانوں کی موجودہ تحقیقات جہاں تک پہنچ چکی ہے، موبڑھے اس سے آگے بڑھ چکے ہیں یعنی یہ خلیات بجائے خود ایک کیلی پر رقص کرتے ہیں۔ اس کیل یا کیلی کو موبڑھوں کی اصطلاح میں کوبڑ کہتے ہیں۔ آپ نے تو اکثر سنا ہوگا لوگ اکثر دماغ کی کیل کا ذکر کیا کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں جوتے کا بھی بے تکان

استعمال کرتے ہیں۔ جوتے کا یہ مصرف غیر شاعرانہ ضرور ہے، لیکن واقعہ پھر واقعہ ہے اور سننے میں تو یہاں تک آیا ہے کہ آپ جوتے کے اس عجیب وغریب استعمال سے باز رکھے جائیں تو اکثر یہ چیز (؟) بجائے خود آپ کے دماغ میں چلنے لگتی ہے۔ بہر حال آپ نے اس کیل کا ذکر تو کر دیا لیکن اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ موڈھوں نے اس کی تحقیقات شروع کر دی، کیوں کہ موڈھوں کا خیال ہے کہ جو بات اضطراراً زبان پر آتی ہے اس کا کسی نہ کسی حد تک وجود ضرور ہوتا ہے۔"

موڈھے نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ اُس نے کہا "دماغ کی اسی کیلی یا کوبڑ سے زندگی کی ساری حماقتیں وابستہ ہیں۔" میں نے کہا "حماقتیں؟" موڈھا بولا "اور نہیں تو کیا۔ زندگی حماقت نہ ہوتی تو موت کیوں لازم آتی۔ تم حماقت کو ان معنوں میں لینے کے عادی ہو جن میں بالعموم بے وقوف لیا کرتے ہیں۔ میرا مقصد احمقوں کی حماقت سے نہیں ہے بلکہ نفسِ حماقت سے ہے۔ حماقت بجائے خود اتنی بری چیز نہیں ہے جتنی احمقوں نے اُسے بنا رکھا ہے۔" میں نے متعجب ہو کر پوچھا "تو کیا عقل مندوں کی بھی حماقت ہوتی ہے؟" موڈھے نے کہا۔ "تم نرے مولوی معلوم ہوتے ہو اور صرف بال کی کھال کھینچنا چاہتے ہو۔ اوّل تو تم کو معلوم نہیں کہ دنیا میں عقل مند کوئی نہیں ہے، انسان عقل مند ہوتا تو شیطان کی پھر کیا ضرورت تھی۔ انسانوں کی ساری برگزیدگی اس میں ہے اور اسی میں اُس کی تباہی بھی مضمر ہے کہ وہ عقل کے بجائے جودت یا جبلت کو کام میں لاتا ہے، اُسی کے لیے زندہ رہتا ہے اور اسی کے طفیل میں مرنا گوارا کر لیتا ہے۔ زندگی کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں اُن میں سے کسی کو لے لیجیے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کے حامل یا علَم بردار اسی کیلی یا کوبڑ پر گردش کرتے ہیں جن کا ذکر میں پہلے کر آیا ہوں۔" میں نے فلسفیانہ بے خودی و بے خبری میں دریافت کیا "مثلاً؟" موڈھا بولا "اپنے آپ ہی کو لے لو۔" میں چونک پڑا اور دفع الوقتی اور خوشامد کے لہجہ میں بولا "میرے بھائی، کسی اور کا ذکر کرو، میرا کیا۔ خوش قسمتی سے نہ دولت مند ہوں اور نہ اتفاق سے عورت اس لیے میرے بارہ میں دنیا کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار کرنے پر آمادہ نہ ہوگی۔" موڈھا بولا "لیکن یہ تم کو کیسے معلوم ہوا کہ دنیا کی دلچسپی کے لیے خاص خاص عنوان مقرر ہیں۔" میں نے گھبرا کر کہا۔ "میرے بھائی میں تمھارے ہاتھ جوڑتا ہوں، مجھے معاف کر دو۔ دنیا کو دلچسپی ہو یا نہ ہو، لیکن جب اس کارِ خیر میں موڈھے شریک ہو جائیں تو پھر

آبرو کی خیر نہیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم موضوع کو علمی حدود سے آگے نہ بڑھنے دو۔" مونڈھا ٹھٹھا مار کر ہنسا اور کہنے لگا کہ "حدود متعین کرنے والے آپ کب ہوتے ہیں حدود تو وہ متعین کریں گے جن کا استغاثہ سب سے پہلے آپ کے خلاف عدالت میں پہنچے گا۔" میں نے کہا اور غالباً ایک آہِ سرد کھینچ کر، "ہاں بھائی سچ کہتے ہو، لیکن میں درخواست کرتا ہوں کہ جتنے پتے کی بات تم نے کہی ہے اتنی ہی ہمدردی اور خدا ترسی سے بھی کام لو گے۔"

(لیکن میری تمام منت سماجت بے کار ثابت ہوئی، مونڈھے کو میرے بارے میں جو کچھ کہنا تھا اُس نے کہا اور میں نے سنا، لیکن مونڈھے نے از راہِ کرم مجھے اجازت دے دی ہے کہ میں اُس کے بیان اور اپنے ناگفتہ بہ حالات کو شائع نہ کروں۔ مونڈھے کی اس میر چشمی سے میں بہت متاثر ہوا۔ مونڈھے کی اسی بات سے میں اس کا پرستار ہوں کہ وہ لگی لپٹی نہیں رکھتا، لیکن اُس کے لیے کسی مکان کی چھت یا چوراہے کی ضرورت نہیں سمجھتا اور نہ یہ کہ آپ سننے پر آمادہ ہوں یا اس کے ہم نوا یا شریک کار نہ بنیں تو وہ آپ کی زندگی آپ پر حرام کردے۔)

مونڈھے نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "دنیا کے کسی کاروبار کو دیکھو اسی کیلی یا کوبڑ کی کارفرمائی نظر آئے گی۔ ہر شخص اپنے کوبڑ ہی کی خاطر مارنا اور مرنا چاہتا ہے۔ شاعر، سیاست داں، جنرل، بادشاہ، تاجر، لیڈر، عارف، جوگی، امیر، غریب، چھوٹا، بڑا، تندرست، مریض غرض کسی شخص کا جائزہ لو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ سارا کھیل کوبڑ ہی کا ہے۔ یہ نہ ہو تو نوعِ انسان وجودِ معطل کے سوا کچھ اور نہیں۔ کوبڑ بیساکھی ہے جس کے سہارے انسان کھڑا ہوتا ہے اور چلتا پھرتا ہے۔"

میں نے کہا "مسٹر مونڈھے تمھارا مطالعہ یا تمھاری تحقیقات نہایت عجیب و غریب ہیں، لیکن میں ذرا کند ذہن واقع ہوا ہوں۔ اس لیے جب تک تم مجھے اس کی مثالیں نہ دو گے نہ میں کچھ سمجھوں گا اور نہ غالباً تمھارے دوسرے بھائی بند تم پر فخر کر سکیں گے۔" مونڈھے نے کسی قدر زہر خند سے کہا "میرے بھائی بند صرف مونڈھے ہیں اُن کو غیر معمولی مونڈھا بننے کی نہ ہوس ہے

اور نہ حاجت، ہم میں ہر ایک موبڑھا ہے اور اس پر قانع ہے۔ یہ تو تم انسان ہو جس کو جب تک ابنائے جنس پر کوئی تفوق حاصل نہ ہو اپنے آپ پر اعتماد ہی نہیں ہوتا۔ تم ہمیشہ سہارا ڈھونڈھتے رہتے ہو اور موبڑھے تمھیں سہارا دیتے ہیں، جس کا خود سہارا پکڑا جائے اُس کو دوسرے کے سہارے کی کیا پروا۔" میں نے کہا۔ "اس میں کیا شک ہے، آپ جیسا کچھ سہارا دیتے ہیں اُس کا اشارہ اُس سے پہلے کیا جا چکا ہے۔ اس سہارے پر صرف ایک موبڑھے کو ناز ہو سکتا ہے۔" موبڑھے نے کہا۔ "سہارا پھر سہارا ہے۔ اس لیے سہارا ڈھونڈھنے والا جہاں کا تہاں ہی رہا!"

میں نے بہ لحاظ دفع الوقتی موبڑھے کی منطق تسلیم کر لی، لیکن اس انداز سے گویا موبڑھا پھر موبڑھا ہے اس لیے میرا قائل ہونا اتنا ضروری نہ تھا جتنا موبڑھے کی تالیف قلوب بر بنائے مصلحت ضروری تھی اس لیے میں نے کہا۔ "نہیں نہیں میرا مقصد یہ نہ تھا کہ تمہاری توہین یا دل آزاری ہو میں نے صرف یہ کہا تھا کہ گفتگو لطف کی ہے اس لیے اسے طوالت دی جائے تو مزید لطف کا باعث ہوگا۔"

موبڑھے نے کسی قدر رازدارانہ لہجہ میں کہا کہ "اس کیل یا کوبڑ کی حقیقت سمجھ لینا آسان ہے، لیکن دقت یہ ہے کہ لوگ اپنے اپنے کوبڑ چھپانے کی بڑی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لیے ایسی احتیاطی تدابیر عمل میں لاتے ہیں کہ اُن کے کوبڑ کا متعین کرنا سخت دشوار ہوتا ہے۔ برنارڈ شاہ کو دیکھو سر سے پاؤں تک کوبڑ ہے اور اُس کا کوبڑا ایسے ایسے محور پر گردش کرتا ہے کہ معمولی نظریں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں، لیکن اُس کے کوبڑ میں توازن ایسا ہے کہ ذہن کو کسی طرف منتقل کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے، اُس کی نظر اتنی دور رس نہیں ہے جتنی خردبین واقع ہوئی ہے۔ وہ واقعات نہیں دیکھتا اور نہ اُس کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ اُس کی کمزوری ہے، لیکن ایک طاقتور خردبین کی طرح وہ اس حقیر ترین "آرگنزم" کو دیکھ لیتا ہے جن کا۔

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے!

اور جن سے اس دنیا کے تمام مظاہر بالیدہ اور برآمد ہوتے رہتے ہیں، پھر یہ اُن پر حکم لگاتا ہے۔ اس لیے سائنس کی رُو سے ان احکام کے قرینِ وقوع ہونے میں شبہ نہیں رہتا، لیکن ان کا امر واقع ہونا ہمیشہ مشتبہ رہے گا۔ تم جانتے ہو برگد کے بیج سے برگد کی بالیدگی یا برگزیدگی کا صحیح اندازہ نہیں

لگایا جا سکتا بلکہ خود برگد کا احصا اس کے بیج کے سمجھنے میں معاون ہو سکتا ہے۔ شاد روایت کا دشمن ہے، لیکن خود اُس کے گوشت پوست میں روایات جاری و ساری ہیں مسلک کے اعتبار سے وہ پروٹسٹنٹ ہے اور نسب کے اعتبار سے انگریزی آئرستانی۔ اُس نے اپنے آپ کو غیر شعوری طور پر رومن کیتھولک آئرستانیوں سے افضل سمجھا اور اسی احساسِ تفوق نے اُس کو ہر چیز کو روند دینے پر آمادہ کیا۔ وہ بادشاہ ہے شہری نہیں بن سکتا۔ پھر یہ بھی مشتبہ ہے کہ ہم اُس کی کس چیز پر ایمان لاتے ہیں۔ اُس کی بغاوت یا تمرد پر یا اُس کی زبان و بیان پر جو اُس کا سب سے زیادہ ہلاکت بار، لیکن دل نشیں آلہ ہے۔ وہ الفاظ اور فقروں سے ایکٹ کراتا ہے اور ہم ان الفاظ اور فقروں کی حرکت، انداز اور آواز سے مسرور، مرعوب یا مسحور ہو جاتے ہیں، لیکن مطمئن نہیں ہوتے۔

جی۔ کے۔ چسٹرٹن برنارڈ شا کا قائل نہیں ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ برنارڈ شا نے ممکن ہے راستہ کا انتخاب غلط نہ کیا ہو، لیکن جس منزل پر وہ ہم کو لے جانا چاہتا ہے وہاں حرکت ہے زندگی نہیں، آواز ہے موسیقی نہیں، رنگ ہے لیکن قوسِ قزح نہیں۔ تاہم تم کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ چسٹرٹن بجائے خود اتنا شاد و شگفتہ نہیں ہے جتنا کہ برنارڈ شا چسٹرٹن کا کو بڑ بھی ایک پہیلی ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے اور جب کامیاب ہوتا ہے تو بد دل اور مایوس ہو جاتا ہے۔ اُس نے زندگی کو کشتی سمجھ رکھا ہے یعنی جس طرح کشتی کو لے جانا چاہیے اُس کے خلاف پتوار کو حرکت دینی چاہیے۔ ظاہر ہے ایسا شخص ہمیشہ بھلائی کی کوشش کرے گا، لیکن اس کی توقعات کبھی پوری نہ ہوں گی۔

ونسٹن چرچل کو انگلستان میں جو اہمیت اور قبول عام نصیب ہے وہ اس بنا پر کہ چرچل ہر موقع اور معاملہ کو خواہ وہ کتنا ہی سنگین، نازک یا خطرناک کیوں نہ ہو ہمیشہ شربت کا گھونٹ سمجھتا ہو یا نہ ہو، لیکن اس کا یقین دلا دیا کرتا ہے۔ وہ جس منصب سے معزول کیا گیا اُس کے بعد ہی اس سے بڑے منصب پر فائز کیا گیا انسانی طبائع کی یہ اُفتاد ہے کہ وہ کسی شخص کی پیروی اس بنا پر نہیں کرتی کہ وہ بڑا فرزانہ، بہادر یا مقدس ہے بلکہ وہ مشکلات کو آسان سمجھتا ہے اور اس کا یقین دلا دیتا ہے۔ چرچل کی کامیابی اُس کے اسی کو بڑ پر رقص کرتی رہتی ہے۔

اس کے برخلاف لائڈ جارج ہیں۔ لائڈ جارج اُن لوگوں میں ہیں جن کو غیر ایمان دار نہیں کہا جا سکتا اور محض اس بنا پر کہ وہ مواعظ جبلی کے قائل کب ہیں۔ لائڈ جارج کا کو بڑ دوشاخہ ہے

بجائے خود یہ آرٹسٹ ہے، لیکن سیاست میں پھاند پڑا اور آرٹسٹ کے داعیات بھلا نہ سکا اس لیے اس کی جبلت اور غیر فطری انتخاب میں ہمیشہ کشاکش رہی۔ آرٹسٹ اور سیاست داں کے صحائفِ اخلاق بالکل جداگانہ ہیں۔ آرٹسٹ کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ زندگی کے تمام مظاہر سے آشنا رہے تا کہ اس میں ہمدردی اور وسعتِ نظر پیدا ہو سیاست داں کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ سوائے مفادِ عامہ کے ہر خیال سے منہ موڑ لے اور اپنی جماعت سے ہر اس شخص کو نکال دے جس کے مقاصد مفادِ عامہ کے منافی ہوں اور جو صرف مالِ غنیمت سے مستفید ہونا چاہتا ہو، لیکن آرٹسٹ کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ دیگر آرٹسٹ کا ہم ساز و ہم ساز رہے اور اس کا خیال نہ کرے کہ ان کی ''پیداوار'' کہاں جاتی ہے اور کیا ہوتی ہے۔ سیاست داں کا فرض اس سلسلہ میں بالکل برعکس ہوتا ہے اس کا یہ ناقابلِ عفو جرم ہوگا کہ وہ کسی ایسی تحریک یا تجویز کو پاس ہو جانے دے جو مفادِ عامہ کی معین تو ہو، لیکن اس سے اُس جماعت کا اقتدار بڑھ جائے جس کا اثر بحیثیت مجموعی ملک کے لیے مضر ہے! لائڈ جارج نے آرٹسٹ کے فرائض تو ملحوظ رکھے، لیکن سیاست داں کے فرائض بالکل فراموش کر دیے۔ بایں ہمہ سب سے بڑا کمال اس شخص کا یہ ہے کہ جب لوگ اس سے بہت زیادہ متنفر ہوتے ہیں اُس وقت بھی اسے عزیز رکھتے ہیں۔ اُس کے کوبڑ میں کیمیاوی اور میکانیکی دونوں خاصیتیں ہیں اس کی پستی کی بنا پر ہم اس پر اعتماد نہیں کرتے اور اس کی عظمت کی وجہ سے ہم کو خود اپنے اُوپر اعتماد نہیں ہونے پاتا۔

اس سلسلہ میں ریمزے میکڈانلڈ کو بھی نظر میں رکھو۔ یہ شخص ان لوگوں میں ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ آخرت میں بہشت حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ دنیا میں احمق بھی کہلائے۔ یہ شخص اُس زمانہ میں سب سے زیادہ بلند و پُرسطوت تھا جب اس کی جماعت نہایت قلیل اور کس مپرس تھی۔ اس کی مثال ایسے شخص کی ہو سکتی ہے کہ جس نے شباب میں محبت کی ہو اور ناکام رہا ہو اور پھر تمام عمر ''تندیِ صہبائے اُلفت'' سے ''گرم و گداز'' رہا۔ کیوں کہ یہ صورت دیگر یقینی ہے کہ وہ شادی کے فرائض اور اُس کے مکروہات سے پورے طور پر عہدہ برآ نہ ہو سکتا۔ میکڈانلڈ پر یہی حادثہ گزرا۔ جب تک وہ تجرید و تخیّل کی دنیا میں رہے ''جو ہر اندیشہ کی گرمی'' بے پناہ رہی، لیکن وزیر اعظم بن کر کہیں کے نہ رہے۔''

میں نے کہا ''مونڈھے صاحب کیوں نہ ہو آپ اپنی تمام بزرگی اور فرسودگی کے باوجود بھی جب گفتگو کرنے پر آتے ہیں تو اپنے علم وفضل کے اظہار کے لیے یورپ ہی کی طرف توجہ فرماتے ہیں آج کل تحقیق اور تفتیش کی اہمیت اور جامعیت صرف اس طور پر مسلّم ہو سکتی ہے کہ ہم اس کے ثبوت میں ولایتی مصنفین یا ولایتی انکشافات کا واسطہ دلائیں۔ تنقید، فسانہ نگاری، غرض اس قسم کے جتنے علوم ہیں اُن سے ہمارے ادیب صرف اس حد تک آشنا ہیں کہ ان کا ترجمہ اردو میں کرکے کسی رسالہ میں شائع کرا دیتے ہیں اور بس۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وہ ہمارے شعر وادب یا ہمارے شعراادبا کا جائزہ اُن اُصول وقوانین سے کرتے جو مغرب کے ائمۂ فن نے وضع کیے ہیں اور جن سے وہ اپنے شعراادبا کو پرکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ جو انگریزی شعر وادب سے ناآشنا ہیں ان اردو تراجم سے کسی قسم کی بصیرت حاصل نہیں کرسکتے۔ یہ کام جتنا مشکل ہے اُتنا ہی لفظ بہ لفظ ترجمہ کردینا آسان ہے۔ تم نے بھی یہی حرکت کی ہے اور اس پر خاموش رہوں تو تمہارا دماغ خراب ہو اور کچھ کہوں تو آبرو ریزی ہو۔''

مونڈھا پہلے تو کچھ چپ رہا، لیکن پھر کسی قدر سنجیدگی سے بولا، ''تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ہندوستان زندگی کی کشاکش اور اس کی تنوعات سے اتنا کبھی آشنا نہیں رہا جتنا کہ یورپ رہا ہے اور یہی سبب ہے کہ اس کے ہاں وہ چیزیں نہیں ملتیں جو یورپ میں عام اور مکمل ہو چکی ہیں۔ ہندوستان نوامیسِ طبعی کے مصائب ومہالک (مثلاً طوفان، سیلاب، قحط، وبا، آب وہوا وغیرہ وغیرہ) سے جس قدر آشنا ہوتا رہتا ہے اتنا ہی یورپ، سیاسی، معاشرتی اور ذہنی انقلابات سے دوچار ہوتا رہتا ہے اور یہی سبب ہے کہ مشرق یکساں ایک یکسو ہے اور اس درجہ یکساں اور یکسو کہ اس پر ایک حد تک جمود طاری ہو گیا ہے۔ یورپ میں یکسوئی ہو تو وہاں کی مخلوق تباہ ہو جائے۔ بہ الفاظ دیگر زرعی ممالک، صنعتی ممالک سے کہیں زیادہ زندگی اور اُس کے علائق سے اجنبی رہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ عملی زندگی سے یورپ، ایشیا سے زیادہ مکمل اور زیادہ آشنا ہے اس لیے جن علوم اور فنون سے جس طور پر اور جس حد تک وہ باخبر، مرصّع یا مسلّح ہے وہ ہندوستان میں معدوم ہے۔ سائنس کے کرشموں کو جانے دیجیے۔ تنقید، فسانہ نگاری، ناول، ڈراما، سینما یورپ کے 'آوردہ' ہیں۔ یورپ والوں نے ان چیزوں کو زندگی میں دیکھا اور برتا ہے۔ ہندوستان کو

اس کے مواقع نہ تھے اس لیے یہ چیزیں یہاں نہایت ابتدائی مراحل میں ہیں اور یہی سبب ہے کہ ہم ان کو اپنے ہاں تطبیق دینے سے قاصر رہتے ہیں اور یہ چیزیں ہمارے ہاں نہایت درجہ ابتدائی حالت میں ہیں۔"

اب مونڈھے نے کسی قدر سرکہ جبیں ہوکر کہنا شروع کیا "ہندوستان کے شعرا یا افسانہ نگاروں کا کیا کہنا۔ ان پر بگڑنا بھی بدمذاقی ہے اس وجہ سے اور یہ کہ ہر کس و ناکس نے ان کو برا کہنا اپنا شعار بنالیا ہے ان بزرگوں سے کوئی پوچھے کہ آپ خود شعر اور افسانہ سے کب متہم ہوئے کہ آج شعرا یا افسانہ نگاروں کے لیے عذابِ جاں بن گئے ہیں۔ ان دنوں اردو کے رسالوں میں عجیب وبا پھیلی ہوئی ہے۔ ہر قسم کے بےفکروں کو دعوت دے رکھی ہے کہ آپ سے شعر و افسانے کیسے سرزد ہوتے ہیں۔ اس مصرعہ طرح پر وہ وہ طومار باندھے گئے ہیں کہ شرفا پر دنیا تنگ ہوگئی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس پر خاص خاص اوقات میں قسمہ یا اقسام کے فرشتے نازل ہوتے ہیں اور اُس کا گلا گھوٹنے لگتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زبان اور آنکھیں باہر نکل آتی ہیں اور یہ شعر یا افسانہ اُگلنے لگتا ہے۔ ایک صاحب جب تک کسی حسین دوشیزہ کو اپنے آپ پر عاشق نہیں پاتے اُس وقت تک مطلق جھک نہیں مارتے۔ ایک ایسے ہیں جو خلوئے معدہ میں کچھ فرمانا شروع کرتے ہیں۔ دوسرے حقہ، پان، خوشبو، تنہائی، موسیقی، سینما، برنارڈ شا، ہارڈی، شملہ، کشمیر، چوپاٹی، دوسروں کی دولت، اپنی کم ظرفی، جوان بیوہ کھدّر کی ساری، بخار، کھانسی بغیر کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تم یقین مانو یہ صرف دھتوریا پن ہے۔ اچھے معقول لوگ اُس وقت تک ہرگز لکھنے لکھانے پر مائل نہیں ہوتے جب تک کہ ان کی جان یا عزّت خطرہ میں نہ پڑ جائے۔"

میں نے کہا "میرے دوست تمھارے سر عزیز کی قسم، سچ کہتے ہو"۔ مونڈھا تیور بدل کر بولا۔ "لعنت ہے میرے سچ بولنے اور تمہارے قسم کھانے پر یہ قسم کھانا نہیں ہے اسے لفنگا پن کہتے ہیں۔" میں نے نہایت خفیف ہوکر کہا "بھائی معاف کرو۔ تم یقیناً سچ بولے اور میری قسم بھی مخلصانہ تھی یہ اور بات ہے تمھارا 'سر' کسی قدر خلاف واقعہ ہو"۔ مونڈھے نے کہا "کم ظرف کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ وہ قائل ہونے پر بھی طعن و تمسخر سے باز نہ آئے۔" میں نے کہا "میرے دوست یہ بھی عالی ظرفی کا کچھ اچھا نمونہ نہیں ہے کہ کم ظرفوں پر بار بار اُن کی کم ظرفی جتائی جائے۔"

کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش رہے اور غالباً اس اندیشہ سے کہ جو پہلے بولا، گویا اُس نے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا۔ مونڈھا بڑا گھاگھ تھا اُس نے کچھ ایسا حبس دم کیا کہ میں گھبرانے لگا چنانچہ میں نے کسی قدر کاوا کاٹ کر کہا، ''آج کئی دن بعد موسم میں اعتدال پیدا ہوا۔ کیسی اچھی دھوپ نکلی ہے۔'' مونڈھا یک لخت برس پڑا۔ ''کیوں جی، کیا کسی دوشیزہ کو بھگا لے جانے کا ارادہ ہے جو سلسلۂ گفتگو چھیڑنے کے لیے تم نے وہی بندھا ٹکا فرسودہ مغربی طریقہ اختیار کیا کہ موسم اچھا یا برا ہے۔''

میں نے کہا'' بھائی میں مشرقی نہیں پوربی ہوں بات نہ کروں تو بادلا ہو جاؤں، لیکن تم نے ایسا دم سادھا کہ مجھے اختلاج ہونے لگا۔ حالاں کہ ابھی ہندستانی کبڑوں کی تفصیل باقی ہے۔'' مونڈھے نے کہا''تفصیل تو کب کی ختم ہو جاتی، لیکن تم بیچ میں ایسے ایسے رخنے پیدا کرتے رہتے ہو کہ بات کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے۔'' میں نے کہا'' پچھلی بار ہندستانی شعرا اور افسانہ نگاروں تک بات پہنچی تھی وہیں سے پھر سلسلہ شروع کر دیا جائے۔''

مونڈھا بولا ''میں شعرا پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں نہ کہ دوبارہ۔ تم نے ماگھ میلا دیکھا ہوگا، اس ماگھ میلے کا بھی ایک قبلہ گاہ ہوتا ہے جس کو شاید کبھ کا میلہ [1] کہتے ہیں جو غالباً 30-25 سال بعد ہوا کرتا ہے۔ اس میں تم نے ایک جماعت ناگا لوگوں کی دیکھی ہوگی۔ جس طرح میلہ کے موقع پر یہ خروج کرتے ہیں اور اُن کی جو کچھ ہیئت کذائی ہوتی ہے اُس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح مشاعرہ کے موقع پر یہ ناگا شاعر جمع ہوتے ہیں۔ مشاعرہ اور کبھ کے میلے میں صرف یہ فرق ہے کہ موخرالذکر کی نوبت مدت بعد آتی ہے۔ موت کی مانند مشاعرہ کا بھی کوئی وقت متعین نہیں ہے 'ناگا' اور 'ننگے' میں یوں بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ ننگے کو آپ جو معنی چاہیں پہنالیں کوئی قباحت لازم نہ آئے گی اور میری طرف سے ''بھوکے'' بھی شامل کر لیجیے تو پھر سارا مشاعرہ... نورٌ علیٰ نور!''

مونڈھے نے کسی قدر مطمئن ہو کر کہنا شروع کیا۔'' ہاں تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں ان شاعروں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جن کے کو بڑ معنوی اور مخصوص ہیں نہ کہ اُن لوگوں کا جو جاکڑ پر کو بڑ

1۔ یہ میلہ الٰہ آباد میں ہوتا ہے۔

لیے پھرتے ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان شاعروں سے اُن کے کوبڑ چھین لیے جائیں تو اُن کی ساری خصوصیات زائل ہو جائیں اور یہ کہیں کے نہ رہیں۔

اقبال کو آج جو سربلندی شعرا میں حاصل ہے اس پر کسے ایمان نہیں۔ ایک زمانہ تھا جب کبڑے شاعروں نے اپنی اپنی بیساکھی سنبھال لی تھی، لیکن انجام یہ ہوا کہ ان سب کو یقین آ گیا کہ اقبال کے مقابلہ میں اُن کے کوبڑ اور بیساکھی دونوں کی خیر نہیں، اس لیے سب چپکے ہو گئے۔ اب بھی کہیں کہیں اور کبھی کبھی غُرفش سنائی دے جاتی ہے، لیکن اس کی مثال کوٹھی کے اُن اپاہج چوکیداروں کی ہے جو سرِ شام اُونگھنا یا سونا شروع کر دیتے ہیں، لیکن دو چار بھلے مانس گزرنے لگیں تو کھنکارنے لگتے ہیں۔ جس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ آپ کی شرافت اور دیانت داری مسلّم، لیکن خاکسار بھی نمک حلال ہے!

ہر زبردست اور حقیقی شاعر کی شاعری کی مانند اقبال کی شاعری بھی خاص خاص کیلیوں پر گھومتی ہے۔ اس کوبڑ کی مثال نظامِ شمسی سے دی جا سکتی ہے یعنی جس طرح اجرامِ فلکی کسی مخصوص سورج یا ستارہ کے نظام سے وابستہ ہوتے ہیں، اسی طرح اقبال کے الہامات بھی خاص خاص مراکز سے وابستہ ہیں۔ ان سے انحراف ناممکن ہے۔ مثلاً جبریل، رومی، نیٹشے، آدم، یزداں کعبہ و سومنات، اسداللّٰہی، رازی، غزنوی، پرویز، چنگیز، غزالی، عطار، شاہین، قہستانی، صوفی و ملا، زندیق، خیبر، عرب و عجم، لاالٰہ، لاہو، فرنگ، المانی، قیصر و دارا، غازی، شیطان، سمرقند، تبریز، کارواں، ضمیر، خضر، فلاطون، شیشہ، عقاب، المان، عطار، فاروق، کلیم، ایاز، توران۔

اسی طرح اکبر کے بھی کوبڑ ہیں مثلاً:

کمسریٹ، اُونٹ، علی گڑھ، پانیر، گو، مس، شیخ جی، مولوی، چندہ، کالج، مبدھو، برہمن، عرضی، پریڈ، صاحب، میم، گزٹ، جمن، ہسٹری، پتلون، منصور، ڈارون، بوزنہ، توپ، یورپ، امتحان، پرچہ، خانساماں، پلٹن، اسپیچ، بنگلہ، نیچر، تھو، مہذب، سرسید، لنگوٹی، گدام، ٹفن، بسکٹ، فیشن، ڈاکٹر، ہسپتال، رپٹ، تھانہ، ناقوس، پوری، انجمن۔

غالب کا بھی رنگ دیدنی ہے۔

دام شنیدن، شہرِ آرزو، صیدِ زدام جستہ، محشرِ خیال، پہلوئے اندیشہ، باندازِ چکیدن،

طعنۂ نایافت، شبنمستان، نسیہ ونقد، دوعالم، جوہرِ اندیشہ، صیقل، زمرد، طاقِ نسیاں، سنگ وخشت، خودداریِ ساحل، معاشِ جنونِ، نبضِ خس، شہپر رنگ، زنجیرِ رسوائی، مبادا، صبحِ محشر، کنگرِ استغنا، افشردۂ انگور، برگِ ادراک، گلبانگ تسلی وغیرہ۔

اصغر 1 بھی اس وادی میں پیچھے نہیں رہے ہیں، مثلاً:

حسنِ بیاں، مجاز وحقیقت، حسنِ نظر، پردہ، تجلّی، رنگِ صہبا، شوق، رنگینیِ مینا، وادیِ سینا، شاخِ آشیاں، شبنم، عقل وعشق، ساز وراز، رند، داستان، ساحل، محفل، خستگی، قیدِ نظر، فتادگی، پرواز، قفس، نغمۂ ہستی، رند، برسوں، جلوۂ بے رنگ، عکس، حجاب، نمود، ذوق، لاہوت، آواز، کاوش وغیرہ۔" ۔

....

موبڈھے کی اس مردم شماری کی رپورٹ سے مجھے بڑی وحشت ہوئی اور میں نے کہا "میرے دوست تمھاری اس فہرست خوانی پر میں تم کو داد دیتا ہوں بشرطیکہ تم میرے ساتھ بھی ہمدردی کرو۔ میرے نزدیک اس فہرست کا بہترین مصرف یہ ہے کہ شعرا یا والدین اس میں سے اپنے لیے تخلص منتخب کریں، یا بچوں کا نام رکھیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم نے دوسرے شعرا کے کوبڑوں کا شمار کرنا شروع کیا تو نہ میری خیر ہے اور نہ سہیل کی۔ شعرا اور طلبا کے منہ لگنا بزرگوں کے نزدیک غیر دانش مندانہ فعل سمجھا گیا ہے۔"

موبڈھے نے کہا۔ "میرا مقصد کسی کی توہین نہیں ہے بلکہ میں نے سب کے کوبڑ عرض کیے ہیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ شاعری کے بارے میں جو لوگوں کا خیال ہے کہ شاعری وہی چیز ہے تو یہ بڑی ہولناک غلط فہمی ہے۔ شاعری بھلمنساہٹ قسم کی کوئی چیز نہیں ہے کہ بھلا مانس ہونا بجائے خود ایک معقول فعل ہے اور اس کے لیے ضروری نہیں کہ آدمی سمجھ دار بھی ہو۔ لکھا پڑھا بھی ہو، دنیا دیکھے بھالے ہو، اچھی بُری صحبتوں میں بیٹھا ہو۔ ہمارے شاعر صرف اس پر اکتفا کر لیتے ہیں کہ وہ شاعر ہیں اور ہم اُن کے ساتھ ہر قسم کی خوبی یا خرابی محض اس بنا پر وابستہ کر دیتے ہیں کہ وہ شاعر ہیں۔

مستثنیات سے قطع نظر اردو شاعری کی یہی اصلی خرابی ہے۔ چنانچہ ہمارا شاعر صرف اس فکر میں رہتا ہے کہ شعر کہے جائے، مقدمہ لکھاتا جائے، دیوان چھپاتا جائے اور ــــ فاقہ کرتا جائے۔

---

1 اصغر گونڈوی اصغر حسین پیدائش: گورکھ پور یکم مارچ 1884 وفات: الٰہ آباد، 30 نومبر 1936

وہ شعر کہنا مقصود بالذات سمجھنے لگا ہے، چنانچہ آپ دیکھیں گے بات کرنے کی اُسے تمیز نہیں، سلیقہ سے رہنا اُسے نہیں آتا، کسی مسئلہ پر اس سے گفتگو کیجیے تو ٹھکانے کا جواب نہیں دے سکتا، معقول کتابیں اُس کی نظر سے نہیں گزریں، حسنِ معاشرت سے وہ بے خبر، غرض کہ محض شاعر ہونے کے بعد، وہ اس حقیقت سے بالکل بے خبر اور بے نیاز رہتا ہے کہ دنیا نے علوم وفنون، ایجادات وانکشافات، اخلاق وتمدن اور اس قبیل کی دوسری چیزوں میں کہاں تک ترقی کر لی ہے اور اُن سے آشنا ہونا یا استفادہ کرنا ضروری بھی ہے۔ یہی سبب ہے کہ آپ اُس کے کلام میں تازگی، طرفگی، لطافت، بانکپن، عمق، وسعت، بلندی، زور یا صلابت نہ پائیں گے۔ وہ زندگی کا منکر اور جذبات کا بندہ بن جاتا ہے، اور محض اس بنا پر کہ زندگی کو برتنا پڑتا ہے اور یہ مشکل چیز ہے اور جذبات غیر شعوری اور غیر ارادی ہوتے ہیں اس لیے اُن کو سہل الحصول سمجھتا ہے۔ وہ محنتی اور ایماندار ہونا پسند نہیں کرتا اس لیے کہ توکل نے اسے اپاہج بنا دیا ہے۔"

میں نے ایک آہ کھینچی اور ایسے سُروں میں کہ اسے ضرورت کے وقت یاس و حزن سے بھی تعبیر کیا جا سکتا تھا اور خفگی وخجالت سے بھی۔ مونڈھا خاموش ہو گیا، لیکن اسی انداز سے کہ آپ چاہیں تو اُسے ہمدردی کی بنا پر سمجھ لیں اور چاہیں تو تکدر اور برہمی کو اُس کا سبب قرار دے لیں۔

میں نے کہا۔ "ہترم!" مونڈھے نے بدک کر کہا، "یہ کیا؟" میں بولا، "یہ ہندی اور فارسی کا ملاپ ہے، آواز کے اعتبار سے سنسکرت اور معنی کے لحاظ سے اردو یعنی میرے دوست!"

مونڈھا بولا "نہایت خوب ،للّٰھم زد فزد۔ اس جدت کی داد یا تو آپ کو دی جا سکتی ہے یا سر رضا علی[1] کو جو افریقہ میں ہندوستانیوں کے حقوق کی نگہداشت کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے اس اجتہاد سے اس خیال کے ہندوؤں کی بھی تشفی ہو جائے گی کہ ہندوستان میں صرف ہندو رہ سکتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ یہ خیال ہمارے دوستوں میں اُس وقت پیدا ہوا جب مسولینی حبش میں اس کا جواب ہلالِ احمر کو دے رہا ہے اور جرمن کہنے لگے ہیں کہ ہم کو ہماری نو آبادیات واپس ملیں۔ ہندوستان چھوڑنے کا غم مسلمانوں کو کب ہے، فکر انگریزوں کو ہونی چاہیے یا پھر ڈاکٹر امید کر کو اور پھر کچھ اور نہیں تو یہ کیا کم ہے کہ مسلمانوں کے چلے جانے سے، سکھوں کو مسجد شہید گنج مل جائے گی،

---

[1] سر رضا علی مصنف اعمال نامہ۔ ولادت مراد آباد (یو پی) 29 اپریل 1882، وفات: 1949

ہندستانی اکیڈمی کو اردو ہندی کے قضیہ سے نجات حاصل ہو جائے گی، مسلم یونیورسٹی کا میزانیہ متوازن ہو جائے گا اور اسٹیشنوں پر چائے سے ہندو مسلمانوں کی تفریق مٹ جائے گی۔"

میں نے کہا "موںڈھے صاحب، اس قدر برہم ہونے سے خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے اور آپ کا سن و سال اور آپ کی حالت صحت ایسی نہیں ہے کہ آپ ان باتوں سے اس درجہ متاثر ہوں۔" موںڈھے نے کہا "موت سے وہ ڈرے جسے موت پر ایمان نہ ہو، تم اس لیے ڈرتے ہو کہ سمجھتے ہو شاید موت ٹل جائے حالاں کہ موت آ گئی تو ٹلتی نہیں اور نہیں آئی تو ہرگز نہیں مرو گے۔"

میں نے کہا "اس قسم کی منطق سے تم کو شرم نہیں آتی۔ پڑھے لکھے سمجھ دار لوگ اسی قسم کی بندھی ٹکی باتوں پر ہنستے ہیں۔" موںڈھا بولا "سمجھ دار لوگ منطق پر ہنستے ہیں ایمان کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ دنیا منطق سے نہیں ڈرتی وہ ایمان سے لرزتی ہے، لیکن تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گے۔ ایک ادنیٰ سی مثال یہ ہے کہ ابھی ابھی اخبارات میں ایک خبر آئی تھی کہ ترکی، عراق، عرب، فارس اور افغانستان کی حکومتیں ایک ایسٹرن بلاک قائم کرنا چاہتی ہیں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے ان کا مقصد کیا ہے اور اس کا انجام کیا ہوگا، لیکن ہندوستان ٹائمز کے کان کھڑے ہو گئے اور اُس نے نہایت دل سوزی کے ساتھ ہم مسلمانوں کو اطلاع دی ہے اور غالباً اس اندیشہ سے کہ ہم ہندوؤں کے اعلان کے مطابق ہندوستان کو فی الفور خیر باد نہیں کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کو پین اسلامزم یا خلافت وغیرہ کا خواب نہیں دیکھنا چاہیے۔ اس بلاک کا کوئی خاص مقصد نہیں ہے بلکہ یہ محض بے کاری کا ایک مشغلہ ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آیا کہ ہندوستان ٹائمز کو اس قدر ہمدردی کے اظہار کی ضرورت کیا تھی۔ ابھی ہندوستان ٹائمز کی آواز ہندوستان کے طول و عرض میں پورے طور پر پھیلنے بھی نہ پائی تھی کہ مہاسبھا کی طرف سے یہ اعلان شائع ہوتا ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کے لیے اور ایک صاحب وائسرائے سے درخواست کرتے ہیں کہ سر رضا علی شادی نہ کرنے پائیں کیوں کہ اس سے جنوبی افریقہ میں جماعتی مناقشہ پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے!"

میں نے کہا "بھائی موںڈھے تم تو موںڈھے نہیں خاصے سیاست داں نکلے اور تم جانتے ہو کہ میں موںڈھے پر بیٹھ کر پالیٹکس پر گفتگو کرنا قطعاً پسند نہیں کرتا۔ پالیٹکس پر گفتگو کرنے کے لیے ضرورت اس کی ہے کہ یا تو خود قید خانہ جائے یا دوسروں کو بھجوائے۔ میں اپنے میں کسی ایک کی بھی

اہلیت نہیں پاتا اور پھر اصولاً مجھے یہ بھی پسند نہیں ہے کہ تم علمی اور ٹھوس باتوں کو چھوڑ کر روز مرّہ کے واقعات یا متفرق اشخاص پر اظہار خیال شروع کردو۔" مونڈھے کو میرے اس بیان کی صداقت پر یقین نہیں آیا۔ اُس نے کہا" گھاگھیت کسی اور سے کرنا بات اصل یہ ہے کہ علمی قسم کی باتوں سے دوسروں پر رُعب پڑتا ہے اور روز مرّہ کے واقعات یا اکا دُکا اشخاص پر اظہار خیال کرنے سے آدمی پٹ جایا کرتا ہے اس لیے آپ نے فی البدیہہ یہ اُصول گڑھ دیا۔ آپ کو شاید یہ نہیں معلوم ہے کہ انسان اس وقت تک کسی اصول کی آڑ نہیں پکڑتا جب تک اُس کا بے ایمانی کا ارادہ نہیں ہوتا۔ جب دیکھو کہ کوئی شخص گفتگو اس طور پر کرنے جارہا ہے کہ اُس کا "اُصول یہ ہے" تو فوراً سمجھ لو کہ وہ جھوٹ بولنے یا بے ایمانی کرنے پر آمادہ ہو رہا ہے ایسے وقت میں یا تو تمہیں جلد سے جلد وہاں سے بھاگ جانا چاہیے یا پھر مبلغ اصول کی زدوکوب شروع کر دینی چاہیے۔"

....

میں نے کہا" دوست کوئی ایسی صورت نکالو جس سے نہ تو یہ معلوم ہو کہ علیت کی آل انڈیا قسم کی کوئی چیز مقصود ہے اور نہ اس سردی میں ہلدی پھٹکری کی تلاش کرنی پڑے۔ بات اصل یہ ہے کہ تم نے کبڑوں کی بحث میں بعض ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جن کے سمجھنے کے لیے شانتی نکیتن وغیرہ قسم کے آلے کی ضرورت ہوگی اور تم سمجھو یہ مسلم یونیورسٹی ہے جہاں ۷ر گھنٹے پڑھائی کے اور پانچ وقت نماز کے مقرر ہیں اور بقیہ اوقات میں یا تو سائرن کی نفیر سنیے یا دردمندانِ قوم کی سب وشتم۔ اس لیے میں چاہتا ہوں جو کچھ کہو وہ ایسی کہو کہ جلد ہی سمجھ میں آجائے اور اس سے جلد فراموش ہو جائے۔"

مونڈھا ذرا فیاضی سے مسکرایا۔ یعنی اُس شخص کی مسکراہٹ کی مانند جس کے دانت مصنوعی ہوں اور ڈھیلے بھی۔ بولا" دردمندانِ قوم کے کوبڑوں پر اظہار خیال کرنے کے لیے وقت اور فرصت چاہیے۔ تم کو شاید معلوم نہیں ہے کہ جس قوم پر سب سے زیادہ آفت نازل ہونے والی ہوتی ہے اُس میں دردمندانِ قوم کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ مونڈھا ہونے کی حیثیت سے مجھے دردمندانِ قوم کے سمجھنے کے بڑے مواقع حاصل رہے ہیں، اور تمہیں شاید معلوم نہ ہو، ہر قوم کے دردمند بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کے دردمند اور قسم کے ہوتے ہیں، مسلمانوں کے اور قسم

کے۔ اُن کی ذہنیت بھی بڑی دلچسپ ہے۔ اس لیے ضرورت اس کی ہے کہ اُن کے کوبڑوں کا عمودی اور اُفقی سکشن تراشا جائے اور اس کا خردبینی معائنہ کیا جائے۔'' میں گھبرا گیا۔ بولا ''اُخی مونڈھے للہ بخشو، تم جہاں مجھے لیے جا رہے ہو وہاں میرا یقیناً وصال ہو جائے گا۔ مجھے پکے گانے اور سائنٹفک بحث دونوں سے وحشت ہوتی ہے اور تم کو تو معلوم ہے مجھے جب وحشت ہوتی ہے تو مجھے کم اور دوسروں کو بہت زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔''

مونڈھے نے کہا ''دنیا ایک مسلسل کوبڑ ہے۔ جس طرح جغرافیہ میں خطِ ارتفاع کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے اسی طرح نوعِ انسان کے کوبڑوں کا بھی خط ارتفاع بنایا جاسکتا ہے، لیکن تم اب تفصیل سے گھبرانے لگے ہو اس لیے میں کوبڑوں کی صرف بعض جزئیات کو معرضِ بحث میں لانا چاہتا ہوں، لیکن اس قسم کے کوبڑ کو سمجھنے کے لیے بعض موٹی موٹی باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں مثلاً: طبیعاتی نقطۂ نظر سے صفحۂ ارض کے کوبڑ، پہاڑ اور پلیٹو، پہاڑوں کے کوبڑ بسبیل تذکرہ نینی تال اور شملہ، نینی تال اور شملہ کے کوبڑ کسی کی بیوی کسی کے شوہر، شوہر اور بیوی کے کوبڑ مغربی داعیات اور مشرقی واہیات، موخر الذکر کے کوبڑ رشید احمد صدیقی۔ رشید احمد صدیقی کا کوبڑ.....'' مونڈھا یہیں تک پہنچا تھا کہ ''اٹما سفرکس'' (فضائی خلفشار؟) کا ایسا ہنگامہ بلند ہوا کہ کچھ سنائی نہ دیا، سکون ہونے پر میں نے کہا ''کیوں جناب اب شرافت یہی رہ گئی ہے کہ آپ وعدہ کرنے پر بھی اپنی اصلیت سے باز نہیں آتے۔'' مونڈھے نے کہا ''تم تو ناحق گھبرا گئے۔ میں جو کچھ کہنے والا تھا اُس سے تم یقیناً خوش ہوتے یہ اور بات ہے کہ تم سے جو وابستہ کیا جاتا وہ میرا ازلی دشمن بن جاتا'' میں نے پیچ وتاب کھا کر کہا، ''آپ جو احسان مجھ پر کرنے والے تھے اُس کا شکریہ، لیکن اوباشی اور کمینگی بھی کچھ اسی قسم کی چیزیں ہوتی ہیں۔''

مونڈھے نے کہا ''شاباش، کیسی ستھری زبان اور کتنا پاکیزہ اسلوب بیاں ہے اور ذرا چہرہ کا برزخ تو ملاحظہ فرمایئے، جس کا ریلیف نقشہ ہے جس میں دریائے نیل کا منبع.....'' مونڈھا خاموش ہونے والا نہ تھا اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لمحہ بہ لمحہ ایک سے ایک تلخ حقیقت بیان کرتا جائے گا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک گرگ باراں دیدہ سیاس کی طرح جسے زک پہنچ چکی ہو، لیکن خون کے گھونٹ پی کر ہشاش بشاش ہو میں نے کہا۔ ''مانتا ہوں دوست، کیا بات

کہی ہے، بھائی بڑے ذہین ہو، خدا خوش رکھے، (ایک تھکی ہوئی آہ کے ساتھ)۔
یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ!"

موونڈھے نے کہا۔ "چہ چہ چہ، تم تو کانٹوں میں گھسیٹے ہو۔ بھائی خدا بخشے یا نہ بخشے، لیکن تمہاری خوبیاں مسلّم ہیں۔"

کچھ دیر تو میں اپنی اوقات پر نفرت کرتا رہا اور موونڈھے کی شیطنت پر انگاروں پر لوٹتا رہا، لیکن اس خیال سے کہ دنیا فانی ہے اور یونیورسٹی میں تعطیل ہے موونڈھے سے سلسلۂ کلام جاری رکھنے پر آمادہ ہو ہی گیا اور چونک کر بولا۔ "ہاں خوب یاد آیا (نامعقول کلام کو ختم کرنے اور معقول کلام کے شروع کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے) تم نے کیڑوں کے بعض نہایت دلچسپ خصائص بیان کرنے شروع کیے تھے۔" موونڈھا کچھ بڑبڑایا جس کو میرے واہمہ نے یہ بتایا کہ موونڈھا میری بات ٹالنے کی شرم ناک کوشش پر بہ آوازِ بلند کچھ سوچ رہا ہے، لیکن اب میں کافی ڈھیٹھ ہو گیا تھا۔ اس لیے دشنام سے فروش، پی کر بولا، "لیکن بھئی نام وام لینا ٹھیک نہیں ہے۔ ہم تم یوں ہی کیا کم بدنام ہیں، کسی نے کوئی بات اُڑا دی تو تخفیف تصدیعہ قسم کا کوئی حادثہ ہو جائے گا۔" موونڈھا بولا، "بدنام ہو گے تو تم، یہ میں کہاں سے بیچ میں آ گیا؟" موونڈھے کی یہ سرد مہری اور کج خلقی مجھے نہایت شاق گزری، لیکن کیا کرتا۔ خون کے گھونٹ پہلے ہی پی چکا تھا، انگارے پر بھی لوٹ چکا تھا۔ دُشنام سے فروش قسم کی چیز بھی حلق سے اُتاری جا چکی تھی، اس لیے سوائے جل بھُن کر کباب ہونے کے اور کوئی چارۂ کار نہ تھا، وہ بھی ہو لیا تو میں نے کہا "گذشتہ را صلوٰۃ"؛ "لیکن ابھی پوری بات بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ موونڈھا کئی بار تُھڑی تُھڑی کر چکا تھا۔ میں نے آخر جھنجھلا کر کہا۔ "بھائی تم نے تو سانس لینا دشوار کر دیا۔" موونڈھے نے کہا۔ "آخر تم کو تمیز کب آئے گی، گذشتہ را صلوٰۃ قسم کے فرسودہ فقرے استعمال کرنا کب چھوڑو گے؟" میں نے کہا۔ "اچھا بھائی، کان پکڑتا ہوں۔ توبہ کرتا ہوں۔ اب کروں تو جو سزا چور کی،" اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ موونڈھا بڑی بھیانک آواز سے چیخا، "چپ!"

....

میری خاموشی میں فدویت کا رنگ پا کر موونڈھا کچھ ڈھیلا پڑا۔ اُس نے کہنا شروع کیا "اس وقت ہندوستان میں ہندو مسلمان انگریز متضاد جذبات کی کشاکش میں مبتلا ہیں۔ ہندو جاہ چاہتے

ہیں اور مسلمان روٹی۔ انگریز دونوں چاہتے ہیں۔ ہندوستان کو کوئی نہیں چاہتا۔" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا: "میں اس قسم کی گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔" موٹا ھاقدرے چیں بجبیں ہوکر چپ رہا۔

کسی قدر تامل کے بعد اس نے کہا: "میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ہر شخص اپنے اپنے کوبڑ میں مبتلا ہے۔ عام طور پر اسے انگریزی میں کمپلکس کہتے ہیں۔ جس کی تعبیر فارسی میں، "ہر کس بخیال خویش خبطے دارد" سے کی گئی ہے۔ ابھی اُس دن ایک صاحب تم سے ملنے آئے تھے۔ تم نے اُن کے بارہ میں کیا خیال قائم کیا۔ ان کا کوبڑ سب سے زیادہ دلچسپ ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ اُن سے زیادہ لمبی ناک کسی کی نہیں ہے اور اُن سے زیادہ عقل مند کوئی دوسرا نہیں ہے اور پھر شکایت یہ کرتے تھے کہ وہ کسی میں خلوص نہیں پاتے۔ اب انھیں کون سمجھائے کہ اُن کی عقل مندی کبھی کسی دوسرے میں خلوص اور ہمدردی کے جذبات نہیں اُبھار سکتی۔ ورنہ دنیا میں سب سے زیادہ ہمدرد اور مخلص شیطان کے ہوتے۔ اگر طاعون کی چھوت سے ہیضہ نہیں پیدا ہوسکتی تو عقل مندی کی چھوت سے ہمدردی یا خلوص کیوں پیدا ہو؟ دوسرے یہ کہ یہ بزرگ کبھی اس کے قائل نہ ہوں گے کہ وہ اپنی عقل مندی سے ہمیشہ خود ہی فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں حالاں کہ اس دنیا میں عقل مندی سے فائدہ وہی شخص اُٹھا سکتا ہے جو کبھی کبھی اپنی عقل مندی سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچنے دے۔ اس میں شک نہیں عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ اپنا فائدہ ہاتھ سے نہ دے، لیکن سب سے بڑی عقل مندی یہ ہے کہ کبھی کبھی دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہو تو خاموش بھی رہے۔ تم نے محسوس کیا ہوگا یہ اپنے آپ کو مظلوم بھی سمجھتے ہیں حالاں کہ انھوں نے مظلومی کا معیار یہ رکھا ہے کہ وہ چیز جس کے یہ مستحق نہیں ہیں وہ ان کو کیوں نہ حاصل کرنے دی گئی۔ خدا نے ان کو دولت اور حکومت دونوں دے رکھی ہے، بیوی اور بیڑوں کا بھی شوق ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کوبڑ۔

لگا ہے پاؤں میں نکلا ہے سر سے

ان کو یہ نہیں معلوم کہ دولت اور حکومت سے اطمینانِ قلب نہیں حاصل ہوتا بلکہ اطمینانِ قلب سے سب کچھ میسر آجاتا ہے۔

ایک دوسرے بزرگ ہیں جن کی آواز میں کوبڑ ہے۔ یہ تھوڑے سے دردمند قوم بھی ہیں ان کے نزدیک یونیورسٹی کا کوئی کام ٹھکانے سے نہیں چل رہا ہے اور محض اس لیے کہ یونیورسٹی نے

ان کی آواز سے نہیں بلکہ سائرن سے فائدہ اُٹھانا زیادہ بہتر سمجھا، ان کو یہ مغالطہ ہے کہ معاملہ فہمی اور خلوص میں ان کا ثانی کوئی نہیں ہے اور کسی اور میں اس قسم کی کوئی صلاحیت پیدا ہوتی بھی ہے تو وہ جلد مر جاتا ہے۔ موت وغیرہ قسم کی چیز کو ہر شخص مختلف معنی پہناتا ہے، آپ معنی پہنانے کے بجائے اُس کے اُمیدوار رہتے ہیں کہ موت اپنا کام کر جائے اور متوفی کے وارث خود قرار پا جائیں۔ یہ ان لوگوں میں ہیں جن کو یونیورسٹی اگر بیڑیاں بیچنے کا ٹھیکہ نہیں دے سکتی تو یونیورسٹی بے ایمان اور خائن ہے اور بیڑیوں سے بڑھ کر دنیا میں مفید کوئی چیز نہیں ہے۔ جس طرح سے بعض مریضوں کو بعض غذائیں نہیں راس آتیں اسی طرح ان کو کسی کی نیک نامی نہیں بھاتی۔ سوٹ پہنتے ہیچ پوچ اور حقیر فقیر ایسے واقع ہوئے ہیں کہ لوگوں کو خیال بھی نہیں آتا کہ آپ کی طرف توجہ کریں ان سے کچھ بعید نہیں ہے کہ کبھی یہ اپنی کس مپری کا یوں بدلہ لیں کہ کلاک ٹاور سے رسّی باندھ کر خود کو پھانسی لگا لیں اور جیب سے یہ کتبۂ مزار برآمد ہو:

''دردمندانِ قوم کی طرف سے نونہالانِ قوم کی خاطر''

آپ نے حال ہی میں ہندوستان سے سفر کیا ہے اور فی الحال سراندیپ میں رونق افروز ہیں سنتے ہیں بکاولی کے عشق میں جسم کا نصف حصہ پتھر کا ہو گیا ہے۔ انگریزی میں اسے جو چاہیں کہہ لیں اردو میں صرف 'نصف پتھر' کہتے ہیں۔''

....

اس مضمون کی ابتدا یوں ہوئی کہ سہیل کے جب سارے مضامین لکھے جا چکے اور چھپ چکے تو سرور صاحب [1] نے کہا کہ ''اب آپ کا ہو جائے،'' چنانچہ جتنا جس دن لکھ لیا اُتنا کاتب صاحب کے پاس پہنچا دیا گیا، خدا جانے اب تک کتنا لکھ چکا اور کیا کیا لکھتا رہا۔ یہ ضرور ہے کہ اصل مضمون آج سے شروع ہونے والا تھا، لیکن ابھی ابھی اطلاع آئی کہ داستان بہت بڑھ گئی اور اب زیادتی ہو گی۔ چنانچہ یا علی کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور مونڈھا بقیہ آئندہ ہو کر رہ گیا۔

(مطبوعہ۔ سہیل علی گڑھ (انجمن اردوئے معلّٰی) مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، جنوری 1936)

●●●

1 آل احمد سرور۔ سابق صدر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سفر کا ماضی و حال

مجھے سفر کا وہ زمانہ تو یاد نہیں جب لوگ اُڑن کھٹولے پر سفر کرتے تھے اور کپتال کے درخت میں پوریاں پھلتی تھیں۔ اس کا حال تو وہ لوگ بتا سکتے ہیں جن کا ذہن اُڑن کھٹولا ہو یا جن کے دماغ میں تاریخی مواد ہو! میرا ذہن تو بہ سواری پیدل ہی سفر کرتا ہے اور دماغ میں وہی باتیں آتی ہیں جو خود مجھ پر گزر چکی ہیں۔ چنانچہ یہ اُس عہد کا افسانہ ہے جب میں خود ملازم نہیں رکھتا تھا بلکہ میرے لیے ملازم رکھے جاتے تھے اور میں ملازموں پر نہیں بلکہ ملازم مجھ پر حکومت کرتے تھے!

میرا بچپن ایک نہیں بہت سی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں گزرا ہے، اور ظاہر ہے ایسی بستیوں میں کس قسم کی سواریاں اور کس قسم کے سفر کرنے والے نظر آسکتے تھے۔ میں اکثر اپنے ملازم کے کندھے پر سوار ہو کر اور سفر کا یہ وسیلہ بھی نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں ہے، بستی کے باہر جہاں اونٹ گاڑیاں کھڑی ہوتی تھیں جایا کرتا تھا۔ اُس زمانہ کی یاد دُھندلی سی رہ گئی ہے اور مجھے صرف وہ بزرگ یاد رہ گئے ہیں جو نیم کی پتّی اسی شوق اور مرنجاں مرنج طریقے سے کھڑے چبایا کرتے تھے جس شوق اور مرنجاں مرنج طریقے سے لوگ اکثر اپنے ہونٹ اور دوسروں کے پان چبایا کرتے ہیں۔ انھیں بزرگ کے کوئی عزیز قریب کے کسی گاؤں میں نکل گئے تھے تو لوگوں کو بھگوان کا شبہ ہونے لگا تھا اور دوسرے بزرگ کو دوسرے گاؤں والوں نے رمضان شریف کے

دھوکے میں افطار کر ڈالا تھا۔ معلوم نہیں آپ نے میرے ہیرو کو پہچانا یا نہیں۔ نہ پہچانا ہو تو یہ قصور میرے ''حلیم وخوش خصال'' ہیرو کا نہیں ہے آپ کا ہے۔ بہر حال کچھ ہی کیوں نہ ہو مجھے اونٹ کی جو چیز سب سے زیادہ پسند ہے اس کی تفسیر اس کہاوت میں ملتی ہے جہاں کے باب میں کہا گیا ہے اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ یا جب تک کسی کل بیٹھ نہ جائیں لوگوں کی قیاس آرائیوں کی چول نہ بیٹھے!

اس طور پر آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میری طفولیت کی خیال آرائیاں اونٹ یا اونٹ پنے سے کس طرح وابستہ ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اس قسم کی تمہید سے اصل مقصد ہی نہ فوت ہو جائے اس لیے میں براہ راست اونٹ گاڑی پر آجاتا ہوں اونٹ گاڑی کے بارے میں مجھے اپنے ایک مشہور فاضل بزرگ کا قول یاد آتا ہے جنھوں نے اونٹ گاڑی کی تعبیر ان الفاظ میں کی تھی یعنی اونٹ گاڑی وہ سواری ہے جو ہر جگہ سے شام کو روانہ ہوتی ہے اور ہر جگہ صبح کو پہنچ جاتی ہے۔ اونٹ گاڑی عموماً دو منزلہ ہوتی ہے اور غالباً محض اس لیے کہ اونٹ سہ منزلہ نہیں ہوتا، یہ کبھی نئی نہیں دیکھی گئی۔ چوں کہ اونٹ کے چلنے میں کوئی آواز نہیں آتی اس لیے اونٹ گاڑی میں اس کا التزام رکھا جاتا ہے کہ وہ اس کمی کو پوری کرتی رہے۔ جیسے بعض موٹریں اور بائیسکلیں ہوتی ہیں جن میں ہارن یا گھنٹی کی یوں ضرورت نہیں پیش آتی کہ

ہر رگ من ہارن گشت وحاجتِ گھڑیال نیست [1]

بعض اعتبار سے بعض موٹریں اونٹ گاڑی سے مشابہ ہوتی ہیں۔ اونٹ گاڑی ہر شام ایک جگہ سے روانہ ہو جاتی ہے اور ہر صبح ایک دوسرے مقام پر پہنچ جاتی ہے۔ گاڑی بان، سواریاں، اسباب سب سوتے رہتے ہیں، لیکن اونٹ گاڑی صبح کے وقت منزل مقررہ پر پہنچ جاتی ہے۔ بجنسہ یہی حالت میرے ایک بزرگ کے موٹر کی ہے۔ یہ موٹر بہت پرانی ہو چکی ہے کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس کی عمر یا اس کا رنگ کیا ہے۔ لوگوں کو بہت تعجب ہوتا ہے کہ یہ چلی کیوں کر جاتی ہے۔ اب تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ یہ موٹر مشین یا پٹرول کے ذریعہ نہیں بلکہ محض عادت کے زور سے چلتی ہے اور صرف ایک مقررہ مقام سے چل کھڑی ہوتی ہے، اور مقررہ ہی راستہ نشیب وفراز اور رفتار سے

---

1. اصل مصرعہ یوں ہے: ہر رگ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

مقررہ جگہ پر پہنچ جاتی ہے۔ راستہ میں نہ رُکتی ہے نہ روکی جاسکتی ہے۔ جہاں ٹھہرنے کی اس کی عادت ہے اس سے ایک انچ اِدھر اُدھر ٹھہر نہیں سکتی۔ بعض لوگوں کو وہم سا ہونے لگا ہے کہ اگر اس پر کی سواریاں یا اس کا راستہ بدل دیا جائے تو اس گاڑی کی تاریخ اور اس کے متعلق جو توقعات ہیں وہ سب بدل جائیں گے یا کیا ہوگا۔

اونٹ گاڑی کی دوسری منزل پر بالعموم اسباب رکھا جاتا ہے اور نچلی منزل میں مسافر بیٹھتے ہیں اوپر کی منزل میں عموماً سواریاں نہیں ہوتیں۔ اس کا سبب مجھے نہیں معلوم اور معلوم بھی ہوتو اس کا تذکرہ میں ریڈیو پر نہیں کرسکتا معلوم نہیں کون کون اور کس کس قسم کے لوگ گوش برآواز ہوں، اور ہاں یہ آپ اچھی طرح سے سن رکھیے کہ میں نے صرف گوش برآواز کا فقرہ استعمال کیا ہے۔ ممکن ہے فضائی خلفشار یا بدنیتی سے لوگ اسے کچھ کا کچھ سن لیں اور ہاں اس آواز کو اُس آواز[1] سے کوئی تعلق نہیں جو آل انڈیا ریڈیو سے برآمد ہوتی یا ہوتا ہے!

اونٹ گاڑی پر سوار ہوجانے کے بعد مسافر عموماً سونے لگتے ہیں۔ اُن سے پہلے اونٹ گاڑی والا سوتا ہوتا ہے۔ اونٹ صرف ناک کی سیدھ جاتا ہے۔ ایک دفعہ کسی ستم ظریف نے جب سفر تقریباً نصف ختم ہوچکا تھا اور ہر شخص سو رہا تھا اونٹ گاڑی کا رُخ بدل دیا چنانچہ صبح لوگوں کی آنکھ کھلی تو تمام سفر کرنے کے بعد اپنے آپ کو صبح اُسی مقام پر پایا جہاں سے وہ روانہ ہوئے تھے۔ اس سے آپ کو اونٹ اور اونٹ گاڑی دونوں کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کا موقع مل گیا ہوگا۔ اگر آپ نے صحیح رائے قائم نہیں کی تو پھر آپ کو یقیناً اونٹ گاڑی پر سفر کرنا چاہیے!

اونٹ گاڑی کے ساتھ ساتھ بیل گاڑی کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو چیز مہابھارت کے زمانہ میں رتھ کے درجہ پر تھی وہی چیز جنگِ عظیم تک پہنچتے پہنچتے بیل گاڑی یا بہلی بن گئی یا یوں سمجھ لیجیے کہ رتھ کا جاپانی ایڈیشن بہلی ہی ہے اور بہلی کا گاؤں سدھار ایڈیشن ٹھیلا جس پر دہلی میں اسٹرائک ہوتا ہے۔

بہلی میں ذرا تکلیفات کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ دالان اور دردالان قسم کے شوالے سے بنے ہوتے ہیں اور بیل بھی بالکل انندی بیل سے نظر آتے ہیں۔ گھنگھرو گھنٹیوں اور سُرخ سُرخ پوشتوں کو

[1] آل انڈیا ریڈیو کا رسالہ جو مہینہ میں دوبار دہلی سے شائع ہوتا تھا۔

دیکھ کر میرا ذہن قدیم ہندوستان اور فالودہ کی ہانڈیوں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ قدیم ہندوستان کی طرف یوں کہ اصلی ہندوستان قدیم ہی ہندوستان ہے اور فالودہ کی طرف یوں کہ ان دنوں اللہ تعالیٰ کو گرمی پسند ہے اور اس خاکسار کو فالودہ ناپسند نہیں ہے اس کے علاوہ جہاں سے بیٹھا ہوا میں اس وقت باتیں بنا رہا ہوں اور فالودہ کا ماتم کر رہا ہوں وہاں کا پنکھا بھی بند رکھا گیا ہے تا کہ پنکھے کے چلنے کی آواز بھی میری ہم نوا یا دم ساز بن نہ سکے۔ چنانچہ میں بار بار دل ہی دل میں اقبال کا ایک شعر مسخ کرتا جاتا ہوں اور فالودہ کو یاد کرتا ہوں۔

یہ دستور ہوا بندی ہے کیسا ترے کمرے میں
یہاں تو بات کرتے خشک ہوتی ہے زباں میری [1]

اور ڈرتا بھی ہوں کہ کہیں شاعر خود نہ سن رہا ہو۔

اب یکے اور تانگے کا نمبر آتا ہے۔ میرے دیار میں یکے ایسے ہوتے ہیں جیسے کمہار کا چاک جس میں اُلٹے سیدھے دو پہیے لگا دیے گئے ہوں۔ اسے ایک قسم کی جوائے وہیل (Joy Wheel) کہنا چاہیے جس پر لوگ تفریحاً بیٹھتے ہیں اور جب اس کو چرخ دیا جاتا ہے تو لوگ تفریحاً ہی ایک دوسرے پر گرتے ہیں اور تفریحاً ہی پٹخنیاں کھاتے ہیں۔ اس یکے کو سپاٹ رکھنے میں مصلحت یہ رکھی گئی تھی کہ جتنی سواریاں چاہیں بٹھالیں، لیکن سواریوں نے یہ کرنا شروع کیا کہ جتنوں نے چاہا راستہ میں گر گئے۔ مجبوراً اب یہ کرتے ہیں کہ جب سات آٹھ نفر بیٹھ لیتے ہیں تو کسی ایک کی پگڑی اُتار کر سب کو ایک حلقہ میں باندھ دیتے ہیں اور سفر شروع کر دیتے ہیں۔ رسّی اور پگڑی نہیں ملتی تو پھر مجبوراً ایک دوسرے کا کان پکڑ لیتے ہیں اور جھولتے جھومتے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں اس قسم کا سفر ایک دفعہ کرنے کے بعد اکثر لوگ سفر کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرنے لگتے ہیں۔

تانگے مجھے پسند نہیں۔ اگر میں تانگے پر سفر کر رہا ہوں، اور کوئی سواری پیچھے سے آتی ہوئی نظر آئے تو مجھے وہم سا ہونے لگتا ہے کہ یہ مجھے روندتی ہوئی تانگے کے اندر سے نکل جائے گی۔

---

1. اصل شعر یہ ہے:

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری — اقبال

ہندوستان میں لوگ گدھوں پر سفر نہیں کرتے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ گدھے سفر نہیں کرتے، لیکن یہاں اس کمی کی تلافی ایک قسم کے گھوڑوں سے کر لی گئی ہے جن سے مجھے ایک دفعہ کالکا سے کسولی جاتے سابقہ پڑا تھا۔ آپ یقین فرمایئے مجھے کسولی جانے کے بجائے کہیں اور جانے کا اتفاق یا ضرورت پیش آتی تو میں ان گھوڑوں یا معزز گدھوں پر کبھی نہ بیٹھتا۔ ان گھوڑوں کا خاصہ یہ ہے کہ کالکا میں ان پر بیٹھ جایئے اور کسولی میں اُتر جایئے کسی ساتھی یا رہبر کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ شہ سوار ہوں یا سواری سے بالکل واقف نہ ہوں یہ ناممکن ہے کہ آپ کسولی وقت سے پہلے یا بعد پہنچ سکیں۔ سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ نہ تو یہ گھوڑے ناہموار اور تنگ راستہ پر کہیں گرتے ہیں اور نہ باوجود آپ کی کوشش کے آپ کو گرنے دیتے ہیں۔ میں نے تو اُکتا کر یہ ترکیب نکالی تھی کہ گھوڑے سے اُتر کر گھوڑے کی دُم پکڑ لی اور اس کے سہارے کسولی جا پہنچا۔ گھوڑے کو مطلق نہیں محسوس ہوتا کہ اس کا مصرف کیا قرار دیا گیا ہے۔ البتہ میں اس کی ذمہ داری نہیں لیتا کہ باوجود اس کے کہ پہاڑ کی ہوا نہایت لطیف ہوتی ہے آپ بھی کسی وقت یہ نہ محسوس کرلیں کہ آپ گھوڑے کی دُم کے سہارے چل رہے ہیں۔

پہاڑوں اور بعض دیگر مقامات پر لوگ ڈانڈی اور رکشا پر سفر کرتے ہیں۔ ڈانڈی اور رکشا پر سفر کرنے والوں کو دیکھ کر مجھے کافی غصہ آتا ہے اور غصہ فرو ہونے پر میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ ڈانڈی اور رکشا پر صرف جدید الخیال عورتوں اور مایوس العلاج مریضوں کو بٹھانا چاہیے۔ ان کے علاوہ کوئی اور بیٹھا ملے تو اسے کسی ترکیب سے سفرِ آخرت پر روانہ کردینا چاہیے۔ یہ میری رائے ہے اور رائے کا حال یہ ہے کہ اس ترقی پذیر اور ترقی یافتہ زمانہ میں رائے دینے کی اتنی ہی آزادی ہے جتنی کہ اس پر عمل کرنے کی ممانعت ہے اس لیے میری رائے پر عمل کرنے سے پیش تر آپ کو یہ اچھی طرح معلوم ہو جانا چاہیے کہ کسی کو سفرِ آخرت پر بھیجنے سے اکثر خود آخرت کا سفر ادا کرنا پڑتا ہے اس لیے یہ بہتر ہوگا کہ اس قسم کی حرکت کرنے سے پہلے آپ کسی وکیل اور ڈاکٹر سے بھی مشورہ کرلیں کیوں کہ بغیر ان دونوں کی اعانت کے نہ آپ دوسروں کو بے وقوف بنا سکتے ہیں اور نہ خود پاگل خانہ جا سکتے ہیں۔

پہلے زمانہ میں انھیں سواریوں پر اور انھیں طریقوں سے سفر ہوتا تھا۔ یہ حال تو خشکی میں سفر کرنے والوں کا تھا۔ تری کا سفر کشتیوں میں طے کیا جاتا تھا ایسی کشتیاں جو ہوا کے رُخ پر چلتی

تھیں۔ اگر معمولی لوگ سوار ہوتے تھے تو یہ موجوں سے ہم آغوش ہو جاتی تھیں اور عشاق و شعرا موجود ہوتے تو ساحل سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتیں۔

ان سواریوں کے علاوہ لوگ پا پیادہ بھی سفر کرتے تھے۔ راستہ میں ڈاکو ملتے تھے لوٹ مار ہوتی تھی جا بجا پڑاؤ بنے تھے جہاں لوگ شب باش ہوتے اور صبح منہ اندھیرے بوریا بستر باندھ دوسری منزل کے لیے روانہ ہو جاتے۔ اس سفر میں جہاں دشمنیں اور خطرات تھے وہاں یک جہتی اور ہم آہنگی بھی ہوتی۔ لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے، اُن سے ہمدردی کرتے اور دُکھ درد کے شریک ہوتے۔

اب اونٹ گاڑی، بیل گاڑی، گھوڑا گاڑی اور آدمی گاڑی کے بجائے ریل گاڑی، ہوا گاڑی، جہاز اور طیارے یعنی ہوائی جہاز ہیں۔ پہلے سب سے تیز سواری ہوا سمجھی جاتی تھی اور جلد بازوں سے سابقہ پڑتا تو لوگ کہتے دم تو لو تم تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔ اس زمانہ میں اس سواری پر شعرا پھول کی مہک یا محبوب کی ناف مشکیں کی خوشبو سوار کرایا کرتے تھے۔ اب یہ حال ہے کہ لوگ بجلی پر آواز کو سوار کر کے ادھر سے اُدھر بھیجتے رہتے ہیں۔ ریڈیو اسی کھیل کا دوسرا نام ہے۔

پہلے زمانہ میں جو سفر ہفتوں، مہینوں اور برسوں میں طے ہوتا تھا یا بالکل طے نہیں ہوتا تھا اب گھنٹوں اور دنوں میں طے ہونے لگا ہے۔ پہلے صرف لوگوں کی آہیں آسمان کی طرف جاتی تھیں۔ اب لوگ خود جانے لگے ہیں۔ پہلے آہوں کو خود سفر کرنا پڑتا تھا اب انھیں ریڈیو کے ذریعے دور دور تک پہنچا سکتے ہیں۔ پہلے ممکن ہے کہ ان کا اثر ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو اب چاہیں تو محبوب تو در کنار محبوب کے اعزا اقارب اور ہم وطن سب کو ان آہوں کے ذریعہ جلا کر خاک سیاہ کر ڈالیں۔ پہلے زمانہ میں لوگ امام ضامن باندھ کر سفر کیا کرتے تھے اب بیمہ کرا کے سفر کرتے ہیں۔ پہلے چور ڈاکو کا خطرہ تھا اب گاڑی لڑنے کا خطرہ ہے۔ پہلے بیماریاں کم سفر کرتی تھیں اب ان سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ پہلے لوگ سفر کے بارے میں کہتے تھے پا بہ رکاب ہوں اب ٹکٹ بدست کہتے ہیں پہلے لوگ آم کھانے لکھنؤ اور رام پور جاتے تھے اب لکھنؤ اور رام پور کے آم اپنے کھائے جانے کے لیے یورپ اور امریکہ کا سفر کرتے ہیں۔

پہلے زمانہ میں لوگ سفر کرتے تو بیوی بچوں سے اس طور پر رخصت ہوتے جیسے اب اللہ ہی ہے جو پھر ملنا ہو۔ اب دوسروں کی بیوی اور ضمناً بچوں سے ملنے اس طور پر سفر کیا کرتے ہیں جیسے دنیا سے شوہر اور اللہ دونوں اُٹھ گئے ہیں۔

پہلے لوگ طلبِ علم کے سلسلہ میں تپتے ہوئے ریگ زاروں کو گرتے پڑتے طے کرتے پتّیاں چباتے، بھوکے پیاسے بے یار و مددگار سرچشمۂ علم تک پہنچتے۔ اب طلبِ علم کے بہانے سے ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں جن کو نہ سفر سے کوئی تعلق ہے اور نہ علم سے سروکار۔ پہلے علم کی خاطر سفر کرتے تھے اب سفر کی خاطر علم گنواتے ہیں۔

پہلے لوگ دہلی سیکھنے اور سمجھنے کے لیے آتے تھے اب گانے اور بولنے کے لیے آتے ہیں۔ عربی کی ایک مثل ہے۔ مرنے سے پہلے مر جاؤ۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ اس مقولہ یا نصیحت پر عمل نہ کر سکیں ان کو اس مقولہ پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

خاموش کیے جانے سے پہلے خاموش ہو جاؤ۔

وہ عربی کی مثل تھی یہ ریڈیو کا اصول ہے، اور میں اصولاً ریڈیو ہی کے اصول پر کاربند ہوتا ہوں۔

(مطبوعہ۔ علی گڑھ میگزین، علی گڑھ، (تعطیلات نمبر) 1937)

●●●

شاعری میں خرافات

'خلاصۂ کلام یعنی آج کا مصرعۂ طرح یہ ہے کہ ہماری شاعری' اور ہماری سوسائٹی میں بہت سارے مہملات اور خرافات راہ پا گئے ہیں۔ جن کے سبب سے ہمارے شاعروں، لکھنے والوں اور فن کاروں سے تخلیقی استعداد مفقود ہوگئی ہے اور ہمارے ادب اور زندگی کا تار و پود اور بوجھل ہوگیا ہے۔ اس کو چاہیے تو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہماری شاعری میں خرافات یا ہماری خرافات میں شاعری راہ پا گئی ہے۔ کیوں اور کیسے؟ اس کی تفصیل سُنیے۔

اوّل تو یہ کہ ہمارے ہاں زندگی میں تنوّعات کم ہیں۔ ایک زمانہ سے ہماری زندگی یک سو و یکساں چلی آتی ہے۔ نہ تو نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور نہ نئے مطالبات سے سابقہ، آگے بڑھنے اور بڑھتے رہنے کی نہ ضرورت ہے اور نہ اُس کا ولولہ، مقابلہ اور مسابقت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ہمارے ہی ایک شاعر نے اس صورت حال کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے

عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

برخلاف اس کے دوسرے بالخصوص مغربی ممالک کی زندگی میں جلد جلد تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں وہاں کے لوگ ہر وقت چوکنّے اور مستعد رہتے ہیں۔ وہاں زندگی کے ہر شعبے میں مقابلہ اور مسابقت کی گرم بازاری ہے وہ لوگ ذرا غفلت سے کام لیں تو بہت دور پیچھے جا پڑیں، اور کوئی پُرسانِ حال

نہ ہو۔ وہاں کا حال اسٹاک اِکس چینج کا ہے۔ ہر لحہ نرخ بدلتا رہتا ہے۔ جس کے ماتحت اشیاوزرمبادلہ کی قدر و قیمت میں نیچ اُونچ ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ مغربی ممالک کے لوگ تمام دنیا کے لحہ بہ لحہ بدلنے والے حالات پر نظر رکھتے ہیں اور اُسی اعتبار سے اپنی جدّ وجہد کو موڑتے مہمیز کرتے رہتے ہیں۔

یہی باتیں وہاں کے شعروادب میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اُن میں ہر ہر لحہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ وہاں کے شاعر اور آرٹسٹ ہمیشہ خوب سے خوب تر چیزیں اور باتیں پیش کرتے رہنے کے درپے رہتے ہیں، ہمارے یہاں یہ باتیں نہیں ہیں۔ یہاں اُس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوتی جب تک کوئی بڑا ہی اہم یا انقلاب انگیز واقعہ پیش نہ آئے ورنہ بالعموم زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ ہم تفریحاً یا انتقاماً یورپ کی کسی تحریک کی تقلید کرنے لگتے ہیں، لیکن چوں کہ وہ اپنے دل یا اپنے گردوپیش کے حالات وحوادث کی پیدا کی ہوئی نہیں ہوتی، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ جلد بے کار و بے جان ہو جاتی ہے، اور مجموعی حیثیت سے ہم جہاں کے تہاں رہ جاتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ مشرق، مذہب اور اخلاق کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ اُس کے نزدیک یہ دونوں کبھی نہ بدلنے والی حقیقتیں ہیں۔ وہ اخلاق کا سرچشمہ مذہب کو قرار دیتا ہے، اور مذہب کا مصدر خدا کا وجود و وجوب۔ یہاں کی زندگی میں ان دونوں کو بہت دخل ہے، لیکن مشکل ہے کہ ذہن اور زندگی کو وہ ان عقائد سے اس درجہ وابستہ کر دیتا ہے کہ دنیا کی دوسری باتوں کی طرف بہت کم توجہ دے پاتا ہے۔ چنانچہ وہ زندگی کے اُن معاملات کو بھی انھیں دونوں سے وابستہ کر دیتا ہے جن کا تعلق براہِ راست عقائد سے اُتنا نہیں ہوتا جتنا معاملات سے۔ معتقدات کو معاملات سے ہر وقت ٹکراتے رہنا اکثر مفید نہیں ہوتا، معاملات کی رُو براہی اور کامیابی کا مدار بہت کچھ دیانت داری، ولولہ اور جدّ وجہد سے ہے۔ جن کی ہم میں بہت کمی ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ہماری اس کمی کا تعلق براہِ راست اخلاق و مذہب سے ہے۔ البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ وجوہ کچھ بھی ہوں ہماری شاعری و سوسائٹی میں نہ تو احساسِ مذہب و اخلاق کی گراں مائیگی باقی رہی ہے اور نہ معاملات سے عہدہ برآ ہونے کا عزم و استعداد۔ ہم نے ''شعر و شاعری'' کے لوازم اور مطالبات کو بھی الہامی سمجھ لیا ہے۔ یعنی اس کے سانچے، اس کی

پرداخت، اس کا مواد اور اس کی غایت سب من جانب اللہ ہیں جس میں ترمیم یا اصلاح کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش!

چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ ابتدا ہی سے ہماری شعر و شاعری جس نہج کی رہی ہے اُس سے ہم نے بہت کم تجاوز کیا ہے۔ یہاں تک کہ ہم شاعری میں اُنھیں مضامین، انھیں اسالیب حتیٰ کہ اُنھیں ردیف قافیوں سے کام لیتے ہیں جو اگلے وقتوں سے چلے آرہے ہیں۔ ظاہر ہے جب کینوس اتنی محدود ہوگئی تو تصاویر میں وسعت یا تنوع کیوں کر پیدا ہوگا۔

حال ہی میں ایک مشاعرہ میں شریک ہونے کا حادثہ پیش آیا، جس میں تقریباً نصف صدی پہلے کے غزل گو شعرا بھی موجود تھے، اور وہ شعرا بھی جو غزل گوئی کے دورِ جدید کی پیداوار سمجھے جاتے ہیں۔ ان بزرگوں نے ایسے ایسے شاہ کار پیش کیے جن کا خیال کرکے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں غزل کا بڑا دل دادہ ہوں یہی سبب ہے کہ گھٹیا غزل اور غزل گویوں سے مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ محدود اور لغوی معنوں میں غزل کو آپ جو چاہیے سمجھ لیجیے، اور اس معیار سے مجھ کو یا جس کسی کو دل چاہے بُرا بھلا کہہ لیجیے، لیکن میں تو اس توازن، ترصیع و ترفع کو غزل یا تغزل سمجھتا ہوں جو کسی زبان کے قوام کا حامل اس کے بولنے والوں کے مزاج کا ترجمان اور انسانی جذبات کے رفعت و نزاکت کا آئینہ دار ہو۔

تغزل کچھ اردو شاعری ہی کی پیداوار یا میراث نہیں ہے۔ یہ الفاظ و اسالیب کے صحیح انتخاب و امتزاج اور جذبات کی صداقت کا نام ہے۔ یہ شاعر کی فن کاری کا معیار اور شاعری کی معراج ہے میں تو ہر صنفِ شاعری کو اسی میزان میں تولنے کا عادی ہوں۔ شاعر کا فرض ہے کہ وہ نئی دنیائیں تعمیر کرے اور اُس کی میر کرائے۔ ہر اچھا فقرہ، جملہ یا شعر دراصل ایک نئے اور دل آویز تصوّر کا مرقع ہوتا ہے جو سننے والے کو اُس کی فرسودہ دنیا سے نجات دلاکر نئی نادر اور تروتازہ فضاؤں سے آشنا کراتا ہے۔ یہ بات نہ ہو تو شاعر اور کباڑیے میں فرق کیا رہ جائے۔

لیکن جس مشاعرہ کا میں تذکرہ کر رہا ہوں اس کے شاعروں نے تھوڑی دیر کے لیے بھی یہ خیال اپنے دل میں نہیں آنے دیا تھا کہ اُن کے اشعار معقول لوگوں کے دلوں پر کیا اثر پیدا کریں گے۔ اُن شاعروں کے ذہن و دماغ معطّل و ماؤف ہو چکے تھے وہ مشق و مزاولت سے

اس درجہ مسخ اور بند ھے ٹکے الفاظ یا فقروں کے اس درجہ عادی ہو چکے تھے کہ تازگی، تنوع، طرفگی توازن یا معرفت و بصیرت کا احساس تک نہیں کر سکتے تھے۔ اس قسم کی پیداوار کو میں خرافات کہتا ہوں۔ الفاظ یا فقروں سے بچوں یا بازی گروں کی طرح کھیلنا مبتذل اور رکیک اضال وحرکات کے لیے اچھے اور اُونچے جذبات کو بہانہ بنانا بندھی ٹکی تشبیہ استعاروں کے ذریعہ اپنی ذہنی بے مائیگی کو چھپانا، نہ اپنی عمر وصحت کا رکھ رکھاؤ نہ دوسروں کی عفت وعافیت کا لحاظ، اُگلے ہوئے نہیں بلکہ مدتوں سے سڑے گلے لقموں کو بار بار اور مزے لے لے کر چبانا اور دوسروں کو شریک ہونے کی دعوت دینا، اُستادی کے اظہار میں یہ بھول جانا کہ حاضرین وسامعین میں یکہ بانوں، دوا بیچنے والوں اور آبرو باختہ نوجوانوں کے علاوہ پڑھے لکھے شرفا بھی موجود ہوں گے۔ مشکل ترکیبوں، بلند آہن فقروں یا زبان و بیان کے چٹخاروں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ لوگ اُنھیں غالب اور اقبال سے بھی اونچا سمجھنے لگیں بے توفی اور کور باطنی نہیں تو اور کیا ہے؟

بعض چوٹی کے شعرا سے قطع نظر دوسرے تمام اردو شعرا ایک ہی دَل دَل یا کیچڑ میں پھنسے یا لتھڑے نظر آئیں گے۔ زبان و بیان، ہجر ووصال، گور وکفن، کمر ودہن، ناتوانی وزبوں حالی، سب وشتم، رشک ورقابت، فسق وبُزدلی —— ایسا معلوم ہوگا جیسے ہر شاعر یا تو طبیب سے اپنے ناگفتہ بہ حالات بیان کر رہا ہے، پولیس میں رپٹ لکھا رہا ہے، یا کسی خانقاہ یا ے کدہ میں سرسام میں مبتلا ہے، یا پھر ان سب کے مجموعہ یعنی کسی مشاعرہ میں شعر پڑھ رہا ہے۔

ہماری بیش تر شاعری، تقلیدی شاعری ہے جس میں تعیّش، تفرّع یا تصوّف کے سوا بہت کم کسی اور چیز کو دخل پانے دیا گیا ہے۔ اُردو شاعری کے خمیر میں ایرانی اور ہندی عناصر کی بڑی آمیزش ہے، اور یہی دو ممالک ایسے ہیں جہاں یہ تینوں باتیں خصوصیت کے ساتھ عام اور مقبول ہیں۔ جہاں تک شاعری کی ایک خاص قسم یا ہمارے ایک خاص ذوق کا تعلق ہے ان عناصر سہ گانہ کا امتزاج یا اجتماع گوارا کیا جا سکتا ہے، لیکن شاعری کی قلم رُو اور بھلے مانسوں کی دُنیا ان سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ ہماری شاعری ایک مختصر تنگنائے میں محدود ہو گئی ہے اور ہمارے شعرا کو اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ ایک ہی خیال کو طرح طرح سے دُہرائیں اور طرح طرح کی باتوں کو ایک ہی خیال میں سموئیں، اسی طرح کی مجبوری یا ہٹ دھری خرافات کی جڑ ہوتی ہے۔

اردو شاعری کی خرافات کا احساس سب سے پہلے حالی نے کیا۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے شاعری کو بازی گروں، بے فکروں، بُزدلوں یا بیماروں کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ شرفا و صلحا کے نقطۂ نظر سے دیکھا۔ انھوں نے شاعری کو مقصدی رنگ دیا، اور شاعری کو اصطلاحات کے شکنجوں سے نکال کر اصلاحات کی زندگی بخش فضاؤں سے روشناس کرایا۔ اُن کے اخلاص و اجتہاد نے اردو شاعروں کی آبرو رکھ لی۔ اس سلسلہ میں ممکن ہے نظیر اکبرآبادی کا بھی نام لیا جائے لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ نظیر و حالی کا ایک دوسرے سے موازنہ کرنا درست نہیں۔ نظیر زیادہ تر اپنے گرد و پیش کی زندگی نہیں بلکہ حالات و حوادث کی عکاسی کرتے تھے۔ وہ زیادہ سے زیادہ فوٹوگرافر تھے پینٹر نہ تھے۔ اُن کی اکثر نظمیں ایسی ہیں جن میں وہ خود منعکس ہو گئے ہیں، لیکن اس طور پر کہ اُن کی شخصیت اُن کی شاعری کو اور اُن کی شاعری اُن کی شخصیت کو رُسوا کرتی نظر آتی ہے۔ حالی ایک طرف ماحول کو نظر انداز نہیں کرتے تھے، دوسری طرف اُس کا صحیح مقام متعین کرتے تھے۔ یعنی حال کو ماضی اور مستقبل کے کن سررشتوں سے کس طرح وابستہ رکھنا چاہیے۔ ان کی شاعری کا Perspective صحیح اور حسب حال تھا۔

ان دونوں کی پیروی کرنے والے آج بھی ہم میں موجود ہیں صرف نوعیتیں کسی حد تک بدل گئی ہیں۔ حالی معنوی اعتبار سے اقبال میں نمایاں ہیں بہت سے اور شعرا بھی جو جدید اردو شاعری کے علم بردار ہیں، حالی سے متاثر ہیں، نظیر کے پیرو وہ لوگ ہیں جو بے باکی اور عریانی کو ترقی و انقلاب کا مرادف قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ قدیم اردو شاعری میں جہاں ہجر و وصال، دہن و کمر، اور اسی قسم کے بے شمار خرافات اور اُن کے سانچے رہ پا چکے ہیں، وہاں جدید شاعری میں بھی بہت سی مُزخرافات داخل ہو گئی ہیں۔ اردو شاعری کو ابتدا ہی سے ہم نے جس طور پر اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہم ذہنی تجربات اور عینی مشاہدات کو ترک کر کے بندھی ٹکی باتوں کو بنے بنائے سانچوں میں ڈھالنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ نسبتاً اب ہم جذبات یا میلانات کو اتنی اہمیت نہیں دیتے جتنا کہ بندھے ٹکے فقروں کو۔ شاعری ہمارے لیے ایک ''میکانیکی'' طریقۂ کار ہو گیا ہے جس میں تجربات یا محسوساتِ ذہنی کو کوئی دخل نہیں ہے۔ ہماری جدید شاعری بھی اس نقص سے

خالی نہیں ہے۔ یہاں بھی سانچوں اور ٹھپّوں ہی کا دور دورہ ہے انقلاب، مزدور، سرمایہ، بھوک اپنی اپنی جگہ پر مسلّم، لیکن شاعری میں ان کو اس لیے دخل نہیں ملا ہے کہ ہماری زندگی یا تمدن کے یہ مطالبات ہیں۔ بلکہ ان کے سانچے بن گئے ہیں۔ ہم کو سوچنے کی ضرورت نہیں صرف ڈھالنے کا موقع ملنا چاہیے، اور نہ ملے تو نکالنا چاہیے!

حقیقتاً جدید شاعری کے بیش تر علم برداروں کے محرکات بھی وہی ہیں جو قدیم دبستان کے پیروؤں کے تھے۔ قدیم دبستان کا میلان جنسی تھا یا مذہبی واماندگی کا جس کا اظہار اُس کے پیرو میکانکی طریقۂ شاعری سے کرتے تھے، نئے دبستان کا بھی میلان جنسی ہی ہے۔ البتہ مذہبی واماندگی کی جگہ ''آشفتہ سری'' نے لے لی ہے۔ اوّل الذکر اگر ایک محدود دائرہ میں گردش کرتے تھے تو موخر الذکر کے یہاں نہ دائرہ ہے نہ حدود صرف گردش ہے۔ زندگی کو سدھارنے سنوارنے کی اُن میں استعداد نہ تھی۔ ان کو فکر نہیں ہے۔ ایک سزا و جزا کا قائل تھا دوسرا صرف قیامت کا متمنی ہے۔

قدیم اور جدید اردو شاعری دونوں میرے نزدیک سخن تکیوں کی شاعری ہے۔ اگر ایک طرف شمع و پروانہ، جوئے شیر، صحرا، فلک، روزِ ازل، شامِ ابد، کوہِ طور، غنچہ دہن، موئے کمر، چشم آہو، پنجۂ حنائی، رشک و حسد، غرض اس طرح کے ہزاروں ''سخن تکیے'' ہیں تو دوسری طرف مزدور، بھوک، انقلاب، سرمایہ، آہن، کفن، آتش فشاں، روٹی، روپیہ، جھونپڑا، سولی، زنجیر قسم کے ٹھپّے یا پیمانے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ کسی اسکول کا پیرو ہو ان سخن تکیوں یا ٹھپّوں سے نجات پا نہیں سکتا، وہ ہر پھر کر انھیں میں اسیر ملے گا، الفاظ، ترکیبوں اور تلمیحات کی یہی سانچہ کاری یا ٹھپّہ بازی اردو کی شاعری میں خرافات بن گئی ہے۔

اس کے علاوہ اگر قدیم اسکول میں مجرّدات محض سے بحث تھی تو جدید اسکول میں مجاز محض کو نمایاں کیا۔ وہاں اعتقاد بالغیب کی کارفرمائی تھی، تو یہاں انقلاب موعود پر زور دیا جاتا ہے باتیں ایک ہی ہیں۔ نیتوں کا حال اللہ کو معلوم ہے۔ نتیجہ البتہ ظاہر ہے، یعنی ہم آپ کہیں کے نہیں رہے!!

اردو شاعری کے خرافات کا اندازہ آپ اُس وقت لگا سکیں گے جب اُس کے ساتھ ساتھ آپ غیر ممالک بالخصوص مغرب کی شاعری کا مطالعہ کریں، یہاں آپ شعر سننے سے پہلے

بتادیں گے کہ تان کہاں ٹوٹنے والی ہے مثلاً جہاں کہیں محمود کا نام آجائے آپ سمجھ جائیں گے کہ ایاز اور سومنات بھی آس پاس ہی کھڑے ہوں گے، شراب کے ساتھ مے کدہ، محتسب، چشم ساقی، توبہ، بہار، چاندنی، خمار، خمیازہ، روزِ اوّل، جلوۂ خُم، مینا، شیشہ قطرہ کے ہم زاد دریا، موتی، آنسو، خونِ منصور، جزو کل۔ ذرّہ کے جلو میں صحرا، بگولا، خاکِ مزار، دامن، آئینہ، آستاں کے ہم عناں دانہ، صیاد، قفس، برق، ہم صفیر، تنکے، مرض کے ساتھ کمزوری، قوم، بالیں، طبیب، مسیحا، نکیرین، بالآخر موت اور موت کے بعد کے مراحل و مسائل!! غرض کہ اسی طرح کے بے شمار قضیے جھگڑوں سے آپ کا سابقہ ہوگا، یہ باتیں ہمارے ذہن و دماغ میں اس طور پر اور اس درجہ رچ گئی ہیں کہ کسی نئے خیال یا نئے اسلوب کی طرف ہمارا ذہن منتقل ہی نہیں ہوتا۔

دوسرے ممالک بالخصوص مغرب کی شاعری میں سانچوں اور سخن تکیوں کی آپ کو گرم بازاری نہ ملے گی۔ ان کے کلام کے بارے میں بالعموم آپ یہ نہ کہہ سکیں گے کہ آپ کو معلوم تھا کہ خاتمۂ کلام کہاں اور کس پر اور کیوں کر ہوگا۔ تعجب ہے جہاں زندگی میں مشین اس درجہ سرایت کر چکی ہو وہاں رگوں کے ذہن و دماغ مشین مآبی سے اس درجہ محفوظ اور مصئون ہوں۔

سوچنے میں الفاظ اور فقروں کی ضرورت ہوتی ہے، اوّل تو میں یوں بھی اس کا کچھ یوں ہی سا قائل ہوں کہ ہم آپ کچھ سوچتے بھی ہیں یا اس کی اہلیت بھی رکھتے ہیں، بہ فرضِ محال ایسا ہو بھی تو ہم اپنے فکر کی لفظی تشکیل و تعبیر انھیں سخن تکیوں سے کریں گے جن کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں اور محض اس لیے کہ ایسا کرنے میں دماغ کو نئے الفاظ یا نئے اسالیب پانے بنانے کے فشار میں مبتلا نہیں ہونا پڑتا۔ یہ حاضر جواب فقرے موجود ہوتے ہیں اور آپ انھیں پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ ہمارے آپ کے نہایت مہمل اور بے دم خیالات کو ان ہمہ وقت حاضر مصاحبین یا مریدین نے ''ی پرانند'' کے سلسلہ میں بلند و برتر بنا دیا، لیکن ہم نے یہ سمجھا کہ یہ باتیں ہم خاص طور پر اپنی پیدائش کے ساتھ لائے تھے۔ بالفاظِ دیگر، ہم تلامیذ الرحمٰن میں سے ہیں۔ یہاں ذرا ظفرۂ کلام ہوتا ہے معاف فرمایئے گا، میں یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ آخر شعرا تلامیذ الرحمٰن ہی کیوں کہلاتے ہیں۔ خدا کے اسمائے صفات رحمٰن کے علاوہ اور بھی ہیں۔ آخر کوئی شاعر تو ایسا ہونا چاہیے جس کا سابقہ خدائے جبار و قہار سے بھی رہا ہو یا ہونے والا ہو۔

الفاظ کے اسرار و معارف نہ پوچھیے۔ دنیا کے کیسے کیسے کھیل ان کے گرد کھیلے جاتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں، جیل خانہ میں، عدالت میں، خانقاہ میں، بازار میں، پلیٹ فارم پر، ایوانِ حکومت میں، شبستانِ عشرت میں، ریڈیو پر، اخبارات میں، ہمارے آپ کے دل و زبان پر انھیں الفاظ کی کیسی کیسی فانوسیں گردش کرتی رہتی ہیں، لیکن اردو شعر و شاعری میں اُن کی حیثیت سب سے نرالی اور سب سے زیادہ قابلِ رحم ہے۔

یہ سب باتیں تو ہوئیں، لیکن آپ نے کبھی یہ بھی سوچا کہ دنیا کا کون سا ادارہ، فن، شخص، یا حقیقت ایسی ہے جو خرافات سے خالی ہے۔ خرافات کی تھوڑی بہت آمیزش کے بغیر دنیا کا کوئی کام نہیں چل سکتا۔ خرافات نہ ہوں تو اچھی اور سچی باتیں لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں نہ خواص و عوام تک پہنچ سکیں اور نہ عوام و خواص تک۔ دنیا کے گزشتہ و موجودہ حالات و حوادث پر نظر ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اصلیت اور معقولیت کے ساتھ ساتھ کتنے سارے خرافات بھی ''چالو'' ہیں پھر لطف یہ ہے کہ بغیر ان خرافات کے ہم کو اصلیت اور معقولیت سے نہ دلچسپی ہوتی ہے اور نہ بیزاری۔ یہ دنیا بجائے خود ایک مستقل نہیں تو منظم خرافات ضرور ہے۔ البتہ اس کی تہہ میں، گوناگوں حجابات کے پیچھے، پستیوں سے اُوپر، ماورائے عقل و ادراک ایک چیز ہے جس کے ہم آپ جویا ہیں، لیکن کون بتائے کہ وہ کیا ہے!!

(مطبوعہ کانفرنس۔ گزٹ، علی گڑھ، 16راکتوبر 1940)

●●●

بات میں بات

رمضان شریف کا زمانہ، برسات کا موسم، توبہ کرنے کا موقع اور توبہ نہ کرنے کا عذر!
بے اختیار جی چاہتا ہے کہ شعر پڑھوں اور جان دے دوں، لیکن سوچتا ہوں تو نہ کوئی معقول شعر یاد آتا ہے اور نہ کوئی معقول وجہ جان دینے کی نظر آتی ہے۔ ذرا اور دل لگا کر غور کرتا ہوں تو یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ جان لینے کی تو معقول وجہ ہو سکتی ہے جان دینے میں کیا رکھا ہے۔ پھر جان لینے میں یہ دقت نظر آتی ہے کہ اس پر ریڈیو والے آمادہ نہ ہوں گے، کیوں کہ یہ جملہ حقوق محفوظ رکھتے ہیں خواہ جان دینے کا حق ہو، خواہ جان لینے کا، خواہ میری جان ہو خواہ ان کی، خواہ کالے چور کی۔ گو میں سمجھتا ہوں کہ کالا چور میری جان لے لے گا تو یہ لوگ تعزیت کے رزولیشن کی نقل پس ماندگان کے ہاں تو شاید بھیج دیں اخبارات میں ہرگز نہ بھیجیں گے!

اسی طرح بات بڑھ کر بتنگڑ بن جاتی ہے۔ اتنی بات تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ بات سے بتنگڑ برآمد ہو سکتا ہے بتنگڑ سے بات نہیں بنتی جان پر البتہ بن آسکتی ہے پھر بتنگڑ وہ لفظ ہے جو بول چال میں بجائے خود کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ بات سے مل کر البتہ بتنگڑ بن جاتا ہے جیسے صلح بجائے خود کوئی حیثیت نہیں رکھتی صرف شرائط کے ساتھ مل کر جنگ بن جاتی ہے۔

ریڈیو کہتا ہے بات کرو، لیکن منہ سنبھال کر، مذہب کہتا ہے روزہ رکھو، لیکن منہ سنبھال کر، گاڑی میں درج ہے تھوکو مت اس سے بیماری پھیلتی ہے۔ یہ بھی منہ سنبھالنے ہی کی تلقین ہوئی۔

دلّی کے تانگے والے بھی ہم کو منہ سنبھالے ہی رکھنے کی دعوت دیتے ہیں اور خود چابک سنبھالے رہتے ہیں، میں اس کا بُرا نہیں مانتا۔ ملال صرف اتنا ہے کہ منہ سنبھالے رکھنے کی دعوت چابک سنبھال کر کیوں دیتے ہیں۔ پھر اس سے بھی کچھ کم خاطر شکنی نہیں ہوتی کہ منہ تو میں اپنا سنبھالوں اور تھیلی میری یہ سنبھالیں۔

لیکن میں طبعاً ''فیلسوف'' واقع ہوا ہوں اور احتیاطاً لیڈر، اس لیے ہر ہزیمت میں اشک شوئی کا سامان پیدا کر لیتا ہوں اور ہر ناگفتنی میں گفتنی کا پہلو نکال لیتا ہوں۔ فلسفہ پھر فلسفہ ہے خواہ تانگہ والوں کا ہو خواہ بقول اقبال گوسپندانِ قدیم کا چابک اور سکت ہاتھ میں نہ ہوں تو منہ سنبھالے رکھنے کا رقعہ دعوت تقسیم کرنا ایسا ہی ہے جیسے رومۃ الکبریٰ کا خواب دیکھنا، اور قیامتِ صغریٰ سے گریز کرنا۔ اسی کو بات کرنے اور لات کھانے کا فلسفہ ہی نہیں منطق بھی کہتے ہیں!

ذاتی نقطۂ نظر سے میں بات کرنا بُرا نہیں سمجھتا، لیکن اور بہت سارے نقطہ ہائے نظر سے لات کھانا غیر مستحسن بھی سمجھتا ہوں اور غیر جمہوری بھی تاوقتیکہ لات جمہور کی نہ ہو۔ اس میں اعضائے جسمانی کے لف ونشر غیر مرتب ہو جانے کا امکان ہوتا ہے۔ بقولِ غالب:

کہ ہو گئے مرے دیوار ودر در ودیوار [1]

بات میں بات پیدا کرنا تو آسان ہے لیکن خرابی اس وقت ہوتی ہے جب اس میں خوبی پیدا ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ میں بات صرف ایسے موقع پر اور ایسے لوگوں میں کرنا پسند کرتا ہوں جو بات سننے کی اہلیت رکھتے ہیں اور رو پڑنے یا کاٹ کھانے کی تفریح سے باز رہ سکتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ ایسے ہی ہیں کہ آپ سے بات کی جائے لیکن آپ ایسے نہ بھی ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آخر یہ کیوں فرض کر لیا جائے کہ روئے سخن آپ کی طرف ہے خود غالب نے فرمایا ہے:

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُوسیاہ! [2]

مکمل شعر اس طرح ہے:

1. ہجوم گریہ نے کاشانے کا یہ رنگ + کہ ہو گئے مرے دیوار ودر در ودیوار
2. روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُوسیاہ + سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے — غالب

گو غالب نے یہ کہیں نہیں فرمایا ہے کہ کوئی روسیاہ ہو تو وہ روئے سخن کسی طرف کرنے کا مجاز نہیں اور نہ کہیں یہ بتایا ہے کہ مخاطب روسیاہ ہو تو اس کی طرف روئے سخن نہیں ہو سکتا۔ بہر حال نہ میں روسیاہ نہ آپ سیاہ رُو، اور یہ میں بیانِ واقعہ کے طور پر نہیں بلکہ رفعِ شر کی خاطر کہہ رہا ہوں۔ چنانچہ اب آپ ریڈیو کی طرف کان لگائیے اور وقتاً فوقتاً دل کو سمجھاتے رہیے۔ دل کو سمجھانے کی مشق ہو گئی تو آپ دل کی بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہیں گے، اور اس طرح بہت سے شریف آدمی آپ سے محفوظ رہیں گے۔ بغیر صلح کے لڑائی ختم ہو جائے گی۔ نہ عاشقی ہو گی نہ عزتِ سادات جائے گی۔ قحط کی ارزانی نہ ہو گی، غلّہ سستا ہو گا، کپڑا سستا ہو گا، دوائیں سستی ہوں گی۔ افیون کے بارے میں آپ کے دوست بہتر بتا سکتے ہیں سستی ہو گی یا مہنگی۔ بیوی بچے سستے پڑیں گے۔ آپ سستے چھوٹیں گے۔ آخرت کا سفر اور یونیورسٹی کی تعلیم بھی سستی پڑے گی۔

باتوں میں بات یا بات کی بات میں، ہم آپ ساتھ ساتھ آگے پیچھے یا
پا بہ دستِ دگرے گوش بدستِ دگرے

کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ یوں تو بات میں بات اور نیت میں فتور پیدا ہوتا ہی رہتا ہے، لیکن غالب جو اسد میں سے شیر برآمد ہونے کو بہت بُرا مانتے تھے ایک جگہ فرماتے ہیں کہ:

خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

لیکن لیڈروں کے ہوتے غالب کو کون خاطر میں لاتا ہے۔ غالب تو فرماتے ہیں کہ ٹھکانے کی بات خاموشی ہی سے نکلے ہے جیسے:

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے

لیکن لیڈروں کی تقریر خامشی سے نہیں اغراض سے برآمد ہوتی ہے۔ یہ بات تو کرتے ہیں حاضرین سے، لیکن مخاطب ہوتے ہیں غائبین سے! تقریر کرنے میں وہ حاضر کو غائب اور غائب کو موجود سمجھتا ہے۔ یہی غائب اس کی اصطلاح میں ہوا موجود اور ہوا مقصود دونوں ہے۔ وہ ہمہ اُوست اور ہمہ از اُوست کے قضیہ میں کبھی نہیں پڑتا وہ صرف ہمہ برائے ماست کی فکر میں رہتا ہے۔ یہاں بحث زمان، مکان کی آ جاتی ہے جس کو بغیر تصوف سمجھنا یا بُھلانا آسان نہیں۔ اس وقت تو صرف اتنے پر اکتفا کیجیے کہ زمان و مکان سے خالی نہیں اور مکان کو زمان سے مفر نہیں اور دونوں کو تصوف سے

چھٹکارا نہیں۔ پھر ہم آپ کس شمار قطار میں بقول اقبال با مدک تصرف:

نے من بہ شمار آیم نے تو بہ قطار آئی!

لیڈر زندگی کے ہر شعبہ میں پایا جاتا ہے۔ وہ ہر درجۂ حرارت میں زندہ رہتا ہے اس کا انجکشن آج تک دریافت نہ ہوسکا اس لیے کہ دو لیڈر یکساں مزاج اور قوام یا زہر کے آج تک نہیں پائے گئے۔ خود اسی کے مادّہ سے اس کا انجکشن (آٹو ویکسین) تیار نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ بعض امراض کی طرح لیڈری کے جراثیم بھی بیداری میں خون کے ساتھ گردش نہیں کرتے بلکہ کسی گوشہ میں دبکے رہتے ہیں۔ ایسے امراض میں مریض کا خون سونے کی حالت میں لیا جاتا ہے۔ جب اس کے جراثیم خون میں تفریح کرتے ہوئے گرفتار ہوجاتے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ لیڈر غافل نہیں ہوتا۔ بعض افسانوی ''عجائب المخلوقات'' کی مانند لیڈر باری باری ایک آنکھ سے سوتا اور دوسری سے بیدار رہتا ہے۔

جس طرح یورپ کے کارخانوں اور مشینوں کا حال ہے کہ وہ مصنوعات کی تیاری میں ادنیٰ سے ادنیٰ فضلہ کو بھی رائیگاں جانے نہیں دیتے، لیڈر بھی اپنے مطلب کو کسی حال میں فوت نہیں ہونے دیتا۔ وہ صرف تقریر کرکے، ریزولیشن پاس کرکے یا ووٹ دے کے اپنا کام بنالے گا، خواہ اس سلسلہ میں یا اس سبب سے زندگی کی اعلیٰ ترین قدر بھی کیوں نہ ملیامیٹ ہوجائے۔ وہ بتائے گا کہ ہر چیز خطرہ میں ہے اور ظاہر ہے جب ہر چیز خطرہ میں ہوگی تو سب سے بڑا خطرہ (یعنی وہ خود) فائدہ میں رہے گا، وہ لڑائی شروع کرے گا کون و مکان کی حمایت میں اور سمجھوتہ کرلے گا انجمن تحفظِ ماکیان کی ممبری پر!

اچھا ذرا اُن صاحب کی طرف دیکھئے جو آپ سے ذرا فاصلہ پر ہمہ تن موش بنے بیٹھے ہیں۔ یہ اس خیال پر زندہ ہیں اور دوسروں کو زندہ نہیں رہنے دیتے کہ دنیا میں جو کچھ ہورہا ہے وہ غلط فہمی کی بناپر ہے، یعنی غلطی دوسروں کی 'فہمی' ان کی۔ دنیا میں جو کچھ ہورہا ہے یا عقبیٰ میں جو کچھ ہوگا وہ محض اس لیے کہ انھوں نے ڈھیل دے رکھی ہے ورنہ ان کے پاس ایسی تحریریں موجود ہیں جن کو یہ شائع کردیں تو نظامِ عالم درہم برہم ہوجائے۔ علم و حکمت، اخلاق و مذہب، دنیا و عقبیٰ کا کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے جس کو وہ اپنی مملوکہ، مقبوضہ یا مسروقہ تحریروں سے کلیتہً غلط یا گہری سازش کا

نتیجہ نہ ثابت کر دیں، لیکن وہ اس کارِ خیر کو ہاتھ میں اُسی وقت لیں گے جب ان کو معاوضہ دیا جائے۔ حکومتیں زرِ کاغذی کے لیے سونے چاندی کا ذخیرہ محفوظ رکھتی ہیں، یہ زرِ کاغذی اور سونا چاندی دونوں کے لیے تحریریں اور تراشے مہیا رکھتے ہیں۔ یہ اُن لوگوں میں ہیں جو اپنے نفس کی ادنیٰ تسکین کے لیے انسانیت کے برگزیدہ مقاصد یا نمونوں کو نجس کر دینے میں تامل نہ کریں گے۔

اور ذرا آپ کو ملاحظہ فرمائیے، سر کھلا، لباس میلا، خط بڑھا، آنکھوں میں بھوک، پاؤں میں چپل، جیب میں فاؤنٹن پین، رفتار بھٹکی بھٹکی، گفتار بہکی بہکی، اوقات گھسی پسی! یہ زندگی، ادب، حسن، آرٹ، عورت، انقلاب وغیرہ کے نقاد ہیں! انھیں ساری خرابی دولت میں اور ساری خوبی عورت میں نظر آتی ہے بشرطیکہ وہ دوسروں کی ہو۔ یہ اُن اطبا کی مانند ہیں جو مخصوص امراض کے ماہر ہوتے ہیں یہ ہر تندرستی میں انھیں امراض کی تلاش کرتے ہیں، ان کے نزدیک تندرستی نام ہے مخصوص امراض کے امکانات کا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر کسی شاعری، ادب یا سوسائٹی میں فلاں فلاں امراض اس تفصیل یا آہنگ میں نہ ملیں تو وہ شاعری ادب یا سوسائٹی ناقص اور فاسد ہے۔ ظاہر ہے شعر و ادب کا یہ تصور کس قسم کا آرٹ، اخلاق یا انسان پیدا کرے گا۔

اور وہ جو ایک معزز خاتون ریڈیو کے پہلو میں تشریف فرما اپنے بڑے سے کھیل اور میری تقریر سے برہم ہو رہی ہیں اور سینما جانے کے لیے بے قرار ہیں، ان سے آپ واقف ہیں اگر ہماری زندگی، ادب اور آرٹ کے وہ نقاد تھے تو یہ تنقید ہیں۔ ہماری لڑکیاں اور عورتیں ان دنوں جس ذہنی کشاکش میں مبتلا ہیں اس کا مجھے بڑا قلق ہے۔ اپنی تندروئی میں انھوں نے جو غبار اُٹھایا ہے، اس میں یہ خود اسیر ہو گئی ہیں اور معلّق ریت و غبار میں سورج کی کرنیں دھوپ چھاؤں کی جو رنگین گریز پا نیرنگیاں

دم بہ دم با من و ہر لحظہ گریزاں از من

بُنتی ادھیڑتی رہتی ہیں ان میں معو و مبہوت ہیں۔ ادنیٰ فلم، اردو کے سستے ناولوں اور پوچ افسانوں اور نظموں نے ان کو کہیں کا نہ رکھا۔ وہ سمجھنے لگی ہیں کہ زندگی وہی ہے اور صرف وہی جو سینما، افسانوں اور نظموں میں نظر آتی ہے۔ ان کو کون سمجھائے اور کیسے سمجھائے کہ یہ زندگی نہیں ہے تمسخر اور شُہد پن ہے۔ لے بھاگنا اور بھگا لے جانا، شعر پڑھنا، رقص کرنا اور زہر کھا لینا زندگی نہیں اوباشی ہے۔

زندگی اوّل آزمائش ہے آخر آزمائش ہے اور صرف آزمائش ہے۔ اسی میں خوشیاں بھی ہیں، بے پایاں خوشیاں اور ابدی خوشیاں۔ آزمائش سے عہدہ برآ ہونے اور ہوتے رہنے کی خوشیاں۔

بعض عورتیں اپنی اس گمرہی یا واماندگی کو اپنا بڑا کارنامہ سمجھتی ہیں۔ وہ سمجھتی ہیں کہ اس طور پر انھوں نے مردوں کو بڑی زک پہنچائی ہے، جنھوں نے اوّل سے ان کو محکوم و مقہور رکھا تھا! ان کو نہیں معلوم کہ ان کی یہ آزادی یا بغاوت بھی مردوں ہی کا کہا ہوا ایک لطیفہ ہے۔ مجھے اکثر تعجب ہوتا ہے کیا یہ جدید خیال عورتیں، جدید الخیال مردوں کی شعر و شاعری پر نظر نہیں رکھتیں جن کا عورت کا تصور ہرگز وہ نہیں ہے جس پر کوئی عورت فخر کر سکے۔ آرٹ ہو، حسن ہو، ادب ہو، عورت ہو، اگر ان کی تعبیر جسم کی لذتوں سے کی جائے تو میں اسے نری بدکرداری سمجھتا ہوں، اگر یہ زندگی کی ستودہ قدروں کی محرک اور مفسّر ہوں تو پھر سب کچھ ہیں۔

لیکن میں نہیں چاہتا کہ آپ اس طرح کی باتیں سن کر ریڈیو پر بیٹھے بٹھائے اونگھ جائیں اور آپ کو خفت ہو اور گریبان پھاڑ کر کسی طرف نکل جائیں تو پس ماندگان کو زحمت ہو، میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ کو ایسے واقعات یا شخصیتوں سے روشناس کراؤں کہ آپ کا یہ وقت لطف سے گزرے اور اس لطف سے گزرے کہ آپ آزمائش کی گھڑیاں بھی ہنس ہنس کر اور ہنسا ہنسا کر گزار دیں۔ اچھا تو پھر لگے ہاتھوں ذرا میرے سب سے نئے اور کمسن دوست سے ملتے چلیے۔ وہ جو ایک صاحب کی گردن پر سوار ہیں اور وہیں سے براہِ راست دوسرے صاحب کے کندھے پر جست کرنے والے ہیں ان کی عمر غالباً چار سال ہوگی۔ بات چیخ کر کرتے ہیں اور کام دوڑ کر کرتے ہیں۔ لباس کا مصرف پہننا نہیں بلکہ اُتارنا سمجھتے ہیں۔ بڑی مشکلوں سے سمجھوتا اس پر ہوا ہے کہ نصف بہتر یا بہ روایت دیگر نصف ابتر حصہ جسم کو ضرور ڈھکا رہنے دیں، لیکن ابھی ستر اور لباس ایک دوسرے سے پورے طور پر سازگار نہیں ہوئے ہیں اس لیے دوڑنے میں دونوں ہاتھوں سے بے قابو پاجامہ کو پکڑے رہتے ہیں۔ اب ان کو کون سمجھائے کہ پاجامہ پکڑے رہنے سے کیا ہوتا ہے جب اس کا مصرف یا مقصد پس و پیش سے مستقلاً فوت ہوتا رہتا ہے!

ایک دن میں ان کے گھر گیا۔ اطلاع ہوئی تو چیختے، قہقہہ لگاتے، جاگتے برآمد ہوئے وہ بھی غالب کے مصرعے میں:

یعنی ہمارے جسم پہ اک تار بھی نہیں

میں نے کہا۔

''آپ کا پردہ وہ کیا ہوا؟''

تو پھر قہقہہ لگایا جس میں داد پانے کی اپیل بھی شامل تھی اور فرمایا ''دھویا جا رہا ہے۔''

میں ابھی حواس مجتمع نہ کر پایا تھا کہ ایک اور قہقہہ لگایا اور بولے ''نمک پارہ۔''

اس نمک پارہ میں تلمیح ہے۔ سارے محلّہ میں دوستی کے لیے انھوں نے میرا انتخاب کیا ہے۔ گھر میں کوئی مزے دار چیز پکے یا کہیں سے آئے تو یہ میرا حصہ مخصوص کر دیتے ہیں۔ میرے آنے کی اطلاع کی جائے تو میرا نام اور جو مزے دار چیز گھر میں ہوتی اس کا نام چیختے ہوئے برآمد ہوں گے۔ میرے ساتھ کوئی ہوا تو اس سے کہیں گے کہ ''فی الفور مکان سے چلے جاؤ رشید صاحب کو فلاں چیز کھلانی ہے۔'' اس کے بعد نو وارد کو اس طور پر ڈھکیلیں گے جیسے قلی مال گاڑی کا ڈبہ ڈھکیلے۔ یہ ناممکن ہے کہ گھر میں کوئی غیر معمولی چیز پکے یا آئے اور یہ مجھے ایک ایک کا پتہ، حلیہ اور مقدار وغیرہ نہ بتا دیں اور میرے لیے نہ لائیں۔ میرا کام یہ ہے کہ ان کو گود میں بٹھالوں، نقل کرتا جاؤں اور یہ اپنی بوسیدہ کتاب سے پھل پھول، مٹھائی، جانور وغیرہ کے نام پوچھتے جائیں اور میں بتاتا جاؤں جیسے کوئی امتحان لیتا ہو۔ میں پڑھ دیتا ہوں تو خوش ہو جاتے ہیں اس پر نہیں کہ مجھے پڑھنا آتا ہے بلکہ جو انھوں نے پڑھا تھا وہی میں نے بھی پڑھ دیا۔ اپنا ایک ہاتھ کتاب پر رکھتے ہیں اور دوسرا احتیاطاً میرے گال پر تاکہ میں کسی دوسری طرف مخاطب نہ ہونے پاؤں، کتاب نہیں ہوتی تو صرف بات کرتے ہیں۔ اپنے دونوں ہاتھ میرے دونوں گالوں پر جمائے رکھتے ہیں، تاکہ کسی دوسری طرف روئے سخن کا امکان ہی باقی نہ رہے!

سفینہ کنارے پہ آلگا اور بات ختم ہونے کو نہیں آتی۔ جب سے دنیا میں بات کرنے کا فن ایجاد ہوا، آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کیسی کیسی باتیں کی گئی ہوں گی کس کس نے کی ہوں گی کیا کی ہوں گی کیا نہ کی ہوں گی اور انسانوں کا یہ بے پایاں سیلاب، یہ مسلسل مدّ و جزر اور یہ بے پناہ ہجوم کس کس قسم کی باتیں کرتا ہے، کہتا، سنتا سناتا رواں دواں ہے کہنے والا کیا کہتا ہے کیوں کہتا ہے اور کیسے کہتا ہے، سننے والے کیا سنتے ہیں، کیوں سنتے ہیں اور کیا سنتے ہیں۔ کتنی اچھی باتوں کو فروغ

ہوتا ہے اور کتنی زندگیاں راہ پاتی ہیں۔ انسانیت کا کیا تقاضا ہے اور شیطنت کا کیا فسوں ہے تصورات کا تصادم اور طاقتوں کی ناہمواری کیسے کیسے گل کھلاتی ہے اور زندگی کس پُر اسرار اور پُر محن آشوب میں مبتلا ہے۔ انسانی فکر کی رسائی یا نارسائی نے سارے عالم کو ایک مستقل لاینحل سوالیہ نشان میں منتقل کر دیا ہے چنانچہ بات میں کام کی بات اتنی ہی نکلی باقی رہے نام اللہ کا۔

(نشریہ 20؍ستمبر 1941)

●●●

ذہین بیوی

(ایک مکالمہ)

رشید صاحب: صاحبو! آج کے موضوعِ گفتگو پر مجھے اندیشہ ہے، آپ نے آزادی اور دل جمعی سے غور نہ کیا ہوگا۔ غور کرنے کے لیے ذہن کی یک سوئی کی ضرورت ہے، اور یک سوئی کیسے میسّر آسکتی ہے، جب آج کی گفتگو کا انجام رہ رہ کر ہمارے اور آپ کے سامنے آتا ہو۔

جہاں تک بیوی کا سوال ہے، میں سمجھتا ہوں ہر بیوی خواہ وہ عام طور پر کیسی ہی ہو، شوہر کے حق میں ہمیشہ ذہین ہوتی ہے۔ شوہر کو بیوی کی ذہانت سے اتنا سابقہ نہیں پڑتا، جتنا اس کی ذہنیت سے، اور یہ بیوی کی ذہنیت ہی ہوتی ہے، جو شوہر کے لیے اسے ذہین بنا دیتی ہے۔

میرے نزدیک میری اور آپ کی یہ دشواری اس طور پر دور ہوسکتی ہے کہ ہم سب صدقِ دل سے اس امر کا جلد سے جلد اعلان کردیں، کہ ہماری گفتگو قطعاً غیر جانب دارانہ ہوگی اور ہمارا روئے سخن نہ اپنی نیک بیویوں کی طرف ہے اور نہ کسی اور کی۔ ہمارا روئے سخن صرف میکروفون کی طرف ہے، اور مجھے یقین ہے کہ بیویاں خواہ وہ ذہین ہوں یا نہیں، اس امر کی تصدیق کریں گی کہ کوئی شوہر خواہ وہ کتنا ہی مظلوم یا غبی کیوں نہ ہو، میکروفون پر بیوی کو مخاطب نہ کرے گا۔

دوسری بات جو میرے ذہن میں آتی ہے، وہ یہ ہے، کہ کس بنا پر ذہین بیوی کو مستقل عذاب قرار دیا جائے۔ مجھے موضوعِ گفتگو میں ایک جھول نظر آتا ہے، کہ اس موضوع کا انتخاب کرنے والا بیوی کے کاروبار سے ناواقف معلوم ہوتا ہے، عورت کے ساتھ مستقل کا لفظ لانا ہی عورت سے ناواقفیت کی دلیل ہے، مستقلاً نہ کوئی عورت ذہین ہوتی ہے اور نہ عذاب۔ بات صرف اتنی ہے کہ جس طرح اطبا نے اشیا کا مزاج دریافت کیا ہے کہ کون سی چیز کس درجہ میں گرم، خشک یا تر ہوتی ہے اسی طرح ذہین بیوی بھی مختلف درجوں میں سرد، خشک، گرم، تر ہوتی ہے اور اسی اعتبار سے ذہین بیویاں مستقلاً یا عارضی طور پر عذاب بنتی رہتی ہوں یا نہیں اُن کے نیاز مند شوہر مسلسل داخلِ حسنات ہوتے رہتے ہیں۔

غفور صاحب: رشید صاحب! گستاخی معاف۔ جس وقت آپ داخلِ حسنات ہو رہے ہوں میرا دخل در معقولات دینا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا، لیکن ایک بات یاد رکھیے کہ آپ ذہین بیوی کے عذاب کو جو رنگ دے رہے ہیں وہ آپ کی ذہانت کی دلیل ہو سکتی ہے۔ آپ کے عافیت بخیر ہونے کی بشارت نہیں دی جا سکتی۔

رشید صاحب: غفور صاحب! میں تو اپنی عافیت کی طرف سے مطمئن ہوں، آپ بھی ذہین بیوی کی طرف سے مطمئن ہیں کہ نہیں؟

غفور صاحب: آپ نے اطمینان کی بھی ایک ہی کہی۔ بھلا ذہانت اور طمانیت کا ساتھ کہاں؟ اس کے طفیل تو جنت سے نکالے گئے۔ وہ دن اور آج کا دن، سکون تک نصیب نہ ہوا، پھر بھلا جس سے اپنے ذہن کا بار نہ سنبھلتا ہو اس پر بیوی بھی اپنی ذہانت کا بار لاد دے تو کہاں ٹھکانا ہے۔ بہشت کے بعد لے دے کر دنیا میں جگہ رہ گئی تھی، یہاں سے نکلے تو شاید دونوں جہاں سے ہی جائیں گے۔ یہ مانا کہ شوہر ایک زمانے سے بیوی کی ناز برداری ہی نہیں بار برداری کا کام بھی کرتے چلے آئے ہیں۔ خواہ بچے ہوں یا چھاتے، اوورکوٹ ہوں یا دستانے، لیکن ذہانت کا یہ بارِ گراں تو سنبھالتے بھی نہ سنبھلے گا۔

رشید صاحب: غفور صاحب! اب تک تو دوزخ سے ڈرایا گیا ہوں، اب آپ نے بہشت سے ڈرانا

شروع کر دیا، لیکن آپ ذہین بیوی کو جس طرح پیش کر رہے ہیں، اس سے مجھے کچھ آس بندھتی ہے کہ اگر ہم آپ دونوں ذہین بیوی کے آشوب کو سمجھ جائیں تو ہم کو یقیناً جنت نصیب ہوگی۔ اختر صاحب! آپ کا کیا خیال ہے؟ یعنی ہمارے جنت نصیب ہونے کے بارے میں نہیں بلکہ غفور صاحب کی ذہین بیوی کے بارے میں۔

اختر صاحب: معاف فرمایئے گا۔ مصیبت تو یہی ہے کہ ہر شخص کو اپنی ذہانت کا یقین ہی نہیں بلکہ اس پر ناز بھی ہے اور اس سے عشق بھی ہے۔ یہ جو آپ اپنے ذہن اور اپنی ذہانت کو مزے لے لے کر کوس رہے ہیں، یہ دراصل محبت بھری تھپکیاں ہیں۔ آپ کی مثال اس ماں کی سی ہے، جو اپنے بچے کو اپنی محبوب ترین شے اور دنیا کی خوب صورت ترین چیز سمجھتے ہوئے بھی صبح سے شام تک اس کے شریر اور نالائق اور پاجی اور شیطان اور نہ جانے کیا کیا کچھ ہونے کا اعلان کرتی رہتی ہے اور اپنی مظلومی کے اظہار میں سارے جہاں کو سر پر اُٹھا لیتی ہے، دراصل وہ اپنی مظلومی کا اظہار نہیں کرتی، اپنے لاڈ اور پیار کا اظہار کرتی ہے، اور نہایت خوش اُسلوبی کے ساتھ اس امر کی اشاعت کرتی ہے کہ اگر دنیا میں کوئی ماں ہے تو وہ ہے، اور کوئی بچہ ہے تو اس کا بچہ۔

غفور صاحب: اختر صاحب! گستاخی معاف۔ مجھے تو آپ پر گھریلو ذہنیت کا بڑا گہرا سایہ پڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ماں کی تشبیہ اچھی ہے، مگر ماں کی ذہانت کی دلیل نہیں۔

رشید صاحب: لیکن حضرت جب تک بیوی کی ذہانت کا مسئلہ طے نہ ہو جائے ماں کی محبت یا ہمسایہ کے حقوق کا سوال اُٹھانا کچھ غیر متعلق سا معلوم ہوتا ہے۔

اختر صاحب: تو پھر میں اپنے دوست کو اس مال دار شخص کے مشابہ قرار دوں گا جو اپنی دولت کا پرستار ہوتے ہوئے اس سے بیزاری کا اعلان کرتا ہے۔ وہ دولت کو ایک مصیبت اور عذاب بتاتا ہے، اور وقت بے وقت یہ ظاہر کرنے کی کوشش میں رہتا ہے کہ وہ ایک ایسا بوجھ اپنے کندھوں پر اُٹھائے ہوئے ہے، جس کو دوسرے یعنی وہ جو مال دار نہیں ہیں کسی طرح سنبھال ہی نہیں سکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کو اپنی دولت حد سے زیادہ عزیز ہوتی ہے اور اس کے تحفظ کے لیے وہ ضروری سمجھتا ہے کہ دوسروں کو اس سے محروم

رہنے ہی میں اپنی عافیت نظر آئے۔ اسی لیے وہ دولت کی برائیوں سے ساری دنیا کے
کان پاٹ دیتا ہے۔

غفور صاحب: اختر صاحب! اب آپ تبلیغ پر اُتر آئے۔ مجھے تو اس میں بھی گھریلو رنگ نظر آرہا ہے۔
یاد ش بخیر ایک ذہین بیوی نے اپنے شوہر سے کیا خوب کہا تھا کہ تمھاری ذہنیت کا تو یہ
حال ہوگیا ہے کہ اگر میں سیاہ کو سفید بتانے لگوں تو تم میری بات ضرور کاٹ کر
رہو گے۔ آپ تو ایک کانٹوں کے تاج کو پھول مالا بنانے کی فکر میں ہیں۔

رشید صاحب: ''کانٹوں سے بھی نباہ کیے جارہا ہوں میں۔''

اختر صاحب: چلیے اسے بھی جانے دیجیے۔ میں کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے
ذہن پر فریفتہ ہوتا ہے، اور ذہانت کو اپنی ملکیت خاص خیال کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ
ہم ذہین بیوی کے تصور سے گھبراتے ہیں مگر میری رائے میں تو یہ فرار پسندی کے سوا اور
کچھ نہیں۔ ذہین بیوی کو ایک عذاب سمجھنا اپنی زندگی کی ایک تلخ اور ناخوش گوار حقیقت
سے فرار کا ذریعہ ہے، اور بس۔

غفور صاحب: لیجیے اختر صاحب! آخر آپ بھی آئے نا زندگی کی تلخ اور ناخوش گوار حقیقتوں کی طرف۔
غنیمت ہے، آپ نے کسی حقیقت کی تلخی کا اعتراف تو کیا۔

رشید صاحب: یعنی وہ جو کہا ہے، ع شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے ذہن میں

اختر صاحب: جی ہاں کیوں نہیں ہوتا دراصل یہ ہے کہ گھر کے باہر مردوں کی دنیا میں ہمیں اپنے
سے زیادہ ذہین لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے، اس سے ہماری خود پسندی کو ٹھیس لگتی ہے،
اور ہمارا جھوٹا جذبۂ خود پسندی یا برتری مجروح ہو جاتا ہے۔ ہم بھلا یہ کیوں چاہنے
لگے کہ کوئی دوسرا ہماری ذہنی فضیلت کے مقابلہ میں اپنی ذہانت کا علَم بلند کرے، اور
ہمیں نیچا دکھائے۔ چنانچہ اس شکست کا انتقام لینے کے لیے ہم گھر کا رُخ کرتے
ہیں۔ ذہین بیوی کو ایک عذاب قرار دینے سے یقیناً ہمارا مطلب اس کے سوا اور کچھ
نہیں ہوسکتا کہ ہم اپنی ذہانت کے پندار کو کسی نہ کسی طور پر برقرار رکھنے کی بدحواسانہ
کوشش کررہے ہیں۔

رشید صاحب: سنو سنو، شرم شرم!

غفور صاحب: لیجیے اختر صاحب! ایک خانگی محاذ تو تھا ہی، آپ نے تو دلائل اور براہین کا نیا محاذ قائم کر دیا۔ مگر مجھے ڈر ہے یہ بھی کہیں دوسری Magnet لائن ثابت نہ ہو۔ یہ ٹوٹی تو پھر ساحلِ آب تک کہیں اور رُکنے کی جگہ نہ ملے گی۔ ایک ذہین بیوی کی طرح آپ نے میرے الفاظ کا وہ مفہوم لے لیا، جس کا نتیجہ خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ میرے خیال میں ذہانت کوئی ایسی چیز نہیں جیسے کان کے لیے کوئی نئی طرز کا آویزہ۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ اکثر ذہین عورتیں اس کا مقصد ایک آویزے یا ایک نئے بلاؤز Blouse سے زیادہ نہیں سمجھتیں۔

رشید صاحب: جزاک اللہ۔

غفور صاحب: عورت ایک خوش نما پھول ہے، لیکن بقول ایک صاحبِ حال: کانٹے سے ہی جانا کہ پھول ہے، اور یہ کانٹا ہے حقیقت میں ذہانت کا کانٹا۔ ذہین عورتوں نے نسوانیت کے پھول کو تو جلا دیا اور سمجھیں کہ پھول بنا ہی کانٹے کے لیے تھا۔ میرے نزدیک ذہانت کوئی چندن ہار قسم کی چیز نہیں ہے بلکہ ایک ایسا وصف ہے، جس کی بنا پر انسان زمین کے ذرّوں کو چھوڑ کر ستاروں سے اُلجھتا ہے۔ پھولوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے کانٹوں کو اپنی توجہ کا مرکز بناتا ہے۔ حیات اور کائنات کے ان بھیدوں کو ٹٹولتا ہے جو آج تک کسی کے ہاتھ نہ آ سکے۔ ایک مادام کیوری کی طرح عمل میں دن رات ایک کر دیتا ہے، تب کہیں جا کر انسانی بے عملی کی شبِ تاریک کو ایک نئی روشنی سے جگمگاتا ہے، کہیں یہی وصف Hypatia مصر کی مشہور فلسفی عورت کی طرح سکندریہ کے چوک میں منبر پر چڑھ کر ارسطو اور افلاطون کے فلسفہ کی تعبیر کرتا ہے اور پھر جاہل علما اور عوام کے ہاتھوں سنگ سار ہو کر شہیدِ علم کا رتبہ حاصل کرتا ہے۔

رشید صاحب: اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست۔

غفور صاحب: اگر میں نے ذہانت کی غلط تعریف نہیں کی تو شاید آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ یہ ایک جنون ہے، ایک آزار ہے، ایک بوجھ ہے، ایک ذمہ داری ہے۔ جو شخص اس

وصف کو اپناتا ہے، وہ خود کو ایک جنون میں مبتلا کرتا ہے، اور اس سے تو آپ انکار نہ کریں گے کہ بادشاہوں کی طرح کسی اقلیم میں بھی ایک مجنوں سے زیادہ کی گنجائش نہیں، اور ایسے دیوانوں کی یقیناً عورتوں کے طبقہ میں کس بات کی کمی ہے۔ اگر ایک مادام کیوری ہوئیں بھی، تو وہ ان مستثنیات میں سے ہیں جو کلیہ کو ثابت کرتی ہیں۔

اب ذہن کی ان سب ذمہ داریوں، اس کی نوک اور چبھن کے ساتھ ساتھ انسان آخر انسان ہے (خواہشوں، اُمیدوں اور ارمانوں کا ایک پتلا، اور یوں شاید) اسے حق بھی پہنچتا ہے کہ وہ زندگی کے کم از کم ایک شعبے میں تو ذہن کے بوجھ سے آزاد ہو کر خالص انسانی مسرّتوں کا لطف اُٹھائے اور جب یہ ہے تو آپ ہی بتائیے کہ ذہین بیوی اس کے لیے عذاب نہیں ہوگی۔ تو کیا ہوگی؟

رشید صاحب: اس سے تو شاید یہ مطلب نکلتا ہے کہ آپ مرد کی جنسی فوقیت کے قائل نہیں، اور عورت کو آرائش، خلوت اور سرمایۂ عیش و نشاط سے زیادہ حیثیت نہیں دینا چاہتے۔ اس لیے میں آپ کا بُرا نہیں چاہتا۔ اپنے آپ کو بشارت دینا چاہتا ہوں۔

غفور صاحب: جی نہیں، یہ بات نہیں۔ میں تو خانگی مملکت کی حدود میں داخل ہوتے ہی جنسی مساوات کا قائل ہو گیا، لیکن ہم نے تو یہ دیکھا کہ دنیا بھر کے اُصول و قوانین جہاں گھر کی چوکھٹ کے اندر پہنچے، سب کے سب گھریلو تعزیرات کی زد میں آ گئے۔ مردوں نے ایک زمانے تک اپنی فوقیت کا محاذ قائم رکھا اس سے پسپا ہوئے، تو بے چاروں نے اپنا محاذ جدا قائم کیا۔ فطرت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ دونوں کے حلقہ ہائے عمل جداگانہ، دونوں کے محاذ علاحدہ علاحدہ ہوں، مگر گھریلو مملکت کی فاسٹ قوتوں، ان کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کے مقابلہ میں اب اس محاذ کی بھی کوئی حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔ نہ معلوم کب ہالینڈ کے سمندری بند کی طرح ٹوٹ کر بہہ جائے۔ خدانخواستہ میرا مطلب یہ نہیں کہ ایک محاذ بالکل ناقص العقل، اور دوسرا عقل کے اٹن بموں سے مسلح ہو، آج کل کیا جنگی محاذ اور کیا گھریلو دونوں پر عقل ہی کی ستم آرائی ہے، لیکن ڈر ہے کہ گھریلو محاذ کہیں عقل اور ذہانت کا ایسا ٹائم بم نہ تیار کر دے، جو دونوں محاذوں کو زمین کے برابر کر دے۔

تو میرا مطلب یہ ہے کہ شوہر کو بیوی کی علمی، ادبی، کلچرل اور فلسفیانہ موشگافیوں کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کی ہمدردی اور دل سوزی کی ضرورت ہے، اور ظاہر ہے کہ ہمدردی اور دل سوزی کو خالص ذہانت سے کچھ ایسا زیادہ واسطہ نہیں۔

رشید صاحب: سبحان اللہ! مکرر ارشاد ہو!

اختر صاحب: مگر بندہ نواز! سوال تو یہی ہے کہ آپ زندگی میں یہ دستِ شفقت اور یہ سہارا کیوں چاہتے ہیں؟ عورت کیوں نہ اپنی مٹی کے دیوتا کے ٹوٹے ہوئے پاؤں جوڑنے کی کوشش کرے اور جب وہ اپنی عظیم ذمہ داریوں کے بوجھ سے دبا ہوا گھر واپس آئے، تو اس کے چرنوں کا امرت دھودھو کر پئے۔ آخر کیوں اس کے جنون اور نشہ کا اُتار اس کی ذہانت کے زہر کا تریاق بنے۔ کیوں نہ وہ ایک دیوی بن کر اس دیوتا کے برابر بیٹھے اور اس سے کہے، کہ میرے دیوتا! تمھارے یہ پاؤں مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ میرے آقا! ان پر کم از کم (Nickel Plating) تو کرالو۔

غفور صاحب: اچھا یوں ہی سہی، لیکن اگر دیوی دیوتا کو نکل پلیٹنگ کا مشورہ دے سکتی ہے تو دیوتا بھی دیوی سے ایک نئے قلب وصیقل شدہ قالب کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

رشید صاحب: غفور صاحب! کوئی اور بات ہوتی تو میں آپ کی صلح اختر صاحب سے کرا دیتا، لیکن جب ذہین بیوی درمیان ہو تو آپ دونوں کے بیچ میں پڑنا میری بڑی نالائقی ہوگی، اور آپ دونوں کی بیویوں کی حق تلفی! میں تو کچھ ایسا سمجھتا ہوں کہ زیرِ بحث مضمون ہی غلط ہے اس لیے ہم تینوں برخود غلط۔

بذاتِ خود میں بیوی اور خدا کے مسئلہ پر سرے سے سوچنے ہی کا قائل نہیں ہوں۔ دونوں کو صرف تسلیم کرتا ہوں۔

(مطبوعہ جامعہ، دہلی۔ دسمبر 1945، نشر شدہ: آل انڈیا ریڈیو، دہلی)

●●●

خبطی

شیخ سعدی فرماتے ہیں ایک سال دمشق میں ایسا قحط پڑا کہ یاروں نے عشق فراموش کر دیا۔ قحط پڑتا رہتا ہے اور عشق بھی فراموش کیا جا سکتا ہے، لیکن شیخ سعدی کا یہ شعر کبھی فراموش نہ ہوگا۔ البتہ یہ بات عجیب ہے کہ ہمارے ہاں حال ہی میں ایک بڑا جنگی قحط پڑا تھا، لیکن ہم نے عشق بالکل ترک نہ کیا یہی نہیں بلکہ اُس زمانہ میں ہم نے ہر کام چھوڑ کر عشق کا کاروبار شروع کر دیا۔ ممکن ہے یہ بات بھی اپنی جگہ پر وزن رکھتی ہو، کہ ہم نے پہلے ہی سے عشق کا کاروبار اتنے بڑے پیمانہ پر شروع کر رکھا تھا کہ لوگ بھوکے مرنے لگے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ عشق سے قحط اور قحط سے عشق پیدا ہوتا ہے اور قحط و عشق کا حاصلِ ضرب خبطی!

یہاں تک گفتگو کرنے کے بعد مجھے یک بہ یک یاد آیا کہ عشق اور قحط کی زد سے بچ کر بھی خبط کے موضوع پر سوچا جا سکتا ہے، لیکن ابھی میں سوچنے کا تہیہ کر ہی رہا تھا کہ بہت دنوں کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ہماری بستی میں ایک بزرگ کو اچانک یہ یقین آ گیا تھا کہ بستی کے اصل مالک وہ خود تھے اور دشمنوں نے اپنی ریشہ دَوانی سے ان کو بے دخل کر دیا تھا۔ اس کے بعد ان کا یہ مشغلہ رہ گیا تھا کہ وہ ہر عدالت میں خواہ وہ کسی کی ہو ملکیت کی بازیافت کا دعویٰ دائر کر دیا کرتے تھے، اور طرح طرح کے کاغذات کا پلندہ میلے سے بستے میں باندھے بغل میں دبائے گھوما کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھے معائنۂ مسل کی دعوت دی۔ ان کی ایک عرضی پر عدالت نے فیصلہ لکھا تھا:

''سائل کو خبط ہے''

اس فیصلہ کو پڑھ کر میں اپنی ہنسی روکنا چاہتا تھا، لیکن دوست نے یہ سمجھا کہ میں نے رونا شروع کر دیا ہے۔ انھوں نے فوراً تسلی کے کچھ کلمات کہے اور فرمایا:

''دیکھیے آپ نے اتنے ہی پر صبر کا دامن چھوڑ دیا۔ مجھے دیکھیے جب سے یہ فیصلہ صادر ہوا ہے عجب چہ کنم میں مبتلا ہوں۔ عدالت نے جو فیصلہ صادر کیا ہے وہ سر آنکھوں پر، لیکن آخر کوئی انتہا بھی ہوتی ہے۔''

میں نے پوچھا۔

''کا ہے کی انتہا؟''

بولے۔

''ضبط کی۔''

میں نے بے تابانہ پوچھا۔

''آخر ضبط کا کیا سوال ہے؟''

بولے۔

''تو پھر آپ نے پڑھا کیا دیکھیے یہ کیا لکھا ہوا ہے۔ سائل کو خبط ہے۔''

میں نے فوراً اپنے کان پکڑے اور اپنے دوست سے بغل گیر ہو کر رخصت ہو گیا۔ مجھے کچھ وہم سا ہوا نہ معلوم فریقین میں سے کون اپنا ضبط کھو بیٹھے۔

میرا کاروبار طالب علموں سے رہتا ہے جو ہر دیکھ بھال کے باوجود ایسی کتابیں پڑھ لیتے ہیں جن کو اکبر اس لیے قابل ضبطی سمجھتے تھے کہ ان کو پڑھ کر بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ایسی کتابیں نہ بھی پڑھتے تب بھی اپنے باپ کو خبطی ہی سمجھتے۔ [1] اس لیے کہ باپ اپنے لڑکے کے بارے میں اکثر غلط رائے قائم کرتا ہے، اور غلط کو خبط کا ہم قافیہ قرار دے دیں جیسا کہ اکثر سننے میں آتا ہے تو غلط اور خبط ہم قافیہ اور ہم معنی دونوں ہو جاتے ہیں۔

---

1 ہم ایسی سب کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں.........

بیش تر والدین اس خبط میں مبتلا ہوتے ہیں کہ فلاں شخص کا لڑکا اگر کسی کی جیب بڑی صفائی سے کتر لیتا ہے تو میرا لڑکا اس کے کان اتنے ہی صفائی سے کیوں نہ کتر لے گا۔ اس سے مراد وہ بدنصیب ہے، جس کی جیب کتری گئی ہو نہ وہ جس نے جیب کتری ہو، میں نے بہت کم ایسے باپ دیکھے ہیں جو اپنی اولاد کی طرف سے کسی خبط میں نہ مبتلا ہوں۔ ان کے خبط کی منطق یہ ہوتی ہے کہ اولاد ہونے کے اعتبار سے ہر اولاد برابر اس لیے قابلیت میں بھی برابر اور خوش نصیبی میں بھی برابر، اور چوں کہ میرے بیٹے میں یہ مزید وصف ہے کہ وہ میرا بیٹا ہے اس لیے ہر بیٹے سے افضل ہے۔ اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ باپ بیٹے دونوں اس خبط میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ خود نہیں بلکہ دوسرا خبطی ہے۔ ان کو باتیں کرتے سنیے تو آپ کو یہ محسوس ہونے لگے گا کہ آپ بھی عنقریب خبطی ہوجانے والے ہیں۔

طالب علم بالعموم دو طرح کے ہوتے ہیں۔ کچھ خبطی بقیہ غبی۔ غبی وہ جن کے پاس رگرہ کی کچھ نہیں ہوتی۔ کورس کی ساری کتابیں ہوتی ہیں۔ دماغ اکثر غیر حاضر رہتا ہے۔ خود ہمیشہ کلاس میں رہتے ہیں۔ فیصلہ کی قوت سے زیادہ ہاضمہ کی قوت ہوتی ہے، پڑھنے لکھنے میں شوق کو نہیں خود آزادی کو دخل دیتے ہیں۔ وہ صرف اتنا ہی سیکھنا پڑھنا چاہتے ہیں جتنا روزی کھانے کمانے کے کام میں آئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کبھی بھی کسی خبط میں مبتلا نہیں ہوسکتے۔ ان کی ساری اُمیدیں دنیا سے وابستہ ہوتی ہیں دنیا کی کوئی اُمید ان سے وابستہ نہیں ہوتی۔

طالب علموں کا خبط کئی طرح کا ہوتا ہے۔ ان میں بیش تر کتابی خبطی ہوتے ہیں۔ جن کی طرف اس سے پہلے میں اشارہ کر چکا ہوں۔ بعض آرٹ، ادب وانقلاب کا خبط رکھتے ہیں، کچھ قوم کا خبط رکھتے ہیں۔ قوم کا بھلا دیکھ سکتے ہیں نہ بُرا۔ بقیہ خبطی بعینہٖ متفرقات ہوتے ہیں۔ اب میں جستہ جستہ ان خبطیوں کے اخلاق واطوار پر خطبہ دوں گا۔ میری مراد خبطی پر خطبہ ہے۔

کتابی خبطی سے میری مراد ان سے ہے جو کتاب پڑھ کر خبطی ہوجاتے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس طرح بعض طبائع کے لیے یا بعض امراض میں بہتر سے بہتر مقامات مضرِ صحت ہوتے ہیں۔ بعض بہترین کتابیں بعض طالب علموں کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ ہمارے بعض طلبا محض اس بنا پر تباہ ہوجاتے ہیں کہ وہ انسانوں سے زیادہ کتابوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ہر کتاب

ہر طالب علم کے لیے مفید نہیں ہوتی۔ کتابی خبطی قابلِ رحم خبطی ہوتا ہے۔ مجھے ہر خبطی سے محبت ہے، لیکن ان کے ساتھ ساتھ مجھے نمائشی یا مصنوعی خبطی سے اتنی ہی نفرت بھی ہے۔

دنیا کا دستور یہ ہے کہ سچے خبطی کو ہر طرح ستاتی ہے اور جھوٹے خبطی کی پرورش کرتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر بڑے شاعر، آرٹسٹ اور مصلح کے گرد بے شمار مصنوعی خبطی جمع ہو جاتے ہیں۔ دراصل یہ خبطی نہیں چھلیے ہوتے ہیں۔ یہ خبطی اس لیے بنتے ہیں کہ ان کی بے ہودگی یا نکمے پن کا محاسبہ نہ کیا جائے۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنی اس حرکت سے یہ دوسرے کی نظر میں اصطلاحاً محترم بنے رہتے ہیں۔ اس سے خوب نفع کماتے ہیں اور شریفوں کی آبروریزی کرتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی کے ہر شعبے میں ایسے چھلیے پاتے ہیں اور ان سے ایک اعلیٰ مقصد، ایک اعلیٰ شخصیت اور ایک اعلیٰ قدر کو جو نقصان پہنچتا ہے اس کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے کہ اس کا سبب یہ ہو کہ ہم خود جعلی خبطیوں کے زمرے میں آتے ہیں۔

آرٹ کا خبط دراصل آرٹ کا خبط نہیں ہوتا بلکہ اپنے آرٹ کا پروپیگنڈا ہوتا ہے اور "اپنا آرٹ" جن لوگوں کا جیسا کچھ ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ میں ایسے آرٹ کے سامنے سرخم کرنے کو تیار ہوں جس سے انسان کی عظمت و منزلت متعین ہوتی ہو، اور ایسے آرٹ کا بالکل قائل نہیں ہوں جس کی خصوصیت صرف اتنی ہو کہ میں یا آپ اس کے واضع ہوں، اور جس کی ہر کمزوری پر صرف اس لیے فخر کیا جائے یا اس کو نظر انداز کیا جائے کہ وہ میری یا آپ کی انفرادی کمزوری ہے۔ آرٹ میں انفرادیت یا جمہوریت کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر سفلہ یا ناکارہ آرٹ کو ہاتھ لگائے اور یہ دعویٰ کرے کہ ہمارا بھی آرٹ ہے، آرٹ خدائے فن ڈھونڈھتا ہے نکڑ گدوں سے اس کا کوئی علاقہ نہیں، اور خدائے فن محض ایک ووٹ سے خدائے فن کبھی قرار نہیں پاتا۔

میری قطعی رائے ہے کہ آرٹ میں انفرادیت اور جمہوریت کے خبط کی روک تھام ہونی چاہیے، اور وہ صرف اس طور پر ممکن ہے کہ جس طرح بڑی بڑی مجلسوں اور نمائشوں میں اس سال کے شاہ کار یا فن کار متعین کیے جاتے ہیں، ان کو شہرت دی جاتی ہے اور ان کو نوازا جاتا ہے، اسی طرح اس سال کے نالائقوں اور ان کے مُزخرفات کی بھی نمائش کی جائے، اور عینِ انصاف ہے، اگر ہر کس و ناکس کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ عظیم المرتبت شخصیتوں کو بے نور یا اپنی شخصیت کو اُجاگر

کرے تو اس کو اس بات پر بھی تیار رہنا چاہیے کہ نالائقی ثابت ہو جانے پر مردود قرار دیا جائے، اور عبرت کے لیے وہ یا اس کا شاہ کار خود وضاحتی طریقے پر کہیں لٹکا ہوا نظر آئے۔

ہندوستان میں قومی خبطیوں کی کمی نہیں۔ قومی خبطی سے مراد وہ لوگ ہیں جو قوم کو نہ اچھی حالت میں دیکھ سکتے ہیں اور نہ بُری حالت میں۔ قوم کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے مجھے بھی قوم کی خدمت کرنے کا خبط ہے، لیکن میں نے خدمتِ قوم کا خبط کسی ملازمت دلانے والی ایجنسی یا فوٹو کے تبادلے سے نہیں حاصل کیا ہے۔ میں نے اس کے لیے تھوڑا بہت لہو پانی کیا ہے، لیکن اس کا لحاظ رکھا ہے کہ تھوڑا کیا ہو، اور بہت کیا ہو، لہو کس کا ہو، پانی کس کا، کس وقت لہو کو گاڑھا رکھا جائے اور کس وقت پانی کو۔ جب تک لہو اور پانی کے ان تمام رشتوں کو پورے طور سے ذہن نشین نہ کر لیا جائے قوم کی کماحقہٗ خدمت نہیں کی جا سکتی۔ میں جھوٹ نہ بولوں گا۔ اس لیے کہ یہاں اور اس وقت سچ بولنے میں کوئی مضائقہ نہیں دیکھتا۔ میں قوم کے لیے سر کی بازی تو نہیں لگا سکتا، لیکن پگڑی کی بازی لگانے کے لیے آمادہ ہوں۔ باوجود اس کے کہ میں نے سر پر پگڑی استعمال نہیں کی ہے۔ میں اپنے ملک کی بڑی عزت کرتا ہوں اس لیے کہ دنیا میں میرا ہی یہ ایک ملک ہے جو اپنے خدمت گزاروں کو کبھی آزمائش میں نہیں ڈالتا اور خود ہمیشہ ہمیشہ سے آزمائش اُٹھاتا چلا آ رہا ہے۔ مجھ میں کوئی اور عیب نہیں سوائے ان عیبوں کے جو ہم قومی کارکنوں کے محاسن قرار دیے گئے ہیں۔ اگر قوم کا راس المال بننے کی مجھ میں اہلیت نہیں ہے تو بیت المال بننے میں کیا قباحت لازم آتی ہے۔

بات کچھ یوں ہے کہ زندگی کے اصول دو طرح بنتے ہیں، انجام پر نظر رکھ کر اور انجام سے بے نیاز ہو کر۔ ایک کو تجربہ کہتے ہیں دوسرے کو خبط۔ اکثر یہ دونوں اس طرح ملے جلے رہتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوتا ہے کہ کون کہاں ہے۔ شاید اسی لیے یہ بھی مانتے ہیں کہ سب کچھ کھو ڈالنے کے عمل کو خبط کہتے ہیں، اور سب کچھ کھو چکنے کے بعد جو باقی بچے اس کو تجربہ، اصولاً یہ ٹھیک ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اصولاً جو بات ٹھیک ہوتی ہے اس کے برتنے میں بڑی بے اُصولیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ پھر خبط کے معاملہ میں تو یوں بھی جو اصول کا قائل ہوا، لوگوں کو اس کے بارے میں بڑے شبہات ہونے لگتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ خبط کب خبط کو چھوڑ کر تجربہ کے حدود میں

داخل ہو جائے گا۔ یا کب تجربہ خبط کے لیے درس عبرت بن جائے گا۔ خاص طور سے ہمارے ہندوستان ایسے ملک میں جہاں جسم کم اور روحیں زیادہ نظر آتی ہیں۔

میری سمجھ میں کچھ ایسا آتا ہے کہ ہندوستان کی بزاعظمیت کی طرح اس کی روحانیت بھی جو بزاعظم ہی کے پیانے پر اس میں ملتی ہے اس کے لیے بہ یک وقت مفید بھی ہے اور مضر بھی۔ خیال اور عمل کے درمیان جتنی گہری خلیج یہاں ہے وہ کہیں اور ملنی مشکل ہے۔

یہاں اُصولوں کے قطب مینار بھی ملیں گے، تخیل کے تاج محل بھی، فن کے اجنتا بھی اور فطرت کے ہمالیہ بھی، لیکن ہے کچھ یہی کہ زندگی کی مدّھم حزینہ لے ان سب سے بے نیاز اور سب سے الگ تھلگ افلاس، بے عملی اور ناکامی کے شکستہ و آزردہ تاروں میں کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔ یہاں سورج بہت چمکتا ہے، لیکن پانی بھی بہت برستا ہے اس لیے پیٹ میں آگ لگی ہونے کے باوجود آنکھوں میں ہریالی چھائی رہتی ہے۔ یہاں ہر دن ایک ہی طرح سے شروع ہوتا ہے اور ایک ہی ڈھنگ سے ختم ہوتا ہے۔ زمانہ بدلنے میں صدیاں لگتی ہیں۔ ماضی کی پناہ ڈھونڈھتے ہیں۔ مستقبل پر عمل کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ اس طور پر ماضی تو درکنار مستقبل بھی ان کے ہاں ماضی ہی بن کر آتا ہے۔ اس سے اس میں کاہلی، قناعت، بے کسی اور مایوسی آگئی ہے، اور ان سب نے گڈمڈ ہو کر ان کو دو چیزوں کا بڑا معتقد بنا دیا ہے، ایک خبط دوسرا مذہب!

آپ کے کہنے سے یہ مان لوں گا کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں، لیکن اگر خواص کے بھڑکانے سے عوام نے یا عوام سے ووٹ حاصل کرنے کے لیے خواص نے آپ کی جان و آبرو کی دھمکی دی تو پھر ان دونوں کو ایک دوسرے سے علاحدہ رکھوں گا، لیکن اتنا تو ماننا پڑے گا کہ ہمارے ہاں ہر خبط کی اس طرح پرستش ہوتی ہے جس طرح فرانس میں عورت، امریکہ میں دولت، روس میں انقلاب، انگلستان میں گنجے سروں، جاپان میں شہنشاہ اور جمہوریت میں نردوں کی!

خبط دراصل حوصلے کی اُڑان اور عمل کی اس تازہ کاری کا نام ہے جس سے انسانی کارناموں کی طویل داستان میں ربط اور تسلسل پیدا ہوتا ہے، اور اس میں جان پڑتی ہے۔ یہ زندگی کا طوقِ گلو افشار نہیں، زندگی کی بازی ہے، جس کو ہار جیت سے سروکار نہیں۔ یہ مردانِ کار کے کندھوں کو

کچھ نہ کچھ کر گزرنے اور کرتے رہنے کے بوجھ سے گراں بار رکھتا ہے۔ اس کی جبیں بڑی سرکش و بے باک، اس کا تصور بڑا توانا اور چالاک، اس کے اعضا بڑے مطمئن اور لاپروا ہوتے ہیں۔ اس کا سرمایہ مستقبل کے وہ خواب ہوتے ہیں جو اُسے گھڑ دوڑ کے کھلے میدانوں تجارت کی بھری منڈیوں، نہنگ وصدف کے اتھاہ سمندروں، عشق کے حسین خارزاروں، سیاست کی دلدلوں اور شعروادب کی سکون بخش وادیوں میں کشاں کشاں لے جاتے ہیں، اور زندگی یا اس کے انجام پر غور کرنے کی مہلت دیے بغیر چپکے چپکے یقین دلاتے ہیں کہ یہی زندگی ہے جو اپنی ابتدا اور انجام بتائے بغیر خود اپنا انعام ہے۔

شاید اسی لیے انسانی تاریخ نے اپنا فرض خیال کیا ہے کہ وہ اپنے تمام خبطیوں کی یاد ہم مراقیوں کو دلاتی رہے۔ ان خبطیوں کی یاد جو نپولین و چنگیز کی طرح خوب خوب کھیلے اور خوب خوب ہارے۔ یا نیٹشے اور اقبال کی طرح ایک لامحدود اور مضطرب روح کی بازی لگا کر زندگی اور زمانہ کے لیے ایسی آیات و ہدایات چھوڑ گئے جن کو بار بار نئے نئے روپ میں نت نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ زندگی دُہرائے گی مگر کہے گی ان کو خبطی ہی!

خواب اور خواب دیکھنے والوں سے انتقام لینے کا دنیا کو عجیب خبط ہے۔ اسی کو انسان اور زندگی کی جنگ کہتے ہیں۔ بہت سے لوگ اس سے ڈر جاتے ہیں اور زندگی سے مصالحت کر لیتے ہیں، لیکن تاریخ و تجربہ شاہد ہیں کہ زندگی سے مصالحت کرنے والوں کو سب سے پہلے چھوڑ دینے والی اور پھر کبھی نہ ان کو منہ لگانے والی خود زندگی ہی ہوتی ہے، لیکن بعض سر پھرے ایسے ہوتے ہیں جو زندگی سے دبتے نہیں، جو نہ زمین کی سختی سے مرعوب ہوتے ہیں اور نہ آسمان کی دوری سے۔ زندگی کو ان سے اور ان کو زندگی سے بڑی لاگ ہوتی ہے۔ زندگی کی ساری پیش بندیاں، دنیا کے اہم ترین تقاضے اور وقت کے گوناگوں مطالبات ان کے خبط پر قبضہ نہیں پاسکتے۔ ان کو ناکام بتایا گیا ہے اور خبطی بھی!

خبطی کو منزل کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ سفر کے مناظر ہی میں سے اپنے لیے رنگ برنگے خواب تراشتا جاتا ہے۔ اچھے سنگ تراش کی طرح جو ہر پتھر میں اپنی تخلیق کا عکس اور اس کے تمام نقوش نمایاں طور پر دیکھ لیتا ہے۔ اسے کسی چیز کا یقین نہیں ہوتا، لیکن اس کے جنوں کی سزاوار تقریباً

ہر چیز ہوتی ہے۔ وہ اپنے تخیل سے محبت کرتا ہے کیوں کہ اس تصور کے شیش محل ہی میں زندگی کرنا
یکِ شب تاب بن کر نئے نئے پہلوؤں سے طرح طرح کی رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔
اس کے لیے دنیا بے وقوف کی جنت ہو یا نہ ہو، دیوانہ کا خواب ضرور ہے!

(نشریہ 15/ اکتوبر 1945۔ مطبوعہ ساقی، دہلی۔ جنوری 1946)

●●●

کنوار پنا اور شادی

اکبر مرحوم نے ایک جگہ اس بات پر اظہارِ افسوس کیا ہے...... لیکن ذرا ٹھہریے پہلے میری سُن لیجیے۔ اکبر وہاں ہیں جہاں سے کہیں اور نہیں جاسکتے میں جلد ہی وہ سب بھول جاؤں گا جو کہنا چاہتا ہوں، میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جو بات میری سمجھ میں نہیں آتی اس پر میں بڑے شوق و قابلیت سے گفتگو کرتا ہوں اور میری تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ نہ صرف وہ بات جو میں کہنا چاہتا ہوں، آپ کی سمجھ میں نہ آئے بلکہ آپ دو چار وہ باتیں بھی بھول جائیں جو پہلے سے جانتے ہوں۔ میری اس بدعادت سے آپ خوب واقف ہیں اور میں بھی آپ کی اس کمزوری سے ناآشنا نہیں ہوں کہ آپ جتنا کسی بات کو نہ سمجھیں گے اُتنا ہی اُس پر وجد کریں گے۔ فریقین کی اس کمزوری سے یہ ریڈیو والے فائدہ اُٹھاتے ہیں!

میں کنوار پنے اور شادی کے حالات و حوادث پر آپ کے سامنے تجرباتِ عالیہ پیش کرنے کے لیے مامور کیا گیا ہوں۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ آپ کنوار پنے کے حالات اور شادی کے حوادث سننا چاہتے ہیں یا کنوار پنے کے حوادث اور شادی کے حالات، لیکن قبل اس کے کہ آپ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے بیٹھیں اور مجھ سے جواب نہ بن پڑے تو میں ذہن پر توجہ ڈال کر کوئی ایسی بات کہہ دوں جو جواب سے زیادہ معقول ہو۔ یعنی کسی اور بات کا جواب ہو۔ میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ کنوار پنا اور شادی نہ کوئی حال ہے نہ کوئی حادثہ۔ یہ صرف حلیہ ہے مثلاً "صورت بہیس حالت مپرس"!

تو صاحبو بقول میر امن اس فقیر کا احوال یہ ہے کہ لڑکیوں نے مجھے شوہر منتخب کرنے میں بڑی دیر لگادی اور جس نیک بخت نے میرا انتخاب کیا خود اُس نے خطرناک عجلت سے کام لیا۔ یہاں تک تو کوئی ایسی بات نہ ہوئی جس سے آپ آب دیدہ ہوں ستم ظریفی یہ ہوئی کہ اس عجلت کے عواقب بجائے اس کے کہ فریق ثانی بھگتے مجھے بھگتنے پڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کنوار پنے کا مورّخ تو میں رہا اور شادی کی ماہر میری بیوی بنیں۔ جس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم دونوں میں سے ایک صرف ''باران دیدہ'' ہے اور دوسرا صرف گرگ، الف دنشر کی کوئی قید نہیں!

یہی وہ مقام ہے جہاں اکبر سے رجوع کرنا ضروری ہے۔ مرحوم کا تعارف ابتدائے گفتگو میں، میں اس لیے کرانا چاہتا تھا کہ مرحوم نے اس بات پر افسوس کیا ہے کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی یہ بڑی خیریت ہوئی کہ مرحوم کو فرعون ہی کے ذریعہ بچوں سے دلچسپی پیدا ہوئی، وہ بھی کالج کو دیکھ کر، اگر وہ آج زندہ ہوتے جب کالج سے زیادہ یونیورسٹیاں وجود میں آ رہی ہیں تو میرا خیال ہے کہ اکبر کو کہیں زیادہ افسوس اس بات کا ہوتا کہ مزوک کو کنوار پنے کی کیوں نہ سوجھی۔ یہ دونوں باتیں ہو جاتیں تو نہ فرعون بچوں کے قتل پہ بدنام ہوتا نہ مزوک بچوں کے بے ننگ و نام ہونے یا کرنے پر۔

فرعون کی مصیبت یہ تھی کہ وہ ہر بچے کی اُٹھان میں وہ چیز دیکھ لیتا تھا جو بوڑھوں کو نوجوان سے ڈرنے یا بدگمان ہونے پر مجبور کرتی ہے یعنی یہ خیال کہ اُس کا کل آج سے اچھا ہوگا، اور میرا کل آج سے بُرا! فرعون کو باپ بننے کا شرف یا ننگ نصیب ہوتا تو اُسے معلوم ہوتا کہ کس طرح باپ اپنے دیے سے بیٹے کا دیا روشن کرتا ہے اور بیٹے کی طاقت اور صلاحیتوں میں خود اپنی تکمیل کے پہلو دیکھتا ہے اس طرح اپنے بچے کے ذریعہ دنیا کے سارے بچوں سے محبت کرنے لگتا ہے۔ مگر فرعون کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی، اس لیے مصر کی تاریخ کے معمار بنی اسرائیل ہو گئے۔

مزوک کو یہ غلط فہمی تھی کہ شادی کے بغیر کنوار پنے کو شادی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے یہ ایسی ہی غلطی تھی جیسے زندگی کو آسان بنانے کے لیے کوئی پیدائش کے بعد موت کا سب سے سہل ذریعہ ڈھونڈھنا شروع کردے۔ زندگی نہ پیدائش ہے نہ موت وہ ان دونوں کا درمیانی وقفہ ہے۔ اس وقفہ، اس ابتلا، اس سرد و گرم اور اس نشیب و فراز ہی کو انسانی زندگی کہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح

مسئلہ دراصل کنوار پنے یا شادی کا نہیں ہے، بلکہ اس عجیب وغریب راستہ کا ہے، جو کنوار پنے سے شادی اور شادی سے پھر کنوار پنے تک ایک دائرہ میں گھومتا رہتا ہے جو فرسودہ ہو کر بھی دلچسپ ہے اور دل دوز ہو کر بھی دل کش! مزوک کی نظر یا تو اس حقیقت پر نہ تھی، یا پھر اُس کے نظر انداز کرنے ہی میں اُسے اپنی اور اپنے فلسفہ کی خیر نظر آئی ورنہ انسان کو صرف پانے ہی کی خواہش نہیں ہوتی، کھونے کا بھی حوصلہ ہوتا ہے۔ ہم کو منزل ہی سے دلچسپی نہیں ہوتی سفر اور زادِ راہ سے بھی دلچسپی ہوتی ہے، راستہ کے نشیب و فراز مناظر کی بوقلمونی، راہ کی ہدایت، رہ گزر کا فریب ان سب کا جداگانہ عالم ہوتا ہے اور جداگانہ کشش۔ مزوک ان کو کیا سمجھتا! "غریب نے پی ہی نہ تھی۔"

مزوک کو فرعون کے مقابلہ میں رکھ کر دیکھیے تو انسانی فطرت کے ایک عجیب راز سے پردہ اُٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے، اجتماعی خوشی کی تلاش میں مزوک ایران کے جن کوہستانوں سے سرمارتا رہا وہاں شوہر یا شوہریت کا تصور ایک مہیب دیو کی طرح اُس کا پیچھا کرتا رہا۔ فرعون کو انفرادی تسکین کی آرزو مصر کے جن ریگ زاروں سے خون کا خراج طلب کرنے پر مجبور کرتی رہی وہاں باپ کے وحشی انتقام کی گونج سے اُسے نجات نہ مل سکی، دوسری طرف ان دونوں سے بے نیاز، ایران کے کوہستان اور مصر کے ریگ زار ان دونوں کی اس بے معنی جستجو کا مذاق اُڑاتے رہے یہاں تک کہ ایران کی وادیوں میں حسن وعشق کی ابدی کش مکش نے مزوک کو رُوپوش ہونے پر مجبور کر دیا اور نیل کی موجیں لاولد فرعون کے محل میں ایک بچے کے پہنچانے کے بعد خود فرعون کو نگل گئیں!

یہاں پر یہ سوال اُٹھانا تحصیل حاصل ہے کہ اُن کی کہانیاں کتنی مختلف ہوتیں اگر مزوک کو شوہر ہونا نصیب ہوتا یا فرعون کو باپ ہونا۔ البتہ اس سے آپ یہ اندازہ ضرور لگا سکتے ہیں کہ کنوار پنے اور شادی کے سلسلہ میں بچوں کا ذکر کتنا ناگزیر ہے! کچھ تو یوں کہ کنوار پنے کی معراج بچپن ہے اور شادی کی معراج بچے، ظاہر ہے دونوں حالتوں میں سے کسی ایک میں بھی بچوں یا بچپن سے مفر نہیں، اور کچھ یوں کہ ہم اس واقعہ کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ کم سے کم ہندوستان میں، فضیحتے اور اولاد کے علاوہ شادی بیاہ کا کوئی اور نتیجہ نظر نہیں آتا۔ شاید اسی لیے یہاں کا دستور ہے کہ لوگ "آپ کیسے ہیں؟" کے ساتھ ساتھ یہ پوچھنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ "بیوی بچے کیسے ہیں؟"!

اس سلسلہ میں جی چاہے تو ایک ذاتی سی بات بھی سن لیجیے کہ یہ سارے نتائج میں نے کچھ یوں ہی نہیں نکالے ہیں بلکہ بقول ریڈیو والوں کے یہ اور وہ یعنی کنوار پن اور شادی دونوں کو دیکھ کر، لیکن اک ذرا فرق کے ساتھ یعنی کنوار پنا میں نے اُس وقت دیکھا جب کنوار پنے سے بہتر دیکھنے کی چیزیں موجود تھیں اور شادی اُس وقت کی جب آپ سب کچھ دیکھ سکتے تھے سوا اپنی ہونے والی بیوی کے! ضمناً یہ بھی کہہ دینا بے محل نہ ہوگا کہ ان دونوں پر گفتگو اس وقت کرنی پڑ رہی ہے جب ہندوستان میں کنوار پن اور شادی کے نہیں بلکہ خوراک اور خلع کے مسائل زیرِ بحث ہیں!

ان حالات کے ماتحت کچھ بہکنے کو جی چاہتا ہے یوں بھی کنوار پنے اور شادی کا تذکرہ ہو تو بہکنے کی نہیں تو بہکانے کی تھوڑی بہت آزادی ملنی چاہیے۔ اس آزادی پر یاد آیا کہ ہم مجبوروں پر جہاں اور بہت سی تہمتیں ہیں وہاں ایک مختاری کی بھی ہے، جس کی حقیقت کم و بیش وہی ہے۔ یعنی جو خود مجبوروں نے زندگی کی قرار دی ہے یعنی "جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا۔" یہاں مجھے اعتراض خدا یا ناچاری پر بالکل نہیں ہے، کیوں کہ ایسے عاشق صفت مجبوروں سے خدا خود ناچار رہتا ہوگا۔ میرا اعتراض تو صرف اس دیکھنے پر ہے۔ ذرا یہ ستم ملاحظہ ہو کہ خدا کو دیکھنے کا تو حوصلہ ہے، لیکن جو خدا دکھائے اُس سے گلہ ہے۔ ان مسخروں سے کون کہے یہ مظاہر فطرت، یہ زمانہ کے سرد و گرم، زندگی کے یہ متنوع تقاضے یہی سب تو خدا ہیں جس طرح سارے درخت خود جنگل ہوتے ہیں اور ساری کمزوریاں خود انسان خدا کی تلاش تو کچھ اس قسم کی معلوم ہوتی ہے جیسے دلی میں کھڑا ہو کر کوئی یہ سوال کرے کہ "صاحبو، ہندوستان کا راستہ کدھر سے ہے؟"

میں تو کچھ ایسا سمجھتا ہوں کہ تلاش بجائے خود ایک فریب ہے۔ جستجو جن چیزوں کو حجاب قرار دیتی ہے وہی فطرت کی بے حجابی کی ممتاز مثالیں ہوتی ہیں۔ فرق نظر کا نہیں انداز نظر کا ہے۔ بدتوفیقی جن باتوں کو زندگی کی محرومیاں قرار دیتی ہے، خوش طبعی انھیں کو قائم فطرت میں شمار کرتی ہے۔ دنیا کی شامت یہ نہیں ہے کہ لوگ بہت سی چیزوں کو دیکھنے برتنے سے محروم رہ جاتے ہیں بلکہ یہ کہ بہت سی چیزوں کو دیکھنے برتنے کے بعد بھی حوصلہ و ہوس میں تمیز نہیں کر سکتے۔ جو چیز میسّر نہیں اسے اپنی آنکھوں اور آرزوؤں کی آماجگاہ بنائے رہتے ہیں اور وہی چیز مل جائے تو اس سے انصاف

نہیں کرتے اور اس کی توہین کرتے ہیں۔ جسے دیکھتے نہیں اُسے خدا سمجھتے ہیں اور جسے دیکھ لیتے ہیں اُسے محض انسان شاید اس دریا کو کسی نے یوں کوزہ میں بند کیا ہے:

کنواری کو ارمان، بیاہی پشیمان!

کنواری کے ارمان بیاہی کی پشیمانی میں کیوں بدل جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جن میں انسانی زندگی کی داستان ہی نہیں اُس کا مقصد، اُس کی دل آویزی اور اُس کی تازگی بھی پوشیدہ ہے۔ یہ سوال حل ہو جائے تو وقت کے بے پناہ پہیے کی گردش میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں فرسودہ بے کیف و بے رنگ ہو جائیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ اہم یہ بات نہیں ہے کہ کیا دیکھا بلکہ یہ کہ کس نے دیکھا۔ عشق اور نفسیات دونوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے دبستانِ فکر تو بے شمار ہیں، لیکن بحیثیت علم و فن یہ کچھ بھی نہیں۔ نفسیات کو ایک علم کی حیثیت حاصل ہے، لیکن اس کے نظریے کس قدر مختلف، متعدد اور متضاد ہیں۔ ہر مفکر نے اپنی راہ الگ بنائی ہے اور اپنے مخصوص رجحان کو علم النفس کے اصول سمجھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ فن تو جہاں کا تہاں ہے صرف فن کار کی شخصیت فن کی آبرو بن گئی ہے۔ عشق کا بھی یہی حال ہے بذاتِ خود عشق کچھ نہیں قیس و فرہاد کی روایات کیسی بھی کیوں نہ ہوں، عشق کی نوعیت اور اس کے رنگ و آہنگ میں ہر عاشق کے ساتھ انقلاب آتا رہتا ہے۔ شخصیت کا یہ کارنامہ جو عشق و نفسیات دونوں کو توانائی بخشتا ہے، زندگی میں بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ زندگی میں کیا دیکھا اور کتنا دیکھا ضمنی باتیں ہیں قابلِ توجہ صرف یہ ہے کہ کس نے دیکھا اور کس طرح دیکھا!

یہاں پر میں نے نفسیات و عشق دونوں کا تذکرہ ایک ہی سانس میں اس لیے کر دیا کہ گفتگو میں خلطِ مبحث نہ ہو، اور آگے چل کر "نفسی نفسی" کی نوبت نہ آئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سننے والوں کی برادری میں کنوارے اور شادی شدہ دونوں ہوں گے اور دونوں مجھے شریف اور اپنے آپ کو مظلوم سمجھ کر یہ توقع کرتے ہوں گے کہ میں ایسی باتیں کروں گا جن سے ان کو تسکین یا تقویت پہنچے گی۔ خواہ اس قسم کی بات کرنے سے خود میری رہی سہی تسکین و تقویت بقول بعض "فوت" ہو جائے۔ میرے ایک بڑے مخلص دوست اس لفظ کو اکثر ایسے موقع پر اور کچھ ایسی گولائی سے ادا کرتے ہیں کہ مجھے بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ ایک دن تقریر کے دوران میں فرمایا کہ "جب میرا باپ فوت ہو گیا۔"

میں چونک پڑا اور بولا۔

''جناب ایسا ہو نہیں سکتا۔''

فرمایا۔

''نہیں جناب باپ فوت ہو گیا۔''

میں نے کہا۔

''ممکن ہے آپ کو غلط یاد ہو، کسی اور کا باپ فوت ہوا ہو'' لیکن وہ نہ مانے اور کچھ اس طور سے تیور بدلے کہ مجھے اپنے فوت ہونے کا اندیشہ ہونے لگا۔ میں نے دوست کی بات مان لی اور یہ کہہ کر معذرت چاہی کہ ''حضرت ممکن ہے میں ہی غلطی پر ہوں البتہ اتنا جانتا ہوں کہ فوت کے تلفظ سے جس مرض کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے وہ کچھ ایسا مہلک ہوتا نہیں! لیکن آپ یقین مانیں فوت کو کنوارے پنے اور شادی کی بحث سے کوئی تعلق نہیں!''

میری شادی نہیں ہوئی تھی (اور اب تو مجھے شبہ سا ہوتا ہے کہ کبھی ایسا بھی کوئی زمانہ تھا جب میں شادی شدہ نہ تھا) اور عزیزوں میں سے کہیں سے خبر آتی کہ کوئی مولود سعید تشریف لائے ہیں تو مجھے تعجب ہوتا کہ آخر یہ ہوا کیسے؟ عزیزوں میں بعض نوعمروں کے اور بعض خاصی عمر کے جن کے پہلے سے بچے موجود ہوتے۔ نوعمروں کے بارے میں تو اس پر تعجب ہوتا کہ اتنا بڑا کارنامہ اُن سے کیوں کر سرزد ہوا۔ جب وہ مجھ سے کسی بات میں قطعاً ممتاز نہ تھے بلکہ بہت سی باتوں میں مجھ سے کم درجہ کے تھے اور جن کے پہلے سے بچے ہوتے اُن کے بارے میں یوں کچھ اچنبھا نہ ہوتا کہ شاید یہ موجودہ بچوں ہی میں سے کسی ایک کو دوبارہ گن لیا ہوگا یا اُن کی پیدائش کی یاددہانی کی ہوگی اور اس میں بات ہی کیا ہوئی جس نے ایک بچہ پیدا کر لیا وہ سینکڑوں بچے پیدا کرے یہ نہ فخر کرنے کا کوئی موقع ہے نہ ڈوب مرنے کا مقام۔

ولادت کی خبر سن کر اب نہ اچنبھا ہوتا ہے نہ مسرّت۔ البتہ یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ ولادت نہ مولود کا کوئی کارنامہ ہے نہ والدین کا۔ کچھ تو یوں کہ اس میں کسی کا دخل نہیں ہے سوا ہو جانے کے اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں ہے اور کچھ یوں کہ جب چالیس کروڑ انسانوں کے اس جنگل کا خیال آتا ہے جس میں جہالت اور افلاس کا جال، گندگی اور کاہلی کا تعفن، بے حسی اور بے زاری کی

ذلدل، غلامی اور ظلم کے درندے ہر طرف، علم، شرافت اور محبت کا گلا گھونٹ رہے ہوں تو ذرا دیر کے لیے ہندوستان کی آبادی میں اس اندھا دُھند بدحواسی کے ساتھ اضافہ کرنے والوں کے بارے میں کچھ اچھی رائے دینا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اس ملک میں سب سے زیادہ مشکل کام بن بیاہا رہنا ہے اور سب سے آسان عشق کرنا۔ عام طور سے یہ عشق مجاز سے شروع ہو کر حقیقت تک جاتا ہے۔ وہ مجاز اور وہ حقیقت نہیں جس پر تصوف کی بنیاد رکھی جاتی ہے بلکہ وہ مجاز جو شعر و افسانہ کے وسیلہ سے دل و ذہن میں بار پاتا ہے اور وہ حقیقت جو زندگی کے واقعات اور تخیل و عمل کے تصادم سے پیدا ہوتی ہے اور توکل و بے عملی کا مذاق اُڑاتی ہوئی رومان اور طلسم کے گھروندے مسمار کر دیتی ہے۔ یاں محبت کسی چیز سے نہیں بلکہ محض تصوّر سے کی جاتی ہے۔ یہاں نہ بچپن ملتا ہے نہ شباب، ہاں تھکی تھکی سی یا بوڑھے دماغوں سے نکلی ہوئی ان چیزوں کے متعلق شاعری ضرور ملتی ہے۔

یہاں، جو کنوارے ہیں وہ اپنے آپ کو شہید شباب سمجھتے ہیں اور اپنی زندگی کی زہرناکیوں میں دنیا سے انتقام لینے کا منفعل احساس پا کر اک گونہ بے خودی یا بے بسی ہی کو حاصل حیات سمجھتے ہیں۔ حاصلِ حیات ہی نہیں حاصلِ شعر و ادب بھی۔ وہ مایوسی اور بے زاری کو غم گیتی سمجھتے ہیں اور غریب شیلے کو رُسوا کرتے ہیں جس نے کہا ہے کہ ''ہمارے سب سے شیریں نغمے وہ ہیں جو سب سے زیادہ غمگین ہوں۔'' یہ شادی کر لیتے ہیں تو ان کو یہ معلوم کر کے سخت مایوسی ہوتی ہے کہ وہ جس کو عورت سمجھ رہے تھے وہ بھی انسان ہی نکلی۔ نہ وہ حریر و پرنیاں ہے نہ شبنم کے قطرہ میں مچلتی ہوئی کوئی معصوم کرن۔ اُسے بھی بھوک پیاس لگتی ہے۔ وہ بھی دل و دماغ رکھتی ہے اور برابری اور مقابلہ کا دعویٰ کرتی ہے۔ اسی لیے ناہید و نجمہ کا پجاری یا تو بچ مچ کا پجاری ہی بن جانے میں اپنی عافیت دیکھتا ہے یا پھر مقدس دیوتا بن بیٹھتا ہے جس کا حکم اٹل اور جس کے چشم و اَبرو سے سرتابی محال۔ وہ برابری اور ہم آہنگی جو ازدواج کی معراج ہے اور جسے زندگی کی صحیح معنوں میں رفاقت کہہ سکیں معدوم ہے۔ اسے حاصل کرنے کی نہ کوشش کی جاتی ہے نہ بیش تر افراد میں اس کا کوئی واضح تصوّر یا احساس ملتا ہے۔ وہ مبہم بے اطمینانی جو زندگی کے ہر شعبہ میں پائی جاتی ہے یہاں بھی ملتی ہے، لیکن کنوار پن کے سنہرے سپنے شادی کے سورج کی تاب نہ لا کر

خواب پریشان کیوں بن جاتے ہیں اس کا بے لاگ تجزیہ کرنے کی نہ ضرورت سمجھی جاتی ہے نہ ہمت کی جاتی ہے۔

شادی نہ کرنے والوں یا شادی کے نام سے گھبرانے والوں کی نفسیات بڑی دلچسپ ہوتی ہے اُن میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو کنوار پن کا بھیس بدل کرتماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں، اور ایسے بھی جو شادی کو خانہ ہو یا نہ ہو، آبادی اور اُس میں اضافہ کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔

میرا خیال ہے اس دنیا میں بہت کم ایسے مرد اور عورتیں ہوں گی جو اپنے کنوار پنے کو بڑے ارمانوں سے یاد نہ کرتے ہوں یا شادی پر کسی نہ کسی حد تک تاسف نہ کرتے ہوں۔ یہ بات کنوار پنے اور شادی ہی پر صادق نہیں آتی بلکہ نوعمری کا وہ زمانہ جب ذمہ داریاں کم اور ولولے زیادہ ہوتے ہیں اس زمانہ سے زیادہ دل کش محسوس ہوتا ہی ہے جب ذمہ داریاں زیادہ اور ولولے کم یا بالکل غائب ہو جاتے ہیں۔ ذمہ داری کم ہو تو بے فکری بڑھ جاتی ہے، لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اچھی زندگی کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ مرد یا عورت صرف ایک دوسرے سے عشق کرنے میں مبتلا رہیں یا عشق کے مطالبات کو پورا نہ کر پائیں تو شریفوں پر جینا حرام کر دیں۔ جنسی مطالبات اتنے اہم نہیں ہوتے جتنا ہمارے افسانہ نگار سمجھتے ہیں اور نہ وہ جنت کوئی معنی رکھتی ہے جو ہم اپنے اپنے ذہن میں بنانے کے عادی ہیں۔ حقیقی زندگی وہ ہے جس کی تعمیر ہم خود کر سکیں نہ وہ جس کا ہم صرف خواب دیکھتے رہیں۔ خواب کی دنیا بہت اچھی سہی، لیکن یہ وہ دنیا ہے جس کو انسان تو کیا شاید خدا نے بھی بنانے کی زحمت گوارا نہ کی۔

اسی لیے میں وہی دنیا پسند کرتا ہوں جو میرا حوصلہ مجھے دے سکے نہ وہ جس کو میری ہوس کبھی نہ پا سکے، خواہ وہ دنیا کنوار پنے کی ہو یا شادی کی۔ مرد ہو یا عورت شادی یا محبت اپنے بُوتے پر کرنا چاہیے نہ اس پر کہ دوسرا کیا ہے یا کیسا ہوگا۔

اپنی خوبیوں پر اعتماد کرنا چاہیے۔ اپنی نارسائیوں پر نہ رونا چاہیے نہ رُلانا!

(مطبوعہ کانفرنس گزٹ، علی گڑھ۔ 6رجون 1946)

●●●

مانگے کی کتابیں پڑھنا

میں امتحان کے کمرے میں شریکِ امتحان اُمیدواروں کی نگرانی پر مامور تھا کہ ریڈیو کا وہ دعوت نامہ پہنچا جس کے موضوع سے اناؤنسر صاحب نے آپ کو مطلع کیا ہے یعنی مانگے کی کتابیں پڑھنا بھی ایک فن ہے! میں جہاں تھا وہاں مانگے کی کتاب ہو، اپنی کتاب ہو یا آپ نے اسے کہیں سے چرائی ہو ان سب کا پڑھنا، رکھنا یا ان سے کسی قسم کی تفریح یا طبع آزمائی فن بھی ہے جرم بھی۔ اگر آپ پکڑے جائیں تو جرم، سزا پا جائیں تو مجرم، نہ پکڑے جائیں تو فن اور چھوڑ دیے جائیں تو فاتح۔ اب اگر آپ کے ذہن میں یہ بات آئے کہ جرم اور فن یا مجرم اور فاتح میں کوئی ایسا فرق نہیں ہے تو میں آپ کو مبارک باد دوں گا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ مشورہ بھی کہ آپ ان تفریقوں میں نہ پڑیں اس لیے کہ جو لوگ قانون سے واقف یا قضا و قدر پر اعتماد رکھتے ہیں وہ یہ نہ دیکھیں گے کہ آپ فن کے امام ہیں یا قضا و قدر کے شکار۔ وہ تو صرف اس امکان پر یقین کریں گے کہ آپ میں ایسی صلاحیتیں ہیں جو جرم اور فن دونوں کے لیے خطرہ یا عبرت ہیں۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں آپ کی طرف سے آپ کا ہر خیر اندیش متفکر ہوگا!

میرا خیال ہے کہ آپ نے کسی سے کتاب مانگی ہو یا نہیں سفر ضرور کیا ہوگا۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ خود آپ نے کسی سے کتاب مانگی ہوگی البتہ یہ یقین ہے کہ ہم سفروں میں سے کسی نہ کسی نے آپ سے کتاب یا اخبار ضرور مانگا ہوگا۔ ہم سفروں کی ہر بدتمیزی کسی نہ کسی مصلحت سے میں

برداشت کر لیتا ہوں خواہ اسے غسل خانہ استعمال کرنے کی بھی تمیز نہ ہو، لیکن جو بات میرے لیے برداشت سے باہر ہے وہ یہ کہ کوئی شخص میری کتاب یا اخبار مانگ بیٹھے اس لیے کہ میں اس کی اس حرکت سے جتنا بدحظ ہوتا ہوں اتنا ہی جلد اسے کتاب یا اخبار دے دیتا ہوں اور پھر دل ہی دل میں کڑھنے لگتا ہوں کہ خدا کرے یہ گاڑی آگے چلنے کی بجائے جہاں کی تہاں پھرکی کی طرح بے اماں تیزی کے ساتھ چکر کاٹنے لگے اور اس وقت تک چکر کاٹتی رہے جب تک یہ گاڑی اور اس کے تمام مسافر ریڈیو ایکٹو ہو کر سورج کا ایک داغ نہ بن جائیں۔

یہ ناممکن ہے کہ آپ ریل میں کوئی چیز پڑھ رہے ہوں یا آپ کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس کے پڑھے جانے کا امکان ہو اُسے کوئی دوسرا مانگ نہ بیٹھے۔ فرض کیجیے آپ نے اپنے جوتے کسی چھپے ہوئے کاغذ میں لپیٹ لیے ہوں اور جب فرض کرنا ہی ٹھہرا تو تھوڑی دیر کے لیے اتنا اور فرض کر لیجیے کہ آپ ضرورتاً اُسی کاغذ پر دہی بڑے بھی رکھ کر چاٹ رہے ہوں اور فارغ ہونے کے بعد اُسی کاغذ کو پڑھنا شروع کر دیں تو کوئی نہ کوئی ضرور ایسا مل جائے گا جو اس کاغذ کو غلط انگریزی بول کر آپ سے مانگ لے گا اور آپ صحیح اردو میں اپنے کو گالی یا مشتبہ عربی فارسی میں بددعا دے کر کاغذ حوالہ کر دیں گے۔

یہ مرض اس درجہ عام ہے کہ اگر کوئی ایسے صاحب ڈبے میں وارد ہوں جنھوں نے تمام عمر دو اسٹیشنوں سے زیادہ تک کا (جن میں ایک فلیگ اسٹیشن بھی ہوگا) ٹکٹ لے کر سفر نہ کیا ہوگا اور آپ کے پاس سارے ہندوستان کا ٹائم ٹیبل بریڈشا رکھا ہو تو وہ آپ کی اجازت کے بغیر اُٹھا لیں گے اور بڑی توجہ سے اس کا مطالعہ اس طور سے شروع کر دیں گے جیسے ان کو یہ دیکھنا ہے کہ کون سی گاڑی ان کو جلد سے جلد ایسے مقام پر پہنچا دے گی جہاں سے وہ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر پیکائی جھیل پہنچ جائیں گے۔ جہاں وہ ٹھیک وقت سے نہ پہنچے تو اس کا اندیشہ ہے کہ ایٹم بم کے ریڈیائی اثرات اقوام متحدہ کے تخن وران کامل کے فکرِ تخن میں خلل انداز ہوں گے!

میرا تو جہاں تک خیال ہے کہ آپ دہی بڑے کا خونچا پتہ ہاتھ میں اُٹھائیں اور اس کا غور سے مطالعہ شروع کر دیں تو کوئی نہ کوئی اسے بھی ضرور مانگ بیٹھے گا اور آپ کتنا ہی عذر کیوں نہ کریں کہ آپ ملیریا میں مبتلا ہیں اور ایک سیانے نے کوئی نقش پیپل کے پتے پر لکھ کر دے دیا ہے کہ

باری کے دن اسے بغیر ادھر اُدھر توجہ ہٹائے غور سے دیکھتے رہیں تو باری ٹل جائے گی۔ آپ کی مطلق شنوائی نہ ہوگی، وہ خود اپنے آپ کو ورنہ اپنے کسی دوست یا عزیز کو ملیریا میں مبتلا بتائے گا۔ آپ پھر بھی متوجہ نہ ہوں گے تو وہ آپ کے داہنے یا بائیں پہلو پر آ کر بیٹھ جائے گا، اور آپ کے شانوں پر سے اس پتے کا مطالعہ اس طور پر شروع کر دے گا کہ اس نے گذشتہ چوبیس گھنٹے میں جو کچھ کھایا پیا ہوگا اس کے لطیف بخارات آپ کی مشامِ جان کو بالیدہ کرنے لگیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ دوست کے اس تکلف یا تنفس سے آپ پر یک بہ یک لرزہ طاری ہو جائے اور آپ اس سعی مشکور میں مبتلا ہو جائیں کہ دوست کو اوڑھنے بچھانے میں کس کس طرح استعمال کر سکتے ہیں۔

کتابیں صرف مانگ کر نہیں پڑھی جاتیں بلکہ مانگ کر واپس بھی نہیں کی جاتیں۔ پھر کتابوں کے پڑھنے ہی کا فن نہیں ہے ان کے مانگنے اور واپس کرنے کا بھی فن ہے اور سب سے بڑا فن تو یہ ہے کہ نہ کتاب دیکھی، نہ پڑھی، نہ مانگی، لیکن اس پر رائے اس طرح سے دی گویا کتاب کے مصنف، طابع اور ناشر سب کچھ ہیں۔ میں کتاب کسی کو نہیں دیتا۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ میرے پاس کوئی ایسی کتاب نہیں ہوتی جسے کوئی خوشی خاطر پڑھنا گوارا کرلے، دوسرے یہ کہ دینے کے بعد پھر وہ کتاب واپس نہیں آتی۔ آپ کو ان دونوں بیانات میں بظاہر تضاد نظر آتا ہوگا۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ میں نے آپ کو اپنا اصول بتا دیا اپنی عادت نہیں بتائی۔ اس فقیر کی عادت یہ ہے کہ جس کتاب کا نام سن پاتا ہے پڑھتا کبھی نہیں اس کا پروپیگنڈا مسلسل کرتا رہتا ہے۔ پروپیگنڈا کا لفظ بدنام ضرور ہے، لیکن دنیا میں کون سی نیکی ایسی ہے جو پروپیگنڈے کے بغیر بدنامی سے بچ سکے۔ اگر یہ بات آپ کی سمجھ میں نہ آئے تو ایک دوسری بات پر غور کیجیے، وہ یہ کہ میں ہر اُن دیکھی کتاب کے بارے میں گفتگو اس طرح کرنے لگ جاتا ہوں [1] کہ لوگ مجھ سے اور اس کتاب دونوں سے پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ اس میں آپ کا کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو میرا فائدہ یہ ہے کہ جب تک ایک کتاب پڑھوں اس وقت تک بے شمار دوسری کتابوں پر رائے دینے کے قابل ہو جاتا ہوں۔ پڑھنا تو رائے قائم کرنے کے لیے ہوتا ہے، رائے دینے کے لیے پڑھنے کی کیا ضرورت! رائے دینا

---

1. ''کرنے لگ جاتا ہوں'' صحیح ہو یا غلط، فصیح ہو یا غیر فصیح اس موقع میں اسے استعمال کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔

رشید احمد صدیقی

تو ایک تخلیقی عمل ہے اس کے لیے مشاہدہ، مطالعہ یا تجربہ کی کیا ضرورت! یہ وہ فن ہے جس میں نہ کتاب پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے نہ مانگنے میں بے حیائی کا سامنا ہوتا ہے اور نہ دینے لینے کا کوئی سوال اُٹھتا ہے۔

میری اس گفتگو سے آپ مانگے کی کتاب پڑھنے کے فن سے آشنا ہوئے ہوں یا نہیں، نہ پڑھنے کے فن سے آشنا ہو گئے ہوں گے آشنائی بھی تو آخر ایک فن ہے، فن نہ سہی عادت سہی۔ جس عادت پر آپ کو مبارک باد دینے کے لیے مجھے کبھی نہ کبھی ایسے مقامات کا چکّر لگانا پڑے گا جہاں لوگ جاتے نہیں لے جائے جاتے ہیں مثلاً اسپتال، مردہ خانہ یا جیل خانہ اور میرا یہ چکّر لگانا فن نہیں اخلاقی فرض ہوگا جو آپ کو مانگے کی کتاب میں نہ ملے گا۔ میرے جیسے آپ کے بدنصیب دوستوں کی زندگی میں ملے گا۔

میں نے دورانِ گفتگو میں یہ کہا تھا میرے پاس کوئی ایسی کتاب نہیں ہوتی جسے کوئی آسانی سے پڑھنا گوارا کرلے اور غالباً مصرعہ موزوں کرنے کے لیے یہ بھی کہہ گیا تھا کہ اگر کوئی کتاب لے جاتا ہے تو پھر واپس نہیں کرتا۔ اس کا بھید یہ ہے کہ میں کتاب یا اخبار فراہم کرنے کے بعد ان کے پڑھنے کے لیے رات کا منتظر رہتا ہوں بشرطیکہ رات کسی اور کام کے لیے میری منتظر نہ ہو۔ ایسا وقت بڑی مشکل سے آتا ہے وقت میں جہاں اور بہت سی خوبیاں ہیں وہاں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ آپ پر ہر وقت آئے گا لاًلا اس وقت کے جس کے آپ مشتاق اور منتظر ہوں۔ کبھی ایسا ہوا بھی تو پھر یہ ہوتا ہے کہ پہلی آرزو ختم ہو چکی ہوتی ہے اور کوئی دوسری اس کی جگہ لے لیتی ہے اور یہ دوسری بالکل ایسی نہیں ہوتی۔

دن گنے جاتے تھے جس دن کے لیے!

لیکن آیئے تھوڑی دیر کے لیے فرض کرلیں میں کھاپی کر اور ہر قسم کی ضرورتوں سے نجات پا کر اطمینان اور خوشی کے ساتھ چار پائی پر لیٹے لیمپ روشن کیا اور پڑھنے کے لیے کتاب نکالنی چاہی تو تکیے کے نیچے سے کتاب کی بجائے ایک پُڑے میں کچھ لڈو کے چورے اور سیلا ہوا ایک بسکٹ برآمد ہوا۔ معلوم ہوا کہ جامع المتفرقین نے جتنے متعلقین میرے لیے اکٹھا کردیے ہیں ان میں جو عاقل اور بالغ تھا وہ تو کتاب مار لے گیا اور کوئی ایسے صاحب جن کو دیکھ کر ٹیگور نے کہا

تھا کہ ''بچوں کو دیکھ کر مجھے یقین آجاتا ہے کہ خدا اپنی مخلوق سے ابھی مایوس نہیں ہوا ہے۔'' میرے بچّے کو سب سے محفوظ جگہ قرار دے کر اپنی فتوحات سپرد کر گئے ہیں۔ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ اس وقت مجھ پر کیا گزرتی ہوگی اور اپنی مخلوق کے بارے میں میرے کیا جذبات ہوں گے۔ بس چلتا تو کھا جاتا، لیکن بے بس ہو کر صرف لڈو اور بسکٹ پر اکتفا کرتا ہوں پھر سوچنے لگتا ہوں کہ اپنی اپنی مخلوق کے بارے میں خدا اور والدین کے نقطۂ ہائے نظر میں کتنا اختلاف ہوتا ہے۔ ٹیگور نے جو بات کہی ہے اس کے نتیجے کے طور پر میرا یہ عرض کرنا بھی بے محل نہ ہوگا کہ اگر خدا بچوں کو دیکھ کر اپنی مخلوق سے مایوس نہیں ہوا ہے تو ان بچوں کے والدین سے بھی خدا کو مایوس ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

کس کس جتن سے تو میں نے کتاب فراہم کی اور بغیر کسی جتن کے اسے کسی نے اُڑا دیا۔ سیلا بسکٹ اور لڈو کا چورا دونوں ختم ہو چکے تھے اور جیسا کہ انگریزی کے فقرے میں آیا ہے فکر کے لیے کوئی غذا باقی نہ رہی تو پھر سے اُٹھا اور انبار میں سے کسی دواخانہ کی فہرست یا رمضان المبارک میں یتیم خانے میں چندہ دینے کے ثواب پر کوئی اشتہار یا رسالہ اُٹھا لایا اور اس وقت جب سارا عالم سوتا ہے اور کوئی منحوس چپکے چپکے روتا ہے، تیر بہ ہدف دواؤں اور جنت اور دوسری ہواؤں کا موازنہ کرتا ہوں اور سو جاتا ہوں۔

میرے پاس مفت کی کتابیں اور رسالے کثرت سے آتے ہیں۔ ایڈیٹروں کے خطوط بھی جن میں فرمائش کی جاتی ہے کہ میں اپنے رشحاتِ قلم سے چمنستانِ شعر وادب کو سرسبز وشاداب کروں۔ خطوط کا مضمون اور لب ولہجہ ایسا ہوتا ہے جیسے بس یوں سمجھ لیں ''آنا تاج الملوک کا اور عاشق ہو جانا بکاؤلی پر''، جس شخص کے بارے میں سخن ورانِ قوم کا یہ حُسنِ ظن ہو اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اس کے پاس تیر بہ ہدف ادویات اور یتیم خانے کے اشتہارات اور اپیلیں کیوں آتی رہتی ہیں!

کتاب مانگنے والے ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور ان کے مانگنے کا طریقہ بھی علاحدہ ہوتا ہے۔ طالب علم تو یوں مانگتے ہیں کہ انھوں نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی، کتاب کہیں نہیں ملتی۔ اس کا صرف ایک نسخہ اس ارذلِ خلائق کے پاس ہے اور چوں کہ اس ارذلِ خلائق کا مبلغ علم صرف

اس کتاب تک محدود ہے، اس لیے امتحان کے پرچے اسی کتاب سے آئیں گے یا اُمیدواروں کی کوئی دور یا نزدیک کی عزیزہ امتحان دینے والی ہیں اور جہاں وہ نوکر ہیں وہاں کے لوگ بڑے متعصب ہیں اس لیے کتاب ملتی ہے نہ چھٹی، اس لیے کتاب دینے میں مجھے تامل نہ کرنا چاہیے ورنہ اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ عزیزہ کچھ دن میرے یہاں قیام وطعام فرمائیں اور میں وقتاً فوقتاً پرچے کے سوالات اوران کے جوابات لکھاتا رہوں۔

یہ بات مجھے اس درجہ آب دیدہ اور خدارسیدہ بنا دیتی ہے کہ اگر وہ کتاب میرے پاس ہوتی ہے تو میں فی الفور حوالے کر دیتا ہوں اور نہیں ہوتی تو اپنے کسی رفیقِ کار سے مانگ کر دے دیتا ہوں اور بہانہ یہ کرتا ہوں کہ حکامِ بالا دست سے شکایت کی گئی ہے کہ اس کتاب میں بعض باتیں ایسی ہیں جو لڑکیوں کے مطالعہ کے لیے نامناسب ہیں، مجھے ہدایت کی گئی ہے کہ اس پر میں اپنی رائے دوں۔ یہ کتاب پھر لوٹ کر نہیں آتی اور آتی ہے تو اس معزز خاتون کے لکھے ہوئے جابجا فقرے اور اشعار ہوتے ہیں جن سے ظاہر ہوگا کہ کتاب پہلے چاہے جیسی رہی ہو، لیکن اس تصحیح وتحشیہ کے بعد ہرگز اس قابل نہیں رہ گئی کہ خواتین کے علاوہ کوئی اور مطالعہ کی تاب لا سکے۔

طالب علموں میں یہ بات عام ہے، وہ جو کتاب پڑھیں گے اس کو اس قابل نہ رکھیں گے کہ کوئی بھلا مانس اسے پڑھنا گوارا کرے۔ سب سے پہلے تو وہ اچھی تصویریں، نقشے اور مضامین اس میں سے پھاڑ لیں گے اور ساری کتاب کو آڑے ترچھے خطوط، مبتذل اشعار اور نجس فقروں سے داغ دار کر دیں گے۔ اپنی دانست میں وہ ایسا کرنے سے قوم وملک کی بڑی خدمت بجالاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ میری طرح ہندوستانی دواؤں کی فہرست پڑھتے رہیں تو ایسے امراض سے واقف ہو جائیں گے جن کے سبب سے اسی قسم کی باتیں کتاب پر لکھنے کی تحریک ہوتی ہے۔ متمدن لوگوں میں اس قسم کی حرکت کو Vandalism یا بربریّت کہتے ہیں۔

اگر کسی صحبت میں روشن خیال خاتون اور سزایافتہ آرٹسٹ موجود ہوں اور کسی کتاب یا مصنف پر گفتگو چھڑ جائے تو ان میں کوئی نہ کوئی محترم خاتون ایسی ضرور ہوں گی جن کو نہ اس کتاب سے کوئی سروکار ہوگا نہ اس مصنف سے کسی قسم کی عدالتی چارہ جوئی کی نوبت آئی ہوگی، لیکن وہ گفتگو میں حصہ اس طور سے لیں گی جیسے مصنف نے وہ کتاب ان کے اشاریا مشورے سے تصنیف کی تھی۔

گفتگو ختم ہونے پر وہ اپنی ''ایں ہم دانی'' اور ضمناً آپ کی تالیفِ قلب کے لیے اس کتاب کی فرمائش کر دیں گی اور اس طور پر کریں گی کہ وہ دفعتاً آپ کو کچھ ایسا معلوم ہونے لگے گا کہ جیسے زندگی کا وہ بڑا لمحہ جس کے آپ ہمیشہ سے منتظر اور آرزومند تھے، لیکن شریفوں سے چھپاتے تھے، آ گیا ہے اور آپ نے فی الفور جان اور آبرو کی بازی نہ لگا دی تو عمر بھر کا پچھتاوا رہے گا اور یوں چاہے آپ کی عمر مختصر ہی کیوں نہ ہوتی، اس موقع کو رائیگاں جانے دیا تو یقیناً طویل ہو جائے گی۔ اتنی طویل کہ آپ سے پریس کے نمائندے ملنے آئیں گے اور پوچھیں گے کہ آپ سبزی خور تھے یا مردم خور، صبح اُٹھ کر چہل قدمی کرتے تھے یا سلسلہ پیتے تھے یہ کتاب آپ فراہم کر دیں گے۔ حسبِ معمول یہ کتاب واپس نہ آئے گی اور نہ ان خاتون سے پھر کبھی ملاقات ہوگی۔ اگر کبھی ہوئی تو وہ کتاب کے کھوئے جانے کا اظہار اس طرح کریں گی جس طرح نور جہاں نے کبوتر کے ہاتھ سے نکل جانے کا اظہار کیا تھا۔ اتنا فرق غالباً ضرور رہ جائے گا کہ جہانگیر، نور جہاں پر لٹو ہو گیا تھا آپ صرف رو پڑیں گے یا کسی جلوس میں نعرہ لگانے لگیں گے۔

(مطبوعہ۔ ساقی، دہلی۔ نومبر 1946)

●●●

مان نہ مان

مان نہ مان مہمان بھی ہوتے ہیں اور بلائے جان بھی! ان دونوں صورتوں میں مجھے ان سے نپٹنے کی سعادت حاصل ہوتی رہتی ہے۔ البتہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ان کے جانے پہچانے ہونے پر اتنا اصرار کیوں کیا گیا ہے، شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ یہ بزرگ مہمان اُس وقت ہوتے ہیں جب یہ آپ کو جانتے پہچانتے ہوں اور ''بلائے جان'' اس وقت جب خود آپ کی ان سے جان پہچان ہو، لیکن میرے نزدیک بہ حیثیت کردار ان حضرت مان نہ مان کی خوبی یہی ہے کہ ان کو جاننے پہچاننے یا ان سے بے تکلف ہونے کی مطلق کوئی شرط یا ضرورت نہیں۔ ان سے آپ کی مڈبھیڑ یوں بھی اور اکثر یوں ہی ہوتی ہے کہ ـــــ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن! وہ آگئے اور آپ رہ گئے وہ مسکرائے اور آپ چت ہو گئے یا پھر قوم اور ادب جیسے لا طائل و لایعنی مذاکرات میں آپ کچھ اس طرح پھنس گئے یا پھنسا لیے گئے کہ راہِ گریز خود ہیچ معلوم ہونے لگی! ان میں ایک کو میزبانی کہتے ہیں اور دوسری کو بے زبانی۔ ان کا مجموعہ زیرباری اور حاصل ضرب ''اشک باری'' جس کے بعد ہمارے آپ کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ ہم خود قوم یا مہمان بننے کی آرزو کرنے لگیں اور شرفا ہم پر نفرین کریں!

قوم کی اس مہمان نوازی یا مہمانوں کی اس قوم نوازی میں قوم اور مہمان دونوں اپنی اپنی جگہ بالکل محفوظ رہتے ہیں صرف بے چارے میزبان کا حافظ اللہ کے سوا اور کوئی نہیں رہ جاتا

اور جب اللہ ہی حافظ ہو تو انسان کے الوہی درجات کتنے ہی بلند کیوں نہ ہو جاتے ہوں اس کے بارے میں اس کے سوا میں اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ بس اس کا اللہ ہی حافظ ہے۔ پھر بھی اس حسنِ اتفاق کہیے یا سوظن مجھے عام طور پر دخل در معقولات کرنے والوں، کٹ حجتوں اور بن بلائے مہمانوں سے ہمیشہ دلچسپی رہی وہ یوں کہ ان میں مہمان برائے مہمان کا بھی لطف آتا ہے اور مہمان برائے میزبان کا بھی۔ اس میں فن برائے فن کے اسرار بھی پوشیدہ ہیں اور زندگی برائے خودکشی کے بھی۔ یہ باتیں آپ کی سمجھ میں نہ آتی ہوں یعنی ایسی باتوں پر آپ مجھے گردن زدنی سمجھتے ہوں تو پھر آپ یہ کیجیے کہ ایسے لوگوں کو اللہ واسطے سمجھ لیجیے یعنی اللہ دے اور بندہ لے۔ اس میں یہ پہلو بھی نکل سکتا ہے کہ جو اللہ دے وہ بندہ شوق سے لے خواہ وہ ایسی ہی چیز کیوں نہ ہو کہ نہ اللہ دے نہ بندہ لے!

شاید اسی لیے میری اس دلچسپی کو احباب اس خاص قسم کی قناعت سے تعبیر کرتے ہیں جو بے چادری کو عصمت مآبی کا وسیلہ بنائے رکھتی ہے۔ یعنی اس سے دلچسپی نہ لوں تو کیا کروں۔ البتہ سال ہاسال کے تجربہ سے اتنا ضرور ہوا ہے کہ میں اپنی اس دلچسپی کو قطعی طور پر غیر شخصی بنانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ اس عدم تعاون قسم کی دلچسپی میں، میں نے کچھ ایسے خورد بینی و دور بینی پہلو سمو لیے ہیں کہ اب وہ محض ایک عام دلچسپی نہیں رہی ہے۔ جو وقت لیوا بھی ہو اور جان لیوا بھی، بلکہ وہ احتجاج یا اعلانِ جنگ کی سب سے زیادہ خفیہ اور ساتھ ہی دلچسپ شکل بن کر رہ گئی ہے، اور غالباً دادخواہی کے سلسلہ میں آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آلاتِ جنگ کا خفیہ اور دلچسپ ہونا سیاسی تدبر کی معراج ہے!

مثلاً اب کسی ایسے ویسے مہمان کی تشریف آوری کی خبر سن کر (اور یہ خبر اکثر و بیشتر اچانک ہی ہوتی ہے) میں چوکنا ضرور ہو بیٹھتا ہوں، لیکن ہراساں مطلق نہیں ہوتا نہ ردِ بلا کی تجاویز پر مراقبہ میں چلا جاتا ہوں بلکہ نہایت ٹھنڈے دل سے مہمان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اللہ کا شکر بجالاتا ہوں کہ ضرور میرے اوپر کوئی بہت بڑی مصیبت نازل ہونے والی تھی جو یوں ٹل گئی یا نازل ہوئی۔ میرا عقیدہ ہے اور عقیدہ یوں ہی نہیں بن جاتا جب تک اس کے پیچھے کوئی معجزہ نہ ہو کہ ایک مہمان بے درماں واقع ہے ایک سوا ایک بلّیات کا یا جیسا کہ ایک غلط سلط سا شعر مجھے

یاد آ رہا ہے:

دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے
ناگاہ کوئی صاحب، مہماں نظر آئے

اس طرح کے ناگاہ نظر آنے والے مہمان کئی طرح کے ہوتے ہیں، اکثر تو بالکل ''برجستہ'' جو مخفف ہے ''بغیر بستر'' کا، یہ عموماً آپ کے ادبی عقیدت مندوں میں سے کسی کے عزیز ہوں گے یا محض ادب برائے ادب۔ یہ آپ کا دل اور خرچ بڑھانے پر اس بے تکلفانہ خلوص سے کربستہ رہیں گے کہ بالآخر آپ کے پاس نہ خلوص باقی رہے گا نہ 'فلوس' لیکن یہ خود جہاں کے تہاں رہیں گے! اور جب جانے لگیں گے تو آپ کے کمرہ کی کوئی چیز یا کمبل وغیرہ اس شفقت اور بے لوث شرافت سے مانگ بیٹھیں گے کہ تھوڑی دیر کے لیے آپ کو کچھ ایسا محسوس ہونے لگے گا جیسے یہ کچھ مانگ نہیں رہے ہیں بلکہ دے رہے ہیں! اسے بعض مردم بیزار مانگنا نہیں مار لے جانا بھی کہتے سنے گئے ہیں۔ حاصل کرنے کے جتنے طریقے ہیں اور ان میں سے دو چار سے آپ بھی واقف ہوں گے، ان سب میں نرالا اور لاعلاج طریقہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی حکومت، عدالت اور شاید آخرت کا کوئی محاسبہ آپ کی فریاد کو نہ پہنچے گا۔

یہ کھانے پر بیٹھے ہوں گے تو جو کھانا سب سے اچھا اور کم ہوگا وہ تو ان کا ہوگا اور جو سب سے پرولتاری قسم کا ہوگا اُسے یہ آپ کو بہ اصرار کھلائیں گے اور اس وقت جب کہ آپ پانی پی رہے ہوں گے یا ملازم کو بعض بڑے اہم اور نازک اشارے کر رہے ہوں گے وہ اُس کھانے کی بہت بڑی مقدار (ایک بدتمیز میزبان کی طرح) آپ کی پلیٹ میں ڈال دیں گے۔ آپ احتجاج کریں گے یا غم و غصہ سے رو پڑیں گے تو وہ آپ کی کمزوری، صحت یا فقیر صورت ہونے کا حوالہ دے کر آپ کے ہاضمہ اور حلیہ کے لیے اسے سب سے مجرب نسخہ بتائیں گے۔

کچھ جہانیاں جہاں گشت ہوتے ہیں اور ہمیشہ کسی نہ کسی کے مہمان بنے رہتے ہیں۔ یہ سفر اس طرح کرتے ہیں جیسے خدا کی تلاش میں نکلے ہوں اور ہر واقف اور ناواقف کی میزبانی کا بالکل اسی طرح امتحان لیتے آگے بڑھتے جائیں گے جیسے سالک یہاں وہاں زانوئے ادب تہہ کرتا ہوا ''مقامات'' سے گزر رہا ہو۔ صرف اتنے سے فرق کے ساتھ کہ یہ سالک کبھی مقامات میں

نہ کھویا جائے گا چاہے وہ مقامات خود ان کے راستے سے ہٹنے اور روپوش ہو جانے کی فکر میں ہو جاتے ہوں! یہ آپ کو کبھی نہ ختم ہونے والے، اس لیے کبھی نہ ہضم ہونے والے قصے سناتے رہیں گے جن کو فرو کرنے کے لیے آپ خونِ جگر پی سکیں یا نہیں (اس لیے کہ مجھے نہیں معلوم خونِ جگر آپ کے نزدیک حرام ہے یا حلال) آپ پر ایسا جذبہ یقیناً طاری ہو جائے گا جو آپ کے لیے ہر حلال کو حرام اور ہر حرام کو حلال قرار دے گا!

آپ یہ نہ سمجھیں کہ مان نہ مان کی فہرست یہیں ختم ہو جاتی ہے یا کہیں اور ختم ہو سکتی ہے یہ تو میں نے نمونتاً اور تبرکاً دو ایک بزرگوں سے آپ کو تعارف کرایا مگر اس قسم کے بزرگوں کی دنیا میں کمی نہیں جو اخلاقاً نہیں واقعتاً آپ کے گھر کو اپنا گھر سمجھتے ہیں اور آپ کی ہر بات کو اپنی بات۔ یہ ہمیشہ کسی بہت ضروری کام سے آئیں گے جسے کر گزرنے سے قوم کا بھلا ہو گا یہ دوسری بات ہے کہ خود آپ کا بھلا اس کے نہ کرنے ہی میں ہو۔ ان کی اقسام بہت ہیں۔ لیڈر، مولوی، شاعر، مریض، فلسفی، طالب علم، بیمہ ایجنٹ، چندہ وصول کرنے والے، رسائل کے ایڈیٹرز، کانفرنسوں کے سکریٹری یا بہ نفسِ نفیس خود جناب صدر وغیرہ۔ یہ وغیرہ میں کچھ یوں ہی نہیں عرض کیا ہے اس سے زیادہ جامع لفظ مجھے ان نیاز مندوں اور بے نیازوں کے لیے نہ سوجھا جن کو کسی خاص زمرہ میں شامل نہیں کر سکتے، لیکن جن سے کوئی زمرہ خالی نہیں ہوتا!

ان میں سے اکثر شعر پڑھتے یا یوں ہی گنگناتے اپنے آنے کی اطلاع کرتے ہیں کبھی کبھی اطلاع کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔ بس شعر پڑھتے جاتے ہیں اور بالا بالا ملازموں اور بچوں سے گھل مل کر کچھ اس بے تکلفی سے مکان پر قابض ہو جاتے ہیں کہ ان کے مہمان ہونے کے بجائے آپ اپنے میزبان یا "صاحبِ خانہ" ہونے پر شبہ کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مرحلہ پیش آتا ہے جب نو وارد اپنا بستر کھول دیتے ہیں۔ اس منظر سے آپ کو بے اختیار وہ افتاد یاد آ جاتی ہے، جس کا ذکر اس شعر میں کیا گیا ہے:

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا![1]

---

1 غالب۔

میرے دل میں اکثر یہ بات آتی ہے کہ محبوب و عاشق کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا جس سے بین الاقوامی پیچیدگی پیدا ہونے کا قوی امکان تھا۔ مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عاشق (اور ظاہر ہے ان سے زیادہ مان نہ مان اور کون ہوگا) کے اُس چہرہ بشرہ سے نیاز حاصل کرنے کے بعد جسے دیکھ کر انسان مریض کا حال پوچھنے میں کوئی فائدہ نہیں دیکھتا یا اطبا و اعزا کی طرف سے اس کی ممانعت کردی جاتی ہے۔ محبوب نے طعام و قیام کی اجازت دے دی ہوگی، لیکن جس وقت انھوں نے اپنا چیکٹ بستر کھولا ہوگا جس میں تکیہ اکثر سر کے ساتھ اُٹھ آتا ہوگا باوجود اس کے کہ اُس پر ''نینداس کی ہے دماغ اُس کا ہے'' قسم کا کوئی نہ کوئی شعر بھی کسی زمانہ میں کاڑھا گیا ہوگا، اور بستر کے اندر سے طرح طرح کے پتو اور جوئیں اور بیڑی کے نیم سوختہ ٹکڑے برآمد ہوئے ہوں گے تو محبوب نے غصہ میں آکر اُن کے اسباب کو ایک ٹھوکر ماری ہوگی جو حقّہ کو نگالی، اور فن کے لوٹے کے ساتھ دور گلی میں جا کر گرا ہوگا۔ عشق بڑی برگزیدہ خصلت ہے، لیکن عاشقوں اور مہمانوں سے گلوخلاصی حاصل کرنے کے لیے بعض دوسری قسم کی خصلتوں کو کام میں لانا ہی پڑتا ہے!

ایک مقام اس سے بھی مشکل آتا ہے، جب یہ مان نہ مان سیاست حاضرہ سے لے کر ادبیات عالیہ تک ہر چیز پر اپنی رائے اور اپنے تجربہ سے آپ کو مستفید کرنے کے درپے ہوگا۔ وہ بھی اس انداز سے گویا آپ صاحب خانہ نہیں کسی کال کوٹھری میں قید ہیں اور علی الصباح سورج نکلنے سے پہلے آپ کو پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔ مجھے جب کبھی ایسے بزرگوں کے میزبان بننے کی سعادت نصیب ہوتی ہے تو میں بارگاہِ خداوندی میں گڑگڑا کر یہ دعا مانگتا ہوں کہ اسے ہر غیر متوقع موقع اور مقام سے مہمان نازل کرنے والے ان نووارد کے دل میں واپسی کا ارادہ تو جتنا چاہے کمزور کردے، لیکن ایسے انسان کو نطق سے سرفراز کرنے والے اتنی بات میری بھی سن لے کہ کم از کم جب تک یہ میرے ہاں قیام فرمائیں بے زبان رہیں ــــــ میں اُن کی تقریروں سے تیری پناہ پکڑتا ہوں!

اس سلسلہ میں ایک بزرگ کا تذکرہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا جو عمر اور حلیہ دونوں اعتبار سے اپنے وقت کے خضر ہیں، اور تمام علوم ارضی و سماوی میں جملہ مشاہیر، حکمائے مصر و یونان کے مذ مقابل جن کے نام کا صحیح تلفظ میں کبھی نہ کرسکا، جس طرح قدرت کے کارخانے میں سکون اور

خلا محال ہے اسی طرح ان سے بھی کسی کو کہیں مفر نہیں۔ جہاں دو آدمیوں کو باتیں کرتے دیکھا اور یہ نازل ہو گئے اور تینوں پر بھاری ہو گئے۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا میں جتنے علوم سینہ وسفینہ یا ''علوی و سفلی'' ہیں سب کے سب ان کے کثیف ناخنوں میں ہیں جن کو وہ اسی بنا پر کبھی نہیں ترشواتے یا اُن کی نوکِ زبان ہیں جس کو یہ کبھی نہیں دھوتے۔ انھیں دنیا اور مافیہا کی تمام خبریں پہنچتی رہتی ہیں جن کو یہ ہر شام کو کسی کے غریب خانہ پر جا کر سنائیں گے۔ نماز مغرب میں صاحب خانہ کو شریک کریں گے اور عشا کے کھانے پر اس کے شریک ہو جائیں گے!

آپ کیسی ہی خفیہ یا مزے کی باتیں کیوں نہ کر رہے ہوں یہ دخل دینے لگیں گے، آپ اپنی محبوبہ کے ذکر سے شاد کام ہو رہے ہوں تو یہ اس طرح آپ کو ہمت افزائی کریں گے جیسے یہ اُس کے مشیر طبی اور مشیر قانونی دونوں رہ چکے ہیں۔ کسی شعر یا شاعر کی آپ کو تلاش ہو تو یہ اس پر اصرار کریں گے کہ در دسر سے کیا فائدہ انھیں کا شعر آپ کیوں نہ قبول کرلیں۔ سیاستِ حاضرہ پر گفتگو ہو تو یہ اپنے اور لیڈروں کے بچپنے کا تذکرہ شروع کر دیں گے جب یہ اُن کے ساتھ چقندر چراتے، بر ہا گاتے اور سور چرایا کرتے تھے۔ آپ کسی کو مار ڈالنے کی فکر میں ہوں تو یہ آپ کو اپنے کسی جن کے کارناموں کا حال سنانے لگیں گے جس نے دنیا کے تمام دشمنوں کو مار ڈالا تھا۔ آپ کے ذہن میں یک بہ یک خیال آئے گا کہ وہ جن انھیں کو کیوں نہیں مار ڈالتا تو آپ یہ سوچ کر خاموش ہو جائیں گے کہ جن بے چارہ کیا کرے، آخر فن کی حرمت کہیں نہ کہیں اُسے بھی تو ملحوظ رکھنی ہی پڑتی ہوگی۔

مان نہ مان کی ایک قسم شاعروں کی ہوتی ہے، ان میں سے ایک میرے حصہ میں آئے ہیں۔ یہ اپنے شعر سنانے کے اس درجہ مشتاق اور مشاق ہیں کہ دنیا کا کوئی حادثہ ان پر یا کسی اور پر کیوں نہ گزر جائے یہ شعر سنانے سے باز نہ آئیں گے۔ آپ داد نہ دے کر اپنی کج خلقی یا بدفہمی کا ثبوت دیں گے تو یہ اس کی مطلق پروا نہ کریں گے۔ خود ہی کبھی رو کر، کبھی ہنس کر، کبھی آداب بجالا کر اور کبھی آنکھ، ناک، ہونٹ غرض چہرہ کی پوری آبادی کو ایک دوسرے کی جگہ دے کر اپنی داد خود دے لیں گے۔ اس پر بھی آپ ٹس سے مس نہ ہوں گے تو وہ آپ سے اپنے حافظہ کی طرف سے معذرت مانگ کر اپنی بیاض نکال لیں گے اور آپ ان کا منہ کچھ اس طور پر تکنے لگیں گے کہ دوسرے یہ سمجھیں گے کہ آپ اُن کا ورنہ اپنا منہ نوچے بغیر نہ رہیں گے!

ان کو معلوم ہے کہ مجھے ان کی اس حرکت سے کتنی کوفت ہوتی ہے، لیکن وہ میری کوفت کو اس پر محمول کرنے کے عادی ہو گئے ہیں کہ دنیا کی مکروہات نے مجھے ایسا بنا رکھا ہے ورنہ خدا نے دراصل مجھے اس لیے پیدا کیا ہے کہ میں اُن کے اشعار سنا کروں۔ تھوڑی دیر کے لیے فرض بھی کرلیا جائے کہ میری طرف سے ان کو جو گمان ہے وہ سوفی صدی صحیح ہے تو بھی اُن سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس پر بھی غور کرلیا کریں کہ دنیا کی وہ تمام مکروہات جو میرے حصہ میں آئی ہیں اُن میں اُن کا اور اُن کی شاعری کا کتنا حصہ ہے۔

مجھے اکثر محسوس ہوا کہ ان کے بارے میں میری جو رائے ہے اُس سے وہ کچھ نہ کچھ ضرور واقف ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری سے بچنے کی خاطر میں بعض اخلاقی کوتاہیوں کا مرتکب بھی ہوا ہوں، لیکن میری تمام اخلاقی کمزوری یا گمراہی اُن کے شعر خوانی کے سامنے سرنگوں ہو چکی ہے۔ میرے ہاتھ کے بعض بڑے سے بڑے اور اچھے سے اچھے پتے اُن کی شاعری کے ہیضہ کے ہاتھوں بدرنگی میں کٹ چکے ہیں!

میں نے ان کے حملوں کا پہلے تو یہ جواب دیا کہ جب کبھی وہ آئے تو میں نے اطلاع کرادی کہ میں مکان پر موجود نہیں ہوں۔ اس حربے کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ باہر بیٹھ گئے۔ اندر باہر جانے والوں سے کبھی پانی منگا کر پیتے کبھی دیا سلائی منگاتے کبھی وقت دریافت کراتے، لیکن ہمت نہ ہارتے۔ اس درمیان میں جو کوئی آتا اُسے یہ کہہ کر بٹھاتے جاتے کہ میں گھر میں موجود ہوں اور اُن کو منتظر بٹھا گیا ہوں۔ اس طور پر اپنے اِردگرد ایک انبوہ جمع کر لیتے اور سب کا دل بہلانے کے لیے اپنے اشعار سنانے لگتے۔ اس مجمع میں اکثر ایسے بھی نکل آتے جو خود بھی شاعری میں مبتلا ہوتے۔ پھر کیا تھا شاعری کا دور چلنے لگتا اور پان، پانی، جانماز کی فرمائشیں بھی بڑھ جاتیں۔ سارے محلّہ میں شور مچ جاتا کہ اس خاکسار کے گھر پر مشاعرہ ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے مسجد اور مشاعرہ میں کسی کے لیے کوئی روک ٹوک نہیں۔ دنیا بھر کے حق بخشوائے ہوئے غریب خانہ پر نازل ہو جاتے۔ مجھے انسانی توفیق پر بھروسہ نہ ہوتا تو میں اپنے ان دوست کی بدولت کالا پانی پہنچ چکا ہوتا، لیکن ہوا وہی جس پر میرا ایمان تھا، یعنی تھوڑے ہی دنوں میں لوگ ان سے اُکتا کر اپنے اپنے گھر بیٹھ رہے، لیکن یہ خود میرے ہی گھر پر بیٹھے رہے!

آخر آخر میں انھوں نے نقشہ جنگ بدل دیا تھا یعنی یہ پتہ لگاتے رہتے تھے کہ میرے ہاں کوئی معقول یا معزز مہمان آیا ہوا ہے یا نہیں، اور یہ ٹھیک اُسی وقت نازل ہو جاتے جب میں مہمان اور دوسرے کچھ لوگ بیٹھے خوش گپی میں مصروف ہوتے، ایسے موقع پر میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ ہوتا کہ میں وہ سب سہتا جو وہ سناتے۔ میری اس ریاضت کا ثمرہ بھی مجھے ملا یعنی مہمانوں نے میرے ہاں آنا کم کر دیا، لیکن یہ اب بھی وہیں ہیں جہاں پہلے تھے یعنی اس خاکسار کی تقدیر میں!

یورپ میں ہمہ وقت ہر طرح کی کانفرنس ہو رہی ہیں اور میں برابر اس کا انتظار کر رہا ہوں کہ متحدہ اقوام ایٹم بم کے عام کر دینے پر کب متفق ہوتی ہیں۔ جس دن متفق ہوئیں آپ دیکھیں گے کہ سب سے پہلا بم میں ہی خریدوں گا!

(مطبوعہ۔ کانفرنس گزٹ، علی گڑھ۔ یکم جنوری 1946)

●●●

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

کلیات رشید احمد صدیقی (جلد اول)

مرتب: ابوالکلام قاسمی

صفحات: 236

قیمت:-/174 روپے

کلیات رشید احمد صدیقی (جلد دوم)

مرتب: ابوالکلام قاسمی

صفحات: 544

قیمت:-/331 روپے

کلیات رشید احمد صدیقی (جلد سوم)

مرتب: ابوالکلام قاسمی

صفحات: 386

قیمت:-/252 روپے

کلیات رشید احمد صدیقی (جلد چہارم)

مرتب: ابوالکلام قاسمی

صفحات: 324

قیمت:-/219 روپے

جنت سنگار

مرتبہ: سیدہ جعفر

صفحات: 590

قیمت:-/180 روپے

کلیات فانی

مرتب: ظہیر احمد صدیقی

صفحات: 318

قیمت:-/101 روپے

ISBN : 978-81-7587-774-0

₹ 105/-

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025